نقوشِ سلیمانی

علامہ سید سلیمان ندوی رح

نقوشِ سلیمانی

از

علامہ سید سلیمان ندوی رح

اردو اکیڈمی سندھ

کراچی ــــــ حیدرآباد ــــــ لاہور

کاپی رائٹ ۱۹۶۶ء

ہندوستان میں اس کتاب کے حقوق دارالمصنفین اعظم گڑھ کے نام محفوظ ہیں

○

پاکستانی دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۷ء

کتابت: محمد صادق خوشنویس

مطبوعہ: باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی

○

لاہور دفتر

اُردو مرکز،

گنپت روڈ، لاہور۔

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	مقدمہ	ا
	خطبات	
۱	خطبۂ صدارت اجلاس شعبۂ ترقی اُردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا	۱
۲	ہندوستان میں ہندوستانی	۱۹
۳	خطبۂ صدارت ہندوستانی اکاڈمی	۷۷
۴	ہماری زبان کا نام	۹۸
۵	ہماری زبان بیسویں صدی میں	۱۱۰
۶	خطبۂ صدارت شعبۂ اردو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ	۱۵۵
	مقالات	
۱	اکبر کا ظریفانہ کلام	۱۷۶
۲	اردو انسائیکلوپیڈیا	۱۸۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳	زبانِ اُردو کی ترقی کا مسئلہ	۱۹۳
۴	ہوم لنگویج (ملکی زبان)	۲۰۵
۵	انڈیا آفس لائبریری میں اُردو کا خزانہ	۲۱۱
۶	انجمن اُردو کے متعلق کے چند سوالوں کا جواب	۲۲۲
۷	ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی	۲۲۵
۸	اُردو کیونکر پیدا ہوئی	۲۵۰
۹	بہار کے نوجوان، اور ادب کی خدمت	۲۶۵
۱۰	سفر گجرات کی چند یادگاریں	۲۷۵
۱۱	بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق	۲۹۲
۱۲	تہذیب	۳۲۹
۱۳	ہماری زبان	۳۴۷
۱۴	جواہر الاسرار میں کبیر کی بات چیت	۳۵۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اُردو کا ماضی حال اور مستقبل

نقوشِ سلیمانی

آج سے بارہ برس پہلے ۱۹۳۹ء میں جب، اُردو، ہندی اور ہندوستانی کی بحثیں غیر منقسم ہندوستان میں جاری تھیں اور اُردو زبان کے معاملہ میں کسی سمجھوتہ پر پہنچنے کے لئے ملک کے خادم بے چین تھے، خاکسار نے اپنی زبان اور ادب اردو کے متعلق ۱۹۱۵ء سے لیکر اس وقت تک جو تقریریں کی تھیں یا تحریریں لکھی تھیں، ان کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دینا مناسب سمجھا، اور اس مجموعہ کا نام **نقوشِ سلیمانی** رکھا، یہ مجموعہ چھپا اور توقع سے زیادہ مقبول ہوا، اور کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہوا، کیونکہ اس نقوش کے آئینہ میں اردو کا ماضی، حال اور مستقبل پوری طرح نظر آتا تھا۔

ایک ہزار نسخے چھپے تھے اور وہ چند سال میں ختم ہوگئے، اور دوبارہ اُن کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، احباب اور شائقین کے تقاضے جاری تھے اسی اثناء میں تین سال ہوئے کہ لاہور سے میرے لائق دوست پروفیسر سید عبداللہ صاحب (پنجاب یونیورسٹی) نے لکھا کہ **نقوشِ سلیمانی** یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے، اور اس کے نسخے بازار میں نہیں ملتے، لاہور کے کسی پبلشر سے اس کے چھپوانے کی تدبیر کیجئے، یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان کی تقسیم نے صورتِ حال بدل دی تھی، اور نئے نقشہ کے مطابق سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون کیا کرے اور کہاں کرے، بہرحال تقدیر کی کایا پلٹ نے جب مجھے بھوپال سے نکال کر جون ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچایا، اور غور و فکر کے بعد نئی زندگی کا پھر سے نقشہ بنایا تو اپنی گذشتہ کتابوں کو یہاں چھاپنے اور چھپوانے کا خیال آیا تو دوسری کتابوں کے ساتھ نقوشِ سلیمانی کے بھی دوبارہ چھپوانے کی تجویز ذہن میں آئی اور بحمداللہ کہ اب وہ چھپکر تیار ہے۔

نقوش کا موجودہ نسخہ

نقوش کا موجودہ نسخہ، گذشتہ نسخہ کا نقش ثانی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا نسخہ تین بابوں پر منقسم تھا، خطبات، مقالات، اور مقدمات یہ نسخہ صرف دو بابوں پر مشتمل ہے، خطبات اور مقالات، مقدمات کا باب اس نئے الگ کر دیا گیا ہے، کہ مقدمات کی الگ ایک جلد زیر ترتیب ہے، پہلے باب میں ایک نیا خطبہ جو پہلے ایڈیشن کے بعد ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ میں پڑھا گیا تھا بڑھا دیا گیا ہے۔

نقوشِ سلیمانی کی اہمیت کے بعض وجوہ

نقوش سلیمانی یوں تو چند پرانے ادبی خطبوں اور تحریروں کا مجموعہ ہے مگر میرے خیال میں اس کے اندر اہمیت کی چند خاص باتیں ہیں۔

۱۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے اردو کے مولد کی تعیین و تشخیص کے باب میں سندھ اور ملتان کی نشاندہی کی گئی، اور یہ اشارات سب سے پہلے ۱۹۱۵ء کے اجلاس اردو کے خطبۂ صدارت میں کئے گئے (ص ۲۳) پھر بعد کے خطبوں اور مقالوں میں ان پر مزید روشنی ڈالی جاتی رہی (ص ۳۱ تا ۳۴) شروع شروع میں تو اس پر بعضوں نے کم فہمی سے طعن و طنز بھی کئے، مگر تاریخ نے ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں اپنے کو دہرا کر ماضی کی حقیقت حال کے پردہ میں لا کر سب کے سامنے پیش کر دی، یہاں تک کہ ایک سندھی محقق پیر حسام الدین صاحب نے اس موضوع پر ایک محققانہ مقالہ لکھ کر انجمن ترقی اردو میں ابھی پیش کیا ہے۔

فارسی کی سیاسی تاریخی کتابوں میں اردو کا سب سے پہلا فقرہ جو اب تک ملا ہے وہ فیروز شاہ تغلق کے عہد کا ہے، محمد شاہ تغلق نے جب ۷۵۲ھ میں ٹھٹھہ پر حملہ کیا اور اس کی موت سے اس کا یہ حملہ ناکام رہا اور اس کے بعد ۷۶۲ھ میں فیروز شاہ نے دوسرا حملہ کیا اور وہ بھی ناکام واپس گیا تو ٹھٹھہ والوں نے کہا۔

"برکت شیخ پتھیا، ایک موا اور ایک نٹھا" (شمس سراج ص ۲۳۱) اس فقرہ کا آخری لفظ شمس سراج عفیف کی مطبوعہ تاریخ میں تھا، اور نہا دونوں پڑھا جا سکتا ہے، مگر صحیح لفظ مفہوم نہیں ہوتا، اس نقوش ص ۲۵۶ میں اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ "شیخ کی برکت تھی کہ ایک مر گیا، اور دوسرا ناکام رہا" لیکن عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۸۸ (الہ آباد) میں اس کا مطلب میں نے یہ لکھا تھا "شیخ کی برکت سے ایک مر گیا،"

اور ایک ناکام بھاگا" مجھے ہمیشہ سے اس لفظ کی صحت کی تلاش تھی، کراچی آنے کے بعد سندھ اور ملتان کے دوستوں سے اس کے قیاسی صحیح تلفظ کا پتہ چلا، جو ملتانی میں بھاگا کے معنی میں ہے، یہی لفظ فارسی میں نتھا لکھا گیا ہوگا، جو کتاب میں تھا یا نہا کی شکل میں چھپا ہے۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا، جو ایک لفظی تصحیح سے متعلق تھا۔

۲- دوسری اہمیت اس کتاب کی اس خطبۂ صدارت میں ہے جو ۱۹۳۹ء میں کلکتہ میں پڑھا گیا تھا۔ یہ خطبہ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے آج بھی پڑھنے کے لائق ہے اس سے انہیں معلوم ہوگا کہ اردو کی اہمیت اُن کے لئے کیوں ہونی چاہیئے، اور اُنھیں کیوں اس کو اپنی قومی زبان بنانی چاہیئے، اب حالات بالکل بدل گئے ہیں، اب دلائل واقعات کی صورت میں اُنکے سامنے ہیں اور اب سارا معاملہ اُن کے اختیار میں ہے اور اُن کو اخیر بار ناصحانہ یہ کہہ دیا ہے کہ بنگال کی اکثریت کو ہندو کلچر اور ہندو متھالوجی اور ہندو ادب کی غلامی سے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک وہ اپنی زبان کو سنسکرتی بنگالی اور سنسکرت خط سے آزاد نہ کریں گے اور خدا کا شکر ہے کہ مشرقی بنگال میں اس کی کوشش جاری ہے اور قرآنی حروف کی تحریک اور بنگالی زبان کی اصلاح کا کام شروع ہو چکا ہے۔

۳- تیسری اہمیت اس کتاب کی یہ ہے کہ اس کے خطبوں اور مضمونوں سے آغاز سے آج تک کی اردو کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے، اُس کا آغاز اور اس کے عہد بعہد کی ترقی اور اس کے مطبوعات اور منشورات کی رفتار اشاعت معلوم ہو سکتی ہے، اور اسی بنا پر آئندہ بھی کام کیا جا سکتا ہے۔

۴- چوتھی چیز یہ ہے کہ اس کتاب میں اُردو کی ضرورت، بقا اور اہمیت کے تمام دلائل واقعات اور اسباب پوری تشریح سے جمع ہو گئے ہیں اسی طرح مخالفین کے شکوک وشبہات اور اعتراضات کو تمام وکمال رفع کر دیا گیا ہے۔

۵- پانچویں چیز یہ ہے کہ ان مضامین میں اُردو، ہندی، ہندوستانی مباحث کے تمام

پچھلے واقعات اور جس جس طرح غیر منقسم ہندوستان میں متحدہ زبان کے نظریے کے متعلق تبدیلیاں پیش آتی رہیں اُن کی پوری روداد جمع کر دی گئی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوگا کہ پچھلے پچاس برس کے عرصہ میں ملک کی زبان کا مسئلہ کس کس مرحلہ سے گذرا۔ اور سمجھوتہ کی کیا کیا کوششیں کی گئیں اور اُن کا انجام کیا ہوا۔

۶۔ یہ مضامین گو سیاسی نہیں ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کسی قوم کی زبان اور لٹریچر کے مسئلہ کو سیاسیات سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا، اور اس سلسلہ میں اس کتاب کے مصنف کی حیثیت پوشیدہ نہیں، اس کے مضامین اس کی اس حیثیت کی پوری غمازی کر رہے ہیں اس نے اُن لوگوں کو جو سمجھوتہ کی ہر سکیم کو ٹھکرا کر سنسکرتی ہندی کو راشٹر بھاشا یعنی ملک کی زبان بنانے پر مصر تھے اُن خطروں سے برابر ہشیار کیا ہے جو دو قومی نظریے کا سبب تھے، اور جو بالآخر ملک کی تقسیم کا باعث ہوئے ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی کے اندر یونین ہال میں "ہندوستان میں ہندوستانی" پر جو مقالہ پڑھا گیا ہے اور جو اس مجموعہ میں شامل ہے اُس کے صفحہ ۳۷ پر یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

> ہندوستان میں زبان کا انقلاب ہو کر رہے گا، اور جس قدر ہندوستان زیادہ متحد ہوتا جائے گا اتنا ہی اسکی متحدہ زبان کا امکان بڑھتا جائے گا۔ جو لوگ ہندوستان میں دو رہائیں پیدا کرنا چاہتے ہیں اُن کو ہوشیار رہنا چاہیے کہ وہ اس موجودہ ہمالیہ سے بڑھ کر ایک اور ہمالیہ بنا رہے ہیں، جو پہلے ہمالیہ سے زیادہ اونچا ہوگا، پہلا ہمالیہ چاہے ٹوٹ کر چور چور ہو جائے مگر ہندوستان کو دو متفرق زبانوں میں تقسیم کرنے سے دونوں قوموں کے درمیان ایک ایسا ہمالیہ کھڑا ہو جائے گا۔ جو پھر قیامت تک ٹوٹ نہ سکے گا۔

اس کے بعد کلکتہ اردو کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۹ء کے خطبہ صدارت میں جو معارف جلد ۴۵ نمبر ۲ میں شائع ہوا اور وہ اس کتاب میں حصہ خطبات کے اخیر میں شامل ہے۔ ناظرین کو یہ الفاظ ملیں گے:

تھا جو بار رہا ہیں دو ہیں، ایک یہ کہ ہم یہ سمجھیں کہ ہندوستان خالص ہندوؤں کا ملک ہے اس میں جو کچھ ہو وہ خالص ہندوانی ہو، زبان وہی ہو، لباس وہی ہو، تعمیر وہی ہو، مذاق وہی ہو، علم وفن وہی ہوں، اور جو بھی اس ملک کی چہار دیواری کے اندر رہو وہ اسی کا محکوم ہو کر رہے، یہ راہ بیحد خطرناک، اور مشکلوں سے بھری ہوئی ہے اور اس راہ کی کامیابی میں بہت کچھ شک کیا جا سکتا ہے۔" ص ۱۷۶

"میرے نزدیک کسی ہندو طبقہ کا قومیت وطنیت کے مفہوم کو اتنا تنگ سمجھنا کہ خود اس ملک کے مختلف بسنے والے بھی وہاں کے اصلی رہنے والے ثابت نہ ہوسکیں اُن کی وہی موروثی اور پرانی تنگ خیالی ہے جس نے تاریخ میں ان کو ہمالیہ اور سمندر کی چہار دیواری میں بند اور اُن میں چھوت اور اچھوت کی پرانی لڑائی ہزاروں برس سے کھڑی کر رکھی ہے، اور جس نے تاریخ کے ہر دور میں ان کے اندر کے مظلوم فرقوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ باہر کا سہارا ڈھونڈیں اور باہر والوں کو اپنی مدد کے لئے اپنے گھر بلائیں اور نتیجہ میں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی غلامی کی زنجیروں میں اسیر کرائیں یہ ایک تاریخی نکتہ ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں مگر جس کو کسی دفعہ بھی بھولنا نہیں چاہیئے" ص ۱۷۷

"اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا اور سمجھنا کہ سنسکرتی ہندی ہماری اصلی بولی ہونی چاہیئے، دیس کے اتحاد اور ایکتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے" ص ۱۸۰

"میرے خیال میں یہ کانگریس کے ساتھ ہمدردی نہیں، بلکہ کھلی دشمنی ہے، اور مسلمانوں کے ذہن میں یہ غلطی بٹھانی ہے کہ جب ہم آدھا اختیار پا کر یہ کر رہے ہیں تو پورا اختیار پا کر کیا کچھ نہ کریں گے، ملک کی پالیٹکس پر اس غلطی کا جو اثر اب پڑ رہا ہے اور جو آگے پڑے گا وہ چھپا نہیں ہے، ہم نے اس وقت صفائی سے جو کچھ کہا ہے امید ہے کہ ہمارے دوست اس کو نیک نیتی سے سنیں گے اور کہنے والے کی بھی نیک نیتی سمجھیں گے۔" ص ۱۸۲

اس سے بھی زیادہ صاف اور روشن لفظوں میں پھر ہشیار کیا گیا۔

"ملک کی زبان کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ ہندوستانی اردو یا اس کو آسان ہندی کہہ لیجئے ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے۔ درحالیکہ ہندی کی حیثیت وہ ہے جو مسلمانوں کی فارسی کی ہے، اور سنسکرت کا درجہ عربی کا ہے۔ اگر ہم سب اس تصفیہ پر ایک ہو جائیں تو ہماری سب مشکلیں دور ہو جائیں۔ مگر افسوس ہے کہ ملک میں ایک طبقہ ایسا ہے جو نہ صرف ہندی بلکہ سنسکرتی ہندی کو ہندوستان کی زبان بنانے پر تلا ہوا ہے، اور وہ ایک ایسی غلطی کر رہا ہے جس سے تنگ دلی کے سوا کوئی دوسرا فائدہ نہیں پہنچ سکتا، اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک دو حصوں میں بٹ جائے گا" ص ۸۴

سب سے آخر میں آخری تنبیہ ان لفظوں میں پیش کی گئی ہے:

"میں پھر ہندو مسلمانوں دونوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ تنگدلی اور جھوٹی قومیت کی غلط پاسداری کر کے اپنے ملک کو تباہ نہ کریں اور اس کشتی میں وہ سوراخ نہ کریں جس سے وہ پھر کشتی نہ رہ سکے گی، اور جس کا نتیجہ سب کے لئے ایک ہے۔" ص ۱۰۹

مگر یہ سب تدبیریں بیکار رہیں، اور وہی ہوا جس کا ہونا مقدر تھا، اور اردو ہندی کا جھگڑا جو ۱۸۶۷ء سے شروع ہوا تھا ۱۹۴۷ء میں اس طرح طے ہوا کہ دونوں دو منطقوں میں بٹ گئیں، جن میں سے ایک بھارت ہے، اور دوسرا پاکستان۔

بھارت میں اردو کا مستقبل

بھارت نے گو اردو سے سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے اپنا پیچھا چھڑا لیا، لیکن کیا عوام کے بول چال اور ایک طبقہ کی ادبی (لٹریری) حیثیت سے بھی اس کی زندگی آئندہ باقی رہے گی یا نہیں اس کے پہلے ٹکڑے کا جواب یہ ہے کہ جب تک ہندی کی عمومیت عوام میں اتنی مقبولیت اور وسعت نہ حاصل کرے کہ وہ عوام کی زبان بن جائے عوام کو اردو کی ضرورت باقی رہے گی، اور یہ کام ایک دو دن کا نہیں، بلکہ صدیوں کا ہے۔ دوسرے ٹکڑے کا جواب یہ ہے کہ یہ اس طبقہ کی ہمت اور محنت

پر موقوف ہے، تاہم چونکہ لڑکوں کی تعلیمی زبان سنسکرتی ہندی بنادی گئی ہے اس لئے ڈر ہے کہ رفتہ رفتہ اس زبان میں فارسی اور عربی عنصر کم ہوتا جائے گا، اور ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بڑھتے جائیں گے اس لئے دو تین نسلوں کے بعد عجب نہیں کہ بھارتی اردو پاکستانی اردو سے الگ ہو جائے، تاہم جب تک بھارت میں مختلف زبانیں موجود ہیں آسان اردو یا ہندوستانی کی شکل میں اردو کا وجود ضروری ہے، وہ کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی، کیونکہ زبان نہ مٹائی جاتی ہے نہ بنائی جاتی ہے، وہ خود فطرت کے اصولوں پر چلتی اور مرتی ہے۔

پاکستان میں اردو کا مستقبل

پاکستان نے گو اردو کو اپنی سرکاری زبان مان لیا ہے لیکن چونکہ پاکستان کے حصہ میں دو صوبے آئے ہیں، جن میں سے ہر صوبہ کی اپنی ایک صوبہ کی زبان بھی ہے اس لئے پاکستان کو اپنی سرکاری زبان کو تعلیمی زبان بنانے کے لئے بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ تاہم اسی لئے کہ پاکستان کے ہر صوبہ کی الگ الگ صوبہ وار زبان ہے۔ پورے پاکستان کے لئے ایک واحد متحدہ زبان کی ضرورت بالکل طبعی اور مسلّم ہے، اور اسی بنا پر پاکستان میں اردو کا مستقبل شاندار ہے، اور اس کا پرچم پنجاب کے مضبوط ہاتھوں میں آتا نظر آتا ہے۔

یہ بھی قدرتِ الٰہی کی عجیب مخفی حکمت تھی کہ چونکہ پنجاب کو آئندہ پاکستان کا دل بننا تھا۔ اس لئے ایسے مواقع پیدا ہوئے جن میں لاہور جدید اردو کی نشوونما کا مرکز بن گیا۔ اور بجائے اس کے کہ پنجاب پنجابی کو اپنی ادبی اور لٹریری اور تعلیمی زبان بنائے اس نے اردو ہی کو اپنی ادبی اور لٹریری اور تعلیمی زبان بنایا اور سب سے زیادہ اردو کی اشاعت کا کام یہیں ہوا، اور یہ سب تمہید درپردہ اس لئے کی گئی تھی کہ پاکستان بننے کے بعد پاکستان میں اردو کی حیثیت مہاجر کی نہ ہو بلکہ اہلِ وطن کی ہو۔

مہاجرین کی جو بڑی تعداد بہار، یوپی، بمبئی، حیدرآباد اور راجپوتانہ وغیرہ ریاستوں سے آئی ہے وہ اردو کو اپنے سینوں کے ساتھ لگا کر لائی ہے اور یہ سارے پاکستان میں

بنگال سے پشاور تک پھیل گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر صوبہ میں اردو بولنے والوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے، اور ان کے ذریعہ سے اردو پاکستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی ہے۔ اردو کے لئے سب سے مشکل مرحلہ سندھ اور بنگال میں تھا، مگر ان مہاجرین کی بدولت اردو ان صوبوں کی گلی گلی میں پھیل گئی ہے۔ اور ہر جگہ وہ بولی اور سمجھی جانے لگی ہے، بلکہ بیوپار اور تجارت کی راہ سے وہ بازاروں پر قبضہ پا رہی ہے۔ اور کراچی پر تو پورا قبضہ اردو ہی کا ہے۔ اندرون سندھ ہر صوبہ کی زبان کے ساتھ ساتھ ہماری قومی زبان دوش بدوش ترقی کر رہی ہے۔ چنانچہ پشاور، راولپنڈی، لاہور، ملتان، حیدرآباد سندھ، کراچی، ڈھاکہ اور سلہٹ سے اردو زبان کے اخبارات اور رسائل کثرت سے نکل رہے ہیں اور پڑھے جا رہے ہیں۔ پنجاب کے سرکاری دفتروں میں وہ داخل ہو رہی ہے اور یونیورسٹی کی تعلیم میں اس کے ذریعہ تعلیم بننے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ کراچی میں ایک پورا کالج سارے مضامین کی تعلیم اردو میں دے رہا ہے۔ اسی طرح سندھی اور بنگالی اسکولوں میں سندھی اور بنگالی کے ساتھ ساتھ اردو بھی پڑھائی جا رہی ہے۔ جن تعلیم گاہوں میں سندھی اور بنگالی طالب علموں کے ساتھ ہندوستان سے آئے ہوئے طالب علم بھی پہلو بہ پہلو کلاسوں میں تعلیم پا رہے ہیں، ان کے دو اثر نمایاں طور پر ظاہر ہو رہے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ان صوبوں کے طلبا اردو بولنے چالنے کے موقع پا رہے ہیں اور گھلا ملا ان کی مشق بڑھ رہی ہے، دوسرا یہ کہ سندھی اور بنگالی سنسکرتی ہندی کے بجائے اردو سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔

مملکت پاکستان کی عام زبان ہونے کے باعث اردو ایک اور میدان میں بھی بڑھ رہی ہے اور وہ بیرونی ممالک ہیں، وہاں کے سفرا یہاں آ رہے ہیں، یہاں کے سفرا وہاں جا رہے ہیں۔ نتیجہ میں اردو دوسرے ملکوں کی حدود میں قدم جما رہی ہے۔ مصر و شام کے سفیر و سیلون کے ہائی کمشنر اردو سیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح ہمسایہ ممالک ایران، عراق، البحرین اور کویت اور جدہ میں بھی اپنا قدم جما رہی ہے۔ پاکستان کی زبان ہونے کی بنا پر بعض یورپین بھی اس کے سیکھنے میں شوق دکھا رہے ہیں۔ یہ سب آثار نیک ہیں اور اردو کے مستقبل کی تابناکی کا پتہ دیتے ہیں۔

۱۳ محرم ۱۳۷۱ھ - ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء

خطبۂ صدارت اجلاس شعبۂ ترقی اردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

منعقدہ پونا بتاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۵ء

(منقول از روداد کانفرنس مذکور بابت اجلاس ۱۹۱۵ء پونا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً

مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي،

کبرنی موت الکبراء حضرات! آج مجھے ہندوستان کی ایک عظیم الشان تعلیمی مجلس کے ایک علمی شعبہ کی صدارت کی عزت ملی ہے، یہ بظاہر میرے لئے مسرت کا دیباچہ تھا لیکن آہ اس دیباچہ میں بدبختی اور شومی نصیب کے کتنے ابواب اور فصول ہیں اب سے صرف ڈیڑھ سال پہلے اس اعزاز کے لئے کئی اکابر کے نام پیش کئے جاسکتے تھے حضرت الاستاذ علامہ شبلیؒ، شمس العلما مولینا حالی، خواجہ غلام الثقلین ہماری زبان کے وہ ارباب قلم اور ہندوستان کے وہ سخن نگار تھے جن کا وجود ہمیشہ قوموں اور ملکوں کی عزت کا تاج ہوتا ہے لیکن بدنصیبی کی انتہا ہے کہ ہمارے دامن کا ایک ایک

موتی اور ہمارے علمی خزانہ کا ایک ایک گوہر ہم سے کھو چکا ہے اور اسلامی ہند کے ظلمتکدہ میں فضل و کمال کا کوئی چراغ نظر نہیں آتا۔ ع

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

آج کی صحبت کی صدر نشینی خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم میں فضل و کمال کی کمی کتنی ہے اور ارباب علم و ہنر کا قحط کہاں تک ہے۔ نظامیہ بغداد کے ایک عالم نے سب سے پہلی دفعہ جب درس کی مسند پر قدم رکھا تو کہا۔

خلت الدیار فسدت غیر مسود ومن البلاء تفردی بالسودد

(ملک خالی ہو گیا اور میں بندگی کے بغیر بزرگ بن گیا اور میرا اس بزرگی کے ساتھ تنہا ہونا ایک قسم کی مصیبت ہے)

آج بھی وہی موقع ہے کہ اس کو پڑھا جائے اور کہا جائے کہ؛

کبرنی موت الکبراء "بڑوں کی موت نے مجھ کو بڑا بنایا ہے"

بہرحال آپ لوگوں کی اس عزت بخشی کا ممنون ہوں۔

اردو | حضرات اردو زبان کی تاریخ سید انشاء کے زمانہ سے لیکر شمس العلماء آزاد کے عہد تک بار بار اتنی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اب وہ پرانی کہانی بن گئی ہے پھر بھی میں اس پر ایک دوسری حیثیت سے نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کے گھرانے، سامی، تورانی، ایرانی، تین مستقل خاندانوں اور تین مختلف زبانوں میں بٹے ہوئے تھے، اسلام کا بڑا کارنامہ سب کو ملاتا اور جوڑنا ہے اس کا تمدن، مصر و شام و عجم اور روم و یونان کے تمدنوں کا خلاصہ ہے، اس کے علوم و فنون ہندوستان، بابل، فارس، یونان اور اسکندریہ کے تجربہ خانوں اور درسگاہوں کا عطر ہیں، اس کی نسل تورانی، آریائی اور سامی قوموں کا مجموعہ ہے، اس کی زبان میں سنسکرت

پہلوی، قبطی، سریانی، لاطینی، اور یونانی الفاظ و اصطلاحات کا ذخیرہ ہے، اسلام کی دنیا میں نسل، وطن اور زبان کی کوئی تفریق نہیں جس طرح دنیا کا ہر گوشہ اس کا وطن ہے دنیا کا ہر لغت اس کی زبان ہے۔

عرب کے بادیہ نشین جب فاتحانہ پرچم کے سایہ میں عرب کے ریگستان سے باہر نکلے تو جس طرح ایران کا درفش کاویانی، چین کی دیوار، مصر کے اہرام، افریقہ کے صحارا اور اندلس کا دریا اُن کے سیاسی زور و قوت کو روکنے سے عاجز تھا اسی طرح اُن کی عربی زبان کی معنوی استیلا و اقتدار سے بھی بچاؤ ان کے لئے ناممکن تھا، ایران کی پہلوی، شام کی سریانی، مصر کی قبطی، افریقہ کی بربری اور اندلس کی اسپینی زبانیں دفعۃً پردۂ عالم سے گم نہیں، ایوان حکومت عرب سپہ سالاروں کے ماتحت تھے تو معبدوں اور کلیساؤں کی درسگاہیں عربوں کے ادبیات و علوم کا سرچشمہ بن گئیں، سندھ کے کناروں سے اٹلانٹک کے ساحل تک ایک زبان تھی جو ساری دنیا پر حکمرانی کر رہی تھی اور وہ قرآن کی زبان تھی۔

ان ملکوں کی دیسی زبانوں کا یہ تغیر انقلاب عربوں کی زبردستی اور حکومت کے زور کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ خود عربی زبان کی سہولت، اس کے الفاظ کی ثروت، اس کے علوم کی کثرت کو اس میں دخل تھا، عبدالملک کے زمانہ تک اسلامی سلطنت کے ہر صوبہ کی ملکی زبان ہی وہاں کی سرکاری اور دفتری زبان تھی، ایران کی پہلوی زبان گو مٹ گئی، لیکن عربی آمیز فارسی نے دفعتہً ظہور کیا اور خود بغداد کا خلیفہ اعظم مامون الرشید اس کا مربی بن گیا، پروفیسر براؤن نے لٹریری ہسٹری آف پرشیا میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ پہلوی زبان رسم خط کے بدل جانے اور استعمال سے جانے

رہنے کا اصلی سبب عربی زبان و خط کی شیرینی اور سہولت تھی، تاتاریوں نے اس زور شور سے اسلام پر حملہ کیا کہ خوارزم سے لے کر بغداد تک صرف خاک کا ڈھیر رہ گیا، لیکن اُن کی ترکی و تاتاری زبانیں عربی کا مقابلہ نہ کر سکیں اور آخر فاتح کو مفتوح کے آگے جھک جانا پڑا، اور اب ترکی و تاتاری زبانوں کے حسن و رونق کا سبب صرف عربی الفاظ کا جامہ عاریت ہے، عرب جس ملک میں گئے یا تو وہاں کی زبان بدل گئی اور بدل نہ گئی تو اُن کی زبان کے الفاظ نے دیسی ملکوں کے الفاظ سے مل جل کر ایک نئی زبان کا ہیولیٰ تیار کر دیا، نئی فارسی، نئی ترکی، نئی ملائی، نئی بربری اور نئی ہندوستانی نے اسی طرح جنم لیا۔

عرب و ہند کا تعلق اسلام سے بہت پہلے سے اور نہایت پرانا ہے، خاص کر عرب اور ہندوستان کے اس خطہ میں جہاں خوش قسمتی سے اس وقت ہم جمع ہیں[1] ہندوستان کی تمام مصنوعات اور پیداوار انہی سواحل سے عرب کو اور عرب کی راہ سے یورپ تک پہنچتی تھی، اس بناء پر مسالے اور خوشبودار چیزوں اور کپڑوں کے سنسکرت اور ہندی نام قدیم عربی زبان میں بھی داخل ہو گئے ہیں، زنجبیل، فلفل، نیلوفر، مشک، صندل، ستکت، یا کم از کم ہندی ہی زبان کے الفاظ ہیں۔

مسلمانوں کا ہندوستان پر حملہ پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے، اور یہ سُنکر حیرت ہو گی کہ اس حملہ کی ابتداء مسلمانوں کے فاتحانہ جذبات کا نتیجہ نہ تھا، جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے بلکہ ایرانیوں کی اعانت کے لئے ہندوستان کی آمادگی ہے اور اس کا نتیجہ مسلمانوں کا حفظ ما تقدم کے طور پر سندھ پر قبضہ ہے، تقریباً اس کے چار سو برس کے بعد ترک اور ایرانی فتوحات کا سیلاب درۂ خیبر سے گذر کر ہمالیہ کے پانچ دریاؤں

---

[1] یعنی گجرات کے اطراف۔

میں آکر بل گیا یہ **اُردو** زبان کی تاریخ کا پہلا[1] دن ہے۔

ہندوستان کسی زمانہ میں بھی ایک نہ تھا اور مستقل ملک نظر نہیں آتا، یہاں کا ہر صوبہ ایک نئی راجدہانی، ایک نئی زبان، ایک الگ تمدن یعنی ایک ایک نیا ملک تھا جو اپنے لئے مخصوص خصوصیات رکھتا تھا سنسکرت زبان یہاں کی مشترک مقدس زبان ضرور نظر آتی ہے لیکن تاریخ سے یہ ثابت نہیں کہ یہ کسی زمانہ میں تمام ہندوستان کی مشترک گفتگو کی زبان تھی ہندوستان کا میدان داخلی اقوام کے علاوہ خارجی حملہ آور قوموں کا بھی ہمیشہ جولانگاہ رہا ہے، سیتھین یعنی ایک تورانی النسل شاخ، پھر آرین، پھر یونانی، پھر عرب، ترک پٹھان مغل اقوام یکے بعد دیگرے ہندوستان میں داخل ہوئے، سولھویں صدی میں اہلِ یورپ کا یہاں کے سواحل پر گذر ہوا جن میں سب سے پیشتر پرتگالی اور ان کے بعد فرنچ اور سب کے آخر میں انگریز تھے، ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں، مختلف قوموں مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا ناگزیر ہے، کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو، وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام **اردو** ہے۔

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو زبان صرف فارسی، عربی، سنسکرت اور بھاشا کا مجموعہ ہے، حالانکہ ترکی اور پرتگالی الفاظ بھی اس میں کم نہیں، چنانچہ قدیم شاہانہ شان و شکوہ اور جنگی اصطلاحات و آلات کے متعلق اکثر الفاظ ترکی سے آئے ہیں، جو محمد شاہ کے زمانہ تک ایران شاہی کی زبان تھی، اسی طرح ابتدائی یورپین چیزیں جو ہندوستان میں آئیں جن کی اصل انگریزی میں موجود نہیں وہ اکثر پرتگالی ہیں، مثلاً نیلام یا پوٹن

---

[1] اردو کی تاریخ کی نسبت یہ چند اشارے ۲۲ برس پہلے کئے گئے تھے اردو کی یہ تاریخ محققوں کی کوششوں سے آج پوری طرح ثابت ہوگئی ہے۔ سید سلیمان، ۱۹ اگست ۱۹۳۷ء

جس کو ڈبل روٹی کہتے ہیں جس کو غلطی سے کبھی پاؤ روٹی سمجھا جاتا ہے کہ شاید وہ روٹی پاؤ بھر آٹے کی بنتی ہے بعض شستہ لوگ جو اپنی فارسی دانی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں وہ نان پنبہ کہتے ہیں، کہ یہ روئی کی طرح نرم ہوتی ہے، حالانکہ یہ پون لفظ ہے جو پرتگالی ہیں روٹی کو کہتے ہیں۔

بہرحال اس تفصیل سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کسی قوم کی زبان نہیں ہے، اس زبان ہندی، اسلامی، یورپین تمام زبانوں کا ذخیرہ ہے اور اس لئے اس کی ملکیت کا باشندگان ہند بجا طور سے دعویٰ کر سکتے ہیں، اور اس کو مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں، بلکہ ہندوستان کی مشترک زبان ہے، جس میں پنجابی بولنے والا، بنگالی سے، اور مرہٹی بولنے والا گجراتی سے بے تامل اظہار مطلب کر سکتا ہے۔

ہندوستان میں تقریباً تین سو بولیاں اور زبانیں ہیں، جو پہاڑیوں اور صحراؤں کے چھوٹے چھوٹے آوارہ گرد قبائل سے لیکر بڑی بڑی قوموں پر مشتمل ہیں، اگر ہندوستان ایک ملک بننا چاہتا ہے اور اس کے قومی تعلیمی اور سیاسی خیالات کو بحیثیت ایک قوم اور ایک ملک کے ترقی کرنا ہے تو ایک مشترک زبان کے بغیر چارہ نہیں۔

اردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا نہیں، بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر لازمی نتیجہ ہے اور اس کا پیدا ہونا ضرورۃً، وہ مجبوراً تھا مسلمان ترکی اور فارسی زبان لے کر ہندوستان آئے اس پہ دو سو برس بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ ایک مشترک زبان یہاں پیدا ہوگئی، اردو شاہجہان کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں، خلجیوں اور تغلقوں ہی کے زمانہ میں یہ پیدا ہو چکی تھی، چنانچہ چند کوی کی تاریخ جو پرتھی راج کے حال میں ہے اور جس کی تصنیف کا زمانہ غوریوں کا

عہد[1] کا بتایا جاتا ہے، عربی اور فارسی الفاظ سے مالا مال ہے، اس کے بعد امیر خسرو کی زبان میں ہندی الفاظ اور کبیر داس کی زبان میں جو سکندر لودی کے عہد میں تھا، عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش اردو کی ابتدائی شکل کو ظاہر کرتی ہے، رفتہ رفتہ یہ آمیزش بڑھتی گئی، اور فوجی معسکروں میں جو ہندوستان کی مختلف اقوام کا سب سے زیادہ مخلوط مجموعہ تھا، یہ بولی زبان بن گئی اور اسی سے عام لوگ اس کو اردو کہنے لگے، اردو ترکی زبان میں معسکر (فوجی پڑاؤ) کو کہتے ہیں، اسی بناء پر ہندوستان کی اس مشترک زبان کو اردو کہنا میں اصطلاح کی غلطی سمجھتا ہوں، اردو کے ابتدائی مصنفین نے اس کو ہمیشہ ہندی کہا ہے، اور انگریزوں کی زبان میں اب تک اس کا نام ہندوستانی ہے۔

میں نے کہا ہے کہ اس قسم کی مشترک زبان کا ایسی مخلوط اقوام کے میل جول کے موقع پر پیدا ہونا قوموں کے میل جول کی تاریخ کا مسلمہ نتیجہ ہے، یہ مسئلہ اس وقت اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے جب ہم خاص اس سرزمین پر غور کرتے ہیں۔ جہاں ہم اس وقت اکٹھے ہیں، شمالی ہندوستان اگر ہندوستان میں نئی آنے والی قوموں کا شارع عام رہا ہے تو جنوبی ہندوستان یا دکن بعد کو آنے والی قوموں کے لئے شکست کھا کر مجتمع ہونے کے لئے ملجا رہا ہے، نئی حملہ آور قوم نے اگر شمالی ہندوستان سے اپنی پیش رو قوم کو دھکیلا ہے تو دکن ہی کی پہاڑیاں اس کے لئے جائے پناہ بنی ہیں، یہی سبب ہے

---

[1] یہ نظریہ کہ یہ کتاب غزنویوں کے زمانہ میں لکھی گئی اب قطعی طور سے غلط ثابت ہو چکا ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ شاہجہان کے عہد سے پہلے نہیں لکھی گئی، اس کتاب پر حافظ محمود خاں شیرانی کے فاضلانہ تبصروں نے جو اورینٹل کالج میگزین میں چھپ رہے ہیں اس بھید کو پوری طرح کھول کر رکھ دیا۔

سید سلیمان ندوی ۱۷ر اگست ۱۹۳۶ء

کہ آج جنوبی ہندوستان، قدیم قوموں سے لیکر آخری دور جدید کی قوموں تک کا تماشا خانہ اور جلوہ گاہ ہے، شمالی ہندوستان میں پشاور سے مرشد آباد اور ڈھاکہ تک اُردو زبان کی عملداری ہے، اگر بیچ بیچ میں پشتو، پنجابی اور بنگالی زبانیں بھی آڑے آجاتی ہیں، لیکن یہاں بمبئی اور مدراس کے احاطوں میں ہر سو میل ایک مستقل زبان کی حکومت کا رقبہ ہے، گجراتی مرہٹی، کنڑی، تامل، تلنگو، اڑیی خدا جانے کتنی زبانیں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہی سبب ہے کہ اُردو کی مشترک زبان کی ضرورت سب سے پہلے دکن میں محسوس ہوئی، اور ولی دکنی اور سراج دکنی[۱] وغیرہ اُردو کے شاعر یہاں سب سے پہلے پیدا ہوئے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اردو ملک ہندوستان کی عالمگیر زبان کا نام ہے اور اسی لئے ہندوستان کی تمام قوموں کو اس کی ترقی و اشاعت میں برابر کا حصہ لینا چاہیئے اور اصل یہ ہے کہ خود ہندوستانی اقوام سے زیادہ انگلش گورنمنٹ اس نو زائیدہ بچہ کی تولیت کا حق سب سے زیادہ رکھتی ہے کہ اس کو بولی سے زبان تک پہنچانا اسی کی مصلحتوں اور ضرورتوں کے لئے تھا، پھر وسائل سفر کی آسانی نے ہندوستان کے تمام دور دراز صوبوں کو ایک ہی گھر کے چند صحن بنادیئے ہیں، اسی بنا پر قومی تعصبات کے باوجود وہ ہندوستان کے کونے کونے اور گوشہ گوشہ میں بولی اور سمجھی جانے لگی ہے، اور ہر روز اس کی ترقی کا قدم آگے ہے، یہاں تک کہ آج ایک مرہٹہ ملک میں میں اردو بول رہا ہوں، اور پورا مجمع اچھی طرح مطلب آسانی سے سمجھ رہا ہے بلکہ اس کے کنارے

۱؎ دکنی زبان کی نئی تحقیقات نے اس سے بھی صدہا سال پہلے کا کھوج نکالا ہے اور اس بیس بائیس برس کے عرصہ میں دکن میں اُردو شاعری کی تاریخ کا سراغ سینکڑوں سال آگے کو بڑھ گیا ہے۔

پیام سلیمانی (اردو)، ۱۸ دسمبر ۱۹۳۲ء

سے گذر کر جزیرۂ نما اور سواحل عدن تک پہنچ چکی ہے۔

اردو کے قواعد پہلے انگریزوں نے لکھے یا لکھوائے

اُردو زبان اپنے قواعد و لغت کی تدوین میں سب سے زیادہ انگریز قوم کی ممنون ہے، کیونکہ کسی زبان کے سیکھنے کی دقت سب سے پہلے غیر ملکی ہی محسوس کرتے ہیں۔ انگریزی زبان کی سب سے پہلی ڈکشنری ایک فرانسیسی نے لکھی، عربی زبان کے قواعد اور لغت کی تالیف سب سے پہلے اخفش، سیبویہ، اصمعی، ابوعلی فارسی وغیرہ نے کی، جو سب کے سب عجمی تھے۔ اس بنا پر اگر فالن نے اُردو کی سب سے پہلی مکمل ڈکشنری لکھی، یا جان گلکرسٹ صاحب نے ہندوستانی قواعد کی کتابیں یا ڈی تاسی نے اُردو ادبیات کی سب سے پہلی علمی تاریخ مرتب کی تو تعجب کی بات نہیں۔

سادہ اردو

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس زبان کو تکلفات اور تصنعات سے بری کر کے سادہ علمی و تحریری زبان بنانا انگریزوں کی رہنمائی سے ہوا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کو سادہ اور بے تکلف تحریری زبان بنانے کا فخر امام الہند شاہ ولی اللہ کے خانوادۂ علمی کی قسمت میں تھا، مولانا اسمٰعیل (و ۱۱۹۳ھ ۱۷۸۲ء – ف ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۰ء) کی زبان جو تقویۃ الایمان میں نظر آتی ہے، آج بھی فصاحت اور زبان کی سادگی کا بہترین نمونہ ہے، شاہ عبدالقادر صاحب کی موضح قرآن (۱۲۰۵ھ) بھی بیان کی صفائی میں کم نہیں۔ اس کے بعد مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب کے خطوط کی زبان ہے جو غالب کے بقائے نام کا اُن کے اُردو اور فارسی دیوانوں سے زیادہ محفوظ ذریعہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان کا سب سے پہلا حقیقی مصنف جس نے زبان کو ہر قسم کی سیاسی، تعلیمی، مذہبی، علمی اور اخلاقی مباحث و مضامین کے قابل بنایا، سر سید کی ذات تھی، اور اس کے بعد بہت سے

دوسرے ہندو اور مسلمان مصنفوں کا درجہ ہے۔

ملکی زبان | اُردو زبان چونکہ قومی نہیں بلکہ ملکی زبان ہے، اس لئے اس کی تحریری ترقی و اشاعت میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کا برابر حصہ رہا ہے تاہم انیسویں صدی کے اختتام پر بعض نافہم حکام کی بدولت اردو اور ہندی کا ناگوار قضیہ پیدا ہوا، اور اسی کے لئے ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اُردو کی بنیاد ڈالی گئی کہ زبان اردو کے حقوق کی حفاظت ہو سکے، اردو زبان ہندوستان کے ہر صوبہ میں ایک حریفِ مقابل سمجھی جاتی ہے پنجاب میں اس کو پنجابی سے مقابلہ ہے، صوبہ متحدہ اور بہار میں ایک بے معنی نام ہندی زبان ہے، اڑیسہ میں اڑیا زبان اس کی حریف ہے بمبئی میں مرہٹی، سندھی، گجراتی اور کنڑی چار پہلوانوں سے اس کا معرکہ ہے، مدراس میں تامل، تلنگو اور اروتی سے دو دو چار ہے تاہم دلی کے قلعۂ معلّٰی کا پہلوان پنجاب کے شیر کو زیر کر چکا ہے، ہندی زبان اس سے جدا نہ تھی، ایک ہی حقیقت کے دو نام تھے۔ اب اصل معرکہ گاہ بمبئی اور مدراس کے سواحل اور پہاڑیاں ہیں، لیکن یہاں بھی وہ بول چال کی حیثیت سے نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے، ایک بڑا سوال یہاں کے انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں اس کا داخلہ تھا اور الحمدللہ کہ چند سال ہوئے یہ مرحلہ بھی طے ہو چکا اور وہ مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں میں اختیاری زبان کی حیثیت سے قبول کی جا چکی ہے، لیکن اب بھی حقیقت میں مشکلات کا پورا حل نہیں ہوا۔

قومی زبان | حقیقی خواہش تو یہ ہے کہ اُردو زبان ہندوستان کی تمام قوموں اور باشندوں کی مشترک زبان قرار دی جائے، اگر بدقسمتی سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے، تو کم از کم اس کی کوشش ضرور ہونی چاہیئے کہ وہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی مشترک

زبان بن جائے، تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو علمی، مذہبی، قومی، سیاسی اور تعلیمی ہر حیثیت سے ایک متحد قوم کی حیثیت سے کام کرنا ہے، ہندوستان کی تمام اسلامی آبادیاں جو مختلف صوبوں میں رہتی ہیں، اور مختلف زبانیں بولتی ہیں، اگر مشترک زبان اختیار کریں تو اُن کی متحدہ قومیت اپنی متحدہ جامعیت کے لئے کیا شئے پیش کرے گی صوبوں کی چھوٹی چھوٹی زبانیں اور بولیاں جہاں مسلمانوں کی ایک تعداد آباد ہے۔ اُن کے لئے مذہبی، علمی، تعلیمی سرمایہ مستقل طور سے مہیا نہیں کر سکتی ہیں، حالانکہ قومیت کی تعمیر کے لئے یہ اساس و بنیاد ہیں، اس بناء پر اس سے چارہ نہیں کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی علمی و مذہبی و تعلیمی ضروریات کے لئے ایک مشترک زبان قرار دی جائے

تعلیمی زبان | لیکن سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ بنگال اور جنوبی ہند کے جن جن صوبوں میں مسلمان آباد ہیں، اردو کے علاوہ وہاں کی ایک ملکی زبان بھی ہے اور اصول حکومت اور آئین عامل کی رُو سے گورنمنٹ نے ہر احاطہ کی سرکاری، اور دفتری زبان کو اس احاطہ کی عام ملکی زبان قرار دیا ہے، جو کہیں بنگالی ہے، کہیں مرہٹی ہے۔ کہیں گجراتی ہے اور یہی وہاں کے سرکاری مدرسوں کی اہم ورنیکولر زبانیں ہیں، اس حالت میں مسلمان لڑکے تنہا اُردو لیں تو سرکاری دفتروں میں وہ کارآمد نہیں رہتے، اور اس لئے وہاں ان کے لئے جگہ نہیں نکل سکتی، اور اگر نہیں لیتے تو وہ اپنی قومیت کو فنا کرتے ہیں، اور اگر اُردو اور دوسری دیسی زبان دونوں ساتھ لیں تو وہ اپنے مقابل کے ہموطن طالب علموں کے مقابلہ میں کمزور رہتے ہیں جنوبی ہندوستان میں اُردو کو تعلیمی زبان قرار دینے میں اس وقت بھی سب سے بڑی دقت پیش آرہی ہے، پچھلے دنوں بمبئی گورنمنٹ نے مسلمان ممبروں اور اُردو کے حامیوں کی ایک کمیٹی اِن

مشکلوں پر غور کرنے کے لئے مقرر کی تھی، نتیجہ بحث یہ تھا کہ تمام فنون مسلمانوں کو اسکولوں میں اردو کے ذریعہ سے سکھائے جائیں، اس تجویز پر تقریباً عمل شروع ہو چکا ہے، قصبات میں اردو مکاتب قائم کر دیئے گئے ہیں، اردو معلمین کے پیدا کرنے کے لئے احمد آباد ٹریننگ کالج میں ایک اردو کلاس گورنمنٹ نے جاری کر دیا ہے، اردو مدارس کے لئے مسلمان انسپکٹر بھی مقرر ہیں، پھر بھی اس وقت تک پوری کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک اردو کے لئے خاص ٹریننگ کالج گورنمنٹ قائم نہ کر دے، ممکن ہے کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن جب غور کی نظر سے خود اردو کے علمی سرمایہ کو پرکھا جائے تو افسوس ہوگا کہ اتنے شور و غل کے بعد بھی ہم ابھی تک منزل مقصود سے بہت دور ہیں۔

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست خلق
تحسین کنند و او خجل از پائے زشت خویش

ہماری علمی محتاجی ملک کے علمی فقر و بے نوائی کا ماتم آج ہندوستان کے ہر گوشہ میں ہے علمی مذاق کی کمی کا یہ عالم ہے کہ برسوں گذر جاتے ہیں اور ملک میں کوئی اچھی تصنیف پیدا نہیں ہوتی، اور اگر خوش قسمتی سے ایک آدھ کتاب نکل بھی آتی ہے تو ناقدری سے رواج نہیں پاتی، اردو زبان ہندوستان کی عالمگیر زبان کہی جاتی ہے، ہندوستان کی بڑی بڑی ریاستوں میں وہ شاہی زبان تسلیم ہوتی ہے، پھر بھی ہندوستان کی دوسری صوبہ وار زبانوں کے مقابلہ میں ابھی اس کی جھولی کم مایہ ہے، اس کے کچکول میں اگر کچھ ہے تو شاعری اور افسانوں کے خزف ریزے ہیں۔ جن سے ایک عظیم الشان قوم کے لئے زندگی کا سامان میسر نہیں آسکتا، علوم و فنون ایک طرف، کیا اسلام کی کوئی جامع تاریخ موجود ہے۔

قوموں کی ترقی، صرف خیالات کی بلندی اور اصلاح پر منحصر ہے لیکن خیالات کا تغیر و انقلاب کس کے ہاتھ میں ہے، صرف تصنیفات اور ملک کے علمی کارناموں کے ہاتھ میں، اس بنا پر مسلمانوں کی ترقی کو ان کے لٹریچر کی ترقی پر منحصر سمجھنا چاہیئے ملک میں آج جا بجا اصلاحی مجلسیں قائم ہیں جو سال بسال اصلاحی تقریروں کا ایک انبار اسٹیج پر لگا دیتی ہیں، لیکن یہ بادہ ہوا ہستیاں جن کا وجود صرف ہوا کی چند موجوں سے ہے کبھی کوئی پائدار، مستقل اور مسلسل اثر قائم رکھ سکتی ہیں؟ اگر ان کی نصف کوشش بھی مفید تصنیفات کی اشاعت میں صرف ہوتی تو ہم قوم میں ایک پائیدار اور مستحکم تاثیر کا وجود پاتے، ہر گھر میں ایک دائمی اور غیر فانی خطیب موجود ہوتا جو ہر لحظہ قوم کو صحیح راستہ کی ہدایت کر سکتا۔

مسلمانوں کی سعی و کوشش کو چالیس برس ہوئے، لیکن یہ سن کر افسوس ہوگا کہ مسلمانوں کی چہل سالہ جد و جہد کے بعد اتنا سرمایہ بھی ابھی میسر نہ آسکا ہے جو تنہا ایک الماری کی زینت کا بھی باعث ہو سکے، لیکن اس وقت اور زیادہ افسوس ہوگا جب ہم الماری کے ایک ایک خانہ کو کھول کر دیکھیں گے کہ یہ پیداوار کس جنس سے بھرا ہے تو تاریخ، مذہب اور افسانہ کے سوا ہر علم کا خانہ خالی ملے گا۔ متمدن قومیں ہیں جو زمانہ کی اسی مدت میں اپنے خزانوں کو اتنا مالا مال کر چکی ہیں کہ اب ہر سکہ کے قرض خواہ انہی کی طرف رخ کر رہے ہیں۔

مادری زبان میں تعلیم

تعلیمی تحریک کی چہل سالہ چیخ پکار نے تعلیم کا احساس پیدا کر دیا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ صحیح اور عمومی تعلیم ملکی زبان میں تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، دنیائے گذشتہ اور موجودہ میں سیکڑوں قومیں عروج و کمال تک پہنچ

چکی ہیں۔ لیکن تاریخ اس مثال سے عاجز ہے کہ کبھی غیر ملکی زبان کی تعلیم قوموں کے عروج و ارتقاء کا باعث ہوئی ہے۔

لیکن جب ملکی زبان میں تعلیم کا مسئلہ پیش آئے گا تو کیا ہندوستان کے طول و عرض میں کوئی ٹکسال ایسی نظر آئے گی جہاں سے تعلیمی نصاب کی کتابیں ڈھل ڈھل کر باہر آئیں گی، یہ مقصد اس وقت تک ممکن الحصول نہیں ہو سکتا جب تک ملک کی زبان میں کثرت سے علمی تصنیفات موجود نہ ہوں، اعلیٰ تعلیم اور اس کے لئے کورس کی تکمیل تو بڑی چیز ہے ابتدائی مکاتب جو مسلمانوں کے اہتمام میں اب تک ہیں کیا ان کی ضرورت کے مطابق بھی سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے[۱]

اشخاص کا قحط زمانہ جدید نے اپنے انقلاب کے ساتھ ہمیں چند نفوس عطا کئے تھے جنھوں نے اپنے امکان بھر ان میں سے بعض ضرورتوں کو ایک حد تک پورا کیا، سرسید، نذیر احمد آزاد، حالی اور شبلی ہماری جدید نشأۃ علمیہ کے کارپرداز تھے، ان کی زندگی ہماری علمی ضرورتوں کی ضامن تھی، لیکن موت کے باد صرصر کا ہاتھ جب ان چراغوں کو گل کر چکا ہے تو مستقبل کا منظر کس قدر اندھیرا اور بھیانک نظر آتا ہے اور علمی کوششوں کے لئے پہلے سے کتنی زیادہ ضرورت بڑھ گئی ہے، ان ضرورتوں کے پوری نہ ہونے کی زیادہ تر ذمہ دار صرف دو چیزیں ہیں، مصنفین کی پریشان حالی اور تصنیفی سلیقہ کی تعلیم کے لئے کسی تربیت گاہ کا نہ ہونا۔

حقیقی مصنف ہر زمانہ میں پریشان حال رہے ہیں پھر بھی موجودہ زمانہ نے ان کو اور زیادہ پریشان بنا رکھا ہے، ان شاذ و نادر ہستیوں کے لئے جو اپنی زندگی کا مقصد

۱؎ یہ آج سے بائیس برس پہلے کا نقشہ تھا۔ س ۱۹ اگست ۱۹۱۷ء

صرف علم کی خدمت قرار دینا چاہتی ہیں، ہندوستان کی کئی ہزار میل کی وسعت میں امن و اطمینان کا ایک گوشہ بھی ہے؟ غیر ملکی حکومت ملکی مصنفوں کی دستگیری کے لئے تیار نہیں، کوئی قومی کتب خانہ ہماری ضرورت کے مطابق ملک میں موجود نہیں، اُن کی علمی مہمانداری کے لئے کوئی فنڈ نہیں جو ان کے دل و دماغ کو افکار سے فارغ کر سکے، نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مصنف جب ہر قسم کی کڑیاں جھیل کر، اور ہر طرح کی مصیبتیں اٹھا کر جب اپنی تصنیف کے چند اجزاء فراہم کر لیتا ہے تو صدا دیتا ہے:

من فاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم،

لیکن افسوس کی انتہا نہیں ہوتی۔ جب کرۂ ارضی اور فضائے آسمانی سے ایک آواز بھی ان جگر پاروں کی خریداری کے لئے نہیں اٹھتی۔

اگلے مصنفوں کا کام کتاب کا آخری صفحہ لکھ کر ختم ہو جاتا تھا، شائقین خود اس کے نسخے ہاتھوں ہاتھ نقل کر کے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق پہنچا دیتے تھے، لیکن حال کے مصنفوں کا کام ختم تصنیف کے بعد شروع ہوتا ہے، کتاب کو کسی مطبع کے حوالے کرنا، کاپیوں کی تصحیح، پروفوں کی ترمیم، روپیہ کی کافی مقدار کی فراہمی، اور پھر ریویو اور اشتہار کے لئے اخباروں کی خوشامد اور چاپلوسی، اور ان ساری مصیبتوں کے بعد کتاب کے نسخوں کو بغل میں دبا کر خریدار کی تلاش میں گلی کوچہ کی آوارہ گردی۔ کیا یہ قابلِ رحم حالت اس انسانی طبقہ کے مناسبِ حال ہے جس کی زندگی کا ایک ایک دم علم اور صرف علم کے لئے ہونا چاہئے تھا۔

پبلک کی ناقدر شناسی کا جہاں گلہ ہے خود مصنفوں کی نسبت بھی کچھ کہنے کی حاجت ہے، جسم کے مختلف اعضاء جس طرح اس کی زندگی کی مختلف ضرورتوں

کو پورا کرتے ہیں، قوم کی مختلف کارکن جماعتیں بھی اسی طرح اس کی زندگی کے ضروری آلات حیات ہیں، قوم کے ارباب قلم طبقہ کا کام جسم قومی کے لئے مقوی اور صحت بخش غذا کی فراہمی اور صحیح خون کی پیدائش ہے، اس بنا پر نہایت ضروری ہے کہ یہ طبقہ مختلف علمی غذاؤں کے انتخاب کا سلیقہ، کیمیاوی ترکیب و تحلیل کا طریقہ، موقع اور ضرورت کا علم، اور غذاؤں کی قوت اور ضعف کا فیصلہ، اسی حیثیت سے کر سکے جس طرح ایک جسمانی ڈاکٹر مادی جسم کے لئے ہر روز کرتا ہے، گاؤں کا ہر جاہل عطائی اس لائق نہیں کہ وہ جسم کے صحیح پرداخت کے لئے اپنی مختصر دکان کی بوسیدہ جڑی بوٹیوں سے کوئی نسخہ ترتیب دے سکے، اسی طرح ہر وہ شخص جو ہاتھ میں قلم پکڑ سکتا ہے تصنیف کی بلند سطح پر جگہ پانے کے لائق نہیں۔

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہندوستان کے بعض صوبے جس فراخدلی کے ساتھ ایک طرف جسمانی امراض کے لئے عطائیانہ اشتہاری نسخے ترتیب دے رہے ہیں، دوسری طرف علمی تندرستی کے لئے چھپے ہوئے کاغذوں کا ڈھیر لگا رہے ہیں، اس پر نظر کرتے ہوئے کون اس ضرورت کا کہ اردو کی ایک باقاعدہ انجمن کی ضرورت سے انکار کرے گا۔

اردو کا سرمایہ زبان کو زبان بنانے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے، اوّل اصول و لغت کی تدوین، دوم علمی تصنیفات اور تیسرے تراجم، ہم کو ان میں سے ہر ایک پر غور کرنا چاہیئے کہ اب تک کیا ہو چکا ہے۔

تدوین اصول و لغت کسی زبان کو زبان بنانے کے لئے سب سے پہلے اس کے اصول و قواعد کی تدوین اور اس کے لئے قاموس لغات اور ڈکشنریوں کی تالیف کی ضرورت ہے

اس سلسلہ میں اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے شروع میں جان گلکرسٹ نے قواعد اردو لکھی، اسی زمانہ میں سید انشاء نے بھی اردو کے قواعد لکھے۔ اس وقت سے لیکر اس وقت تک سرکاری مدارس اور انگریز افسروں کی تعلیم کے لئے متعدد رسالے لکھے جا چکے ہیں، امیر، ضامن علی جلال، شوق نیموی عظیم آبادی اور حافظ جلیل حسن جلیل کے رسالے بھی کام کے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ قابل قدر مولوی فتح محمد صاحب جالندھری اور مولوی عبدالحق صاحب کی قواعد اردو ہے، اور ان کتابوں سے ایک حد تک یہ کام تکمیل کو پہنچ رہا ہے، لیکن اردو کے لغت کا کام ابھی بہت پیچھے ہے۔ مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ کے سوا کوئی کامل کتاب اس فن میں نظر نہیں آتی، منشی امیر احمد صاحب کی امیر اللغات اب تک ناتمام ہے اور خدا جانے اس کی تکمیل کی کب تک نوبت آئے، بہرحال یہ چیز ابھی ہمارے التفات کی محتاج ہے۔

تصنیفات | اردو زبان کی مستقل ادبی تصنیفات سرسید، نواب محسن الملک، مولانا نذیر احمد، مولانا حالی، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی اور مولوی عبدالرزاق صاحب کی تصنیفات اور انجمن ترقی اردو کی بعض شائع کی ہوئی کتابوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے، ان کتابوں کی اگر ایک ایک فن کی حیثیت سے تقسیم کی جائے تو مذہب، تاریخ اور شاعری کے سوا ہر فن صفر یا قریب صفر کے نظر آئے گا، تاریخ کا یہ حال ہے کہ ہم کو سب سے پہلے اسلام کی جامع تاریخ جاننی چاہیے، لیکن مولوی ابوالفضل عباسی کی تاریخ الاسلام کے علاوہ کوئی کتاب نہیں، رہا پنجاب اور آگرہ کے بعض اشخاص کی پریشان اور نامعتبر کتابیں ہیں، مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے مختص ماخذوں کی بنا پر ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ سیاسی اور علمی دونوں حیثیت سے نہایت ضروری ہے۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم کی تاریخ ہندوستان، انگریزی فکر و دماغ کا بالکل عکس ہے۔

علوم عقلیہ کا تذکرہ اُردو تاریخ میں ایک افسوسناک باب ہے، علوم طبیعی و ریاضی کا سب سے قدیم سلسلہ لکھنؤ کے شاہی دربار کے ایک دو مختصر رسالے ہیں، اور قدیم سلسلہ میں سب سے مفصل رسالے حیدرآباد کے نواب شمس الامراء کے مختلف علوم میں چھ رسالے ہیں، جدید کو مستثنیٰ [illegible] ناانصافی ہوگی اگر پنجاب یونیورسٹی کے ابتدائی طبعی رسالوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ انجمن ترقی اُردو کی کوششوں سے مبادی سائنس اور فلسفہ جذبات دو کتابیں خاص اہمیت کے قابل ہیں، ان چند کتابوں کے سوا اُردو کا دامن افسوس ہے کہ ہر قسم کے علم و فن سے خالی ہے۔

تراجم

تراجم کے حصے میں عربی زبان اور مغربی زبانیں ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں عربی جاننے والے عالموں نے سب سے زیادہ خدمتیں انجام دی ہیں قرآن پاک، احادیث اور فقہ کی کتابوں کے علاوہ تاریخ ابن اثیر، تاریخ ابن خلدون تاریخ ابن خلکان، تاریخ ابن المغابہ وغیرہ کی کثیر التعداد اور ضخیم اردو میں منتقل ہو چکی ہیں، مغربی زبانوں سے لیبان کی تمدن عرب، بکل کی ہسٹری آف سویلیزیشن، ڈریپر کی معرکہ مذہب و سائنس کے سوا اور کوئی ممتاز چیز ہم کو نظر نہیں آئی۔

اردو زبان کی اس مختصر علمی پیمائش سے یہ ثابت ہوگا کہ ہم نے کس حد تک کام کیا ہے اور آگے ہم کو کیا کرنا ہے۔

ہندوستان میں ہندوستانی

یہ مقالہ انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۳۳ء کو پڑھا گیا!

شکریہ یا شکوہ عزیزان گرامی: آج مدت کے بعد آپ کے سامنے اظہار خیال کا موقع ہاتھ آیا ہے۔ اس کے لئے آپ کے استاد محترم رشید صدیقی صاحب شکریہ کے مستحق یا شکایت کے مستوجب ہیں کہ انھوں نے مجھے کچھ کہنے اور آپ کو اس کے سننے پر مجبور کیا، گو حضرت داعی کی طرف سے کسی مضمون کی تخصیص نہیں تھی، لیکن اردوئے معلیٰ کی تقریب سے میں نے مناسب سمجھا کہ اس مجلس کا موضوع "ہندوستان میں ہندوستانی" ہو۔

ہندوستان میں ہندوستانی اس زمانہ میں جبکہ ہر ملک میں یہ آواز بلند ہے کہ ملک کی باگ اہل ملک کے ہاتھوں میں دے دی جائے، یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ایران میں ایرانی اور مصر میں مصری اور عراق میں عراقی کی طرح "ہندوستان میں ہندوستانی" کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان میں صرف ہندوستانی ہوں، لیکن میں اطمینان دلاتا ہوں کہ "ہندوستانی" سے میری مراد "ہندوستانی باشندے" نہیں "ہندوستانی

"بھاشا" ہے، اور میری تقریر کا مقصود "سیاسی سوراج" نہیں بلکہ زبانی سوراج ہے آج کل بعض دوستوں نے "پنجاب میں اردو" اور "دکن میں اردو" لکھا ہے، اور ایک عزیز نے "گجرات میں اردو" لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ "غریب ہندوستان میں "اردو کی داستان" بھی کچھ سنائی جائے، خدا کے فضل سے اس میدان میں صوبہ متحدہ، پنجاب اور دکن کے علمائے ادب نے اتنی تحقیقات کی ہے کہ "آب حیات" کا نصاب افسانہ ہو کر رہ گیا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے برکات

عزیزان اسلام! جس ملک میں ہم آباد ہیں، یہاں ہمارے اسلاف جن اغراض اور اسباب سے بھی آئے ہوں، بہرحال اب ہم کو اسی ملک میں رہنا اور اسی زمین میں جینا اور مرنا ہے۔ آئیے ہم آپ تھوڑی دیر کے لئے اس پر غور کریں کہ اس ملک کو ہمارے بزرگوں کی آمد سے کیا خیر و برکت نصیب ہوئی

ہندوستان میں وحدت کا خیال

ہندوستان کو اسلام کے داخلہ سے جو علمی، تمدنی، تجارتی، صنعتی، تعمیری اور سیاسی فائدے پہنچے، ان کو یہاں شمار کرنا نہ ممکن ہے اور نہ ہمارے موضوع کے دائرے کے اندر ہے، لیکن یہاں صرف ایک حقیقت کا اظہار مقصود ہے، ہندوستان مسلمانوں کی آمد سے پہلے چھوٹے چھوٹے بے شمار ملکوں اور ریاستوں کا ایک ایسا مجموعہ تھا، جس کو کسی حیثیت سے ایک ملک نہیں کہہ سکتے تھے، یہاں مسلمانوں کی آمد کا وہ زمانہ تھا، جب اس ملک میں بدھ مت اور ویدک دھرم ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے کے لئے دست و گریباں تھے، وہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے بودھ مت کی سیاسی طاقت کو توڑا اور ویدک دھرم کو ترقی دے کر پورے ملک میں ایک مذہب کو اکثریت کا موقع عنایت کیا۔

ہندوستان جیسا کہ اُس وقت کی تاریخوں سے ظاہر ہے سیکڑوں چھوٹی بڑی ریاستوں اور مملکتوں میں بٹا ہوا تھا، سلطان غزنوی کے فتوحات کے عہد میں اس ملک میں دو اسلامی ریاستیں قائم تھیں، ایک ملتان میں اور دوسری منصورہ (جو بھکّر واقع سندھ) میں، ان کے علاوہ صوبۂ سرحد میں شاہی حکومت تھی۔ جس کا پایۂ تخت ویہند تھا، کشمیر، اجمیر، دہلی، قنوج، مگدھ (بہار) بنگال، گجرات، مالوہ بہت سی ریاستیں تھیں، جو ایک دوسرے سے باہم دست و گریباں بنی تھیں، مسلمانوں نے آکر ان ملکوں کو ایک ملک، اور ان ریاستوں کو ایک سلطنت بنایا جس میں پشاور سے لیکر سورت تک ایک حکومت قائم تھی۔

ہندوستان میں زبانوں کی کثرت

زبان کے لحاظ سے اس میں بھانت بھانت کی بولیاں تھیں، اور ہیں، چنانچہ پیمائش لسانی کے محققین کے نزدیک اس میں آج بھی تین سو سے زیادہ بولیاں مروّج ہیں، ان بولیوں کو چھوڑ کر یہاں کی صرف ممتاز زبانوں کو لیا جائے تو بھی یہ تعداد دہائی سے کم نہ ہوگی۔

مسلمانوں نے جب سے اس ملک میں قدم رکھا وہ یہاں کی زبانوں اور بولیوں کی کثرت کے شاکی نظر آتے، سنہ ۲۷۰ھ میں جبکہ سندھ کی اسلامی عربی حکومت پر پونے دو سو برس گزر چکے تھے، منصورہ (بھکر واقع سندھ) میں ایک ایسا عراقی مسلمان شاعر تھا جو ہندوستان کی مختلف زبانوں سے واقف تھا، اور اس نے الرا (الور سندھ) کے راجہ کی فرمائش سے قرآن کا ترجمہ ہندی (شاید سندھ کی کسی بولی) میں کیا تھا[1]۔ مسعودی جو سنہ ۳۰۳ھ میں ہندوستان آیا تھا، ہندوستان کی ملکی اور لسانی

---

[1] عجائب الہند بزرگ بن شہریار ص ۲ بریل۔

پریشان حالی کا تذکرہ ان لفظوں میں کرتا ہے۔

" بعض ازیں ہند کے لوگوں کے خیالات مختلف ہو گئے، اور مختلف گروہ پیدا ہو ہوگئے اور ہر رئیس نے اپنی ریاست الگ کر لی۔ تو سندھ پہ ایک راجہ بنا اور قنوج پر دوسرا اور کشمیر میں تیسرا اور مانگیر پر جو بڑا علاقہ ہے۔ (گجرات کا کھیاواڑ، بلہرا (و بلھرائے) کی حکومت ہوئی .... اور ان ریاستوں میں باہم اختلاف ہیں[1]۔

یہی مؤرخ آگے چل کر لکھتا ہے۔

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے .... اور مانگیر (یعنی گجرات) کی زبان گیری ہے اور اس کے ساحلی شہروں جیسے چیمور، سوبارہ اور تھانہ (بمبئی) کی زبان لاری ہے[2]۔

ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست ۳۷۷ھ میں ترتیب دی ہے، سندھ و ہند کی نسبت لکھتا ہے۔

"یہ لوگ مختلف زبانوں اور مختلف مذہبوں والے ہیں، اور ان کے لکھنے کے خط بھی کئی ہیں، ایک شخص نے جو اس ملک میں خوب گھوما پھرا تھا، بتایا ہے کہ وہاں ۲۰۰ خط مستعمل ہیں[3]

ابو ریحان بیرونی نے جو سلطان محمود غزنوی کا معاصر تھا، اور جس نے ہندوستان میں سالہا سال رہ کر یہاں کے علوم و فنون اور زبانوں کو سیکھا تھا، ایک موقع پر ہندوستان کے رسم خطوں کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

" ہندی خط بائیں طرف سے چلتا ہے، ان کے مشہور رسم خط کا نام سدھ ماترک ہے جو

---

[1] مروج الذہب مسعودی جلد اول صفحہ ۱۶۲ پیرس، [2] مروج الذہب مسعودی جلد اول صفحہ ۳۸۱ پیرس [3] کتاب الفہرست مصر صفحہ ۲۴۴

کشمیر کی طرف عموماً منسوب ہے، اور یہی بنارس میں جاری ہے اور یہی مدھ دیش یعنی صوبہ متوسط میں جو قنوج کے اطراف کا نام ہے، جس کو آریہ کہتے ہیں چلتا ہے، مالوہ کی حدود میں ایک خط جاری ہے جس کو ناگر کہتے ہیں، اور اسی کے بعد اردھ ناگری خط ہے، یعنی آدھا ناگر کیونکہ یہ ناگر اور دوسرے خطوں سے ملا جلا ہے اور یہ بھاٹیہ اور کچھ سندھ میں مروج ہے، اس کے بعد ملواری خط ہے جو ملوشت یعنی جنوبی سندھ میں رائج ہے، اور کنڑی کرناٹک میں اور انتری (آندھری) انتر (آندھر) میں اور دراوڑی دراوڑ دیش میں، اور لاڑی لاڑ دیش (گجرات و کاٹھیاواڑ) میں اور گوڑی (بنگالی) پورب دیش میں، اور بھکشک اودنپور میں اور یہ بودھوں کا خط ہے۔" (ص ۸۲)

رسم خط کے اختلاف سے ہر صوبہ کی زبانوں کا اختلاف بھی ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تو عربوں کے بیانات تھے، اب فارسی والوں کے لیجئے، امیر خسرو نے جو ساتویں صدی کے آخر اور آٹھویں صدی کے شروع میں تھے، اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیاں گنائی ہیں، سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی (واقع بنگال)، گجراتی، تلنگی، معبری، (کنڑی) دھور سمندری (کارومنڈل) اودھی اور دہلوی۔

امیر خسرو کے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانہ میں بھی یہی بولیاں تھیں، ابو الفضل آئین اکبری میں ان زبانوں کے یہ نام گناتا ہے۔

دہلوی، بنگالی، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، تلنگی، مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی، شالی، (جو سندھ، کابل اور قندھار کے بیچ میں ہے)، بلوچستانی، کشمیری، یہ زبانیں آج بھی موجود اور بولی جاتی ہیں، صرف ایک بمبئی کے احاطہ میں گجراتی، مرہٹی

گجراتی، کنڑی، اڑیہ اور سندھی، چھ زبانیں رائج ہیں۔ مدراس میں اڑیا، تامل، تلنگو، ملیالم اور اردو پانچ زبانوں کا رواج ہے۔ ایک حیدرآباد کی ریاست میں مرہٹی، کنڑی، تامل، تلنگی اور اردو پانچ زبانیں ایک ساتھ ہیں۔ بہار اور اوڑیسہ میں اڑیا، اردو، ہندی، اور بھوجپوری بولیاں ہیں۔ پنجاب میں پنجابی اور اردو کا میل ہے اور صوبہ سرحد میں پشتو، پنجابی اور اردو تین زبانیں دوش بدوش ہیں۔

ابھی حال میں مہا مہوا پادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" کے عنوان سے چند خطبے دیئے ہیں، جن کو ہندوستانی اکاڈیمی نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ فاضل موصوف نے اپنی دوسری تقریر کے خاتمہ میں سنسکرت کے بعد یہاں کی پراکرت زبانوں کا کچھ حال بیان کیا ہے اور ان کی حسب ذیل چھ قسمیں بتائی ہیں، ماگدھی، شورسینی، مہاراشٹری، پیشاچی، اوشک اور اپ بھرنش۔

ماگدھی | مگدھ اور اس کے قرب وجوار کے عوام کی زبان تھی۔ قدیم ماگدھی اشوک کے کتبوں میں ملتی ہے۔ عام طور پر سنسکرت کے ناٹکوں کے چھوٹے طبقہ مثلاً دھیور، سپاہی بدیسی، جین سادھو اور بچوں سے اسی زبان میں باتیں کرائی جاتی ہیں۔

شورسینی | شورسین یا متھرا کے قرب وجوار کے علاقہ کی زبان تھی۔ سنسکرت ناٹکوں میں عورتوں اور منتریوں کی بات چیت میں اس کا استعمال اکثر کیا گیا ہے۔

مہاراشٹری | مہاراشٹر یعنی مرہٹہ کی زبان، اس کا استعمال بالخصوص پراکرت زبان کی شاعرانہ تصانیف کے لئے کیا جاتا تھا۔

پیشاچی | پیشاچی زبان کشمیر اور ہندوستان کے مغربی وشمالی حصوں کی زبان تھی۔

اوڈک اونتی یعنی مالوہ کی عام زبان تھی، یہ زبان اُجین اور مندسور میں رائج تھی۔

آپ بھرنش اس زبان کا رواج گجرات، مارواڑ، جنوبی پنجاب، راجپوتانہ، اجین اور مندسور وغیرہ مقامات میں تھا، دراصل یہ کوئی زبان نہ تھی بلکہ ماگدھی وغیرہ مختلف پراکرت بھاشاؤں کی بگڑی ہوئی مخلوط بھاشا کا نام ہے۔ راجپوتانہ، مالوہ، کاٹھیاواڑ اور کچھ وغیرہ مقامات کے بھاٹوں کے ڈنگل بھاشا کے گیت اسی بھاشا کی بگڑی ہوئی صورت میں ہیں، قدیم ہندی بھی بیشتر اسی بھاشا سے نکلی ہے۔

جنوبی ہند کی بھاشائیں ان کے علاوہ ہیں۔

ٹامل۔ جنوبی ہند کی زبانوں میں سب سے قدیم اور فائق ٹامل ہے، اس زبان کا نشو و نما زیادہ تر جینیوں کے ہاتھوں ہوا، اس کا رسم الخط سب سے الگ ہے۔

ملیالم۔ ملیبار کی زبان ہے، مگر اس میں سنسکرت الفاظ بکثرت مل گئے ہیں۔

کنڑی۔ اس زبان کے ادبیات کی پرورش و پرداخت بھی جینیوں نے کی۔

تیلنگو۔ آندھرا صوبہ میں مروج ہے۔

مسلمانوں کی آمد اور زبانوں کی شکل تفصیل بالا ایک ہندو فاضل کی تصنیف سے ماخوذ ہے، ان حوالوں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں بیسیوں زبانیں مروج تھیں جو زیادہ تر مختلف صوبوں، مختلف قوموں اور مختلف دھرموں کے زیر سایہ اپنی ہستی برقرار رکھے ہوئے تھیں، مسلمانوں نے جب اس ملک میں قدم رکھا تو اس ملک کی زبانوں کی نیرنگی اور بھاشاؤں کی کثرت کو دیکھ کر متحیر رہ گئے، جیسے جیسے ان کا قدم اندرون ملک میں آگے بڑھتا گیا۔ اُن کی حیرت میں اضافہ ہوتا گیا، وہ قدرتی طور پر اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے تھے، عرب عربی، ایرانی، فارسی

اور ترک و مغل ترکی، مگر ان سب پر فارسی اثر غالب تھا، سندھ کے حکمراں گو عرب تھے۔ مگر ایران کے قرب اور فارسی تاجروں اور جہاز رانوں کی آمد و رفت کے سبب سے عربی آمیز فارسی کی ہر جگہ کثرت تھی اور ادھر درۂ خیبر سے جو قومیں آئیں اُن کی مادری زبان کچھ بھی ہو مگر ان کی سلطنت کی شاہی اور دفتری فارسی ہی تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی شاہی و سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔

دیسی زبانوں میں مسلمانی لفظوں کا میل

لیکن ملکی بول چال اور عام زبان کے لئے نہ تو یہ ممکن تھا کہ تمام ہندوستان کی زبان فارسی کر دی جائے، اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے کسی ایک صوبہ کی زبان کو اختیار کر کے اس کو پورے ملک پر محیط کر دیا جائے، اس لئے قدرتی طور سے یہ ہوا کہ مسلمان جس صوبہ میں گئے وہاں کی صوبہ دار زبان اختیار کی، ساتھ ہی مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی، اور علمی ضرورتوں سے اپنی زبان کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ اسی طرح اس ملک کی زبان میں مجبوراً بڑھائے۔ جیسے آج ہم انگریزی کے الفاظ و اصطلاحات اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہبی مصطلحات، اللہ، ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، دعا، خیرات، صدقات رسول، پیغمبر، وحی، کتاب الٰہی، دوزخ، بہشت وغیرہ بے شمار الفاظ ہیں جن کے بعینہٖ ہندوستان کی ہر ملکی بولی میں وہ اضافہ پر مجبور ہوئے۔

اسی طرح بادشاہ، وزیر، میر عدل، صدر جہاں، مقطع دار، صوبہ دار، سپہ سالار، قاضی وغیرہ، سیکڑوں سیاسی اصطلاحات تھے، جو ان کی سلطنت کے روزمرہ میں جاری تھے، وہ ہندوستان کی ان مختلف ملکی بولیوں میں بھی جاری ہو گئے۔ آج کل کی زمینداری خواہ وہ ہندوؤں کی ہو یا مسلمانوں کی جس قدر عہدے اور مالی اصطلاحات

ہیں وہ عموماً عربی فارسی آمیز ہیں مثلاً دیوان، نائب، تحصیلدار، عملدار۔ کارندہ، گماشتہ،
سیاہہ نویس، تحویلدار، واصل باقی نویس، خزانچی، متصدی، پیشکار، سررشتہ دار،
محافظ دفتر، محرر وغیرہ، اب اصطلاحات کو لیجئے واصل باقی، جمع بندی، مالگذاری، جمع
گذاری، گوشوارہ، فرد، بندارہ روزنامچہ، یادداشت، خلاصہ کیفیت، جنسوار، پروانہ،
نتیجہ وغیرہ یہ الفاظ نہ صرف اُردو اور سادہ ہندی میں بلکہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی
زبانوں میں بھی بعینہٖ یا ان کے دوسرے مرادف مستعمل ہیں، مرہٹی بولنے والے مرہٹے
اپنے وزیروں کو پیشوا اور عام ہندو ریاستیں ان کو آج تک دیوان کہتے ہیں اور یہ
دونوں فارسی ہیں، اسی طرح مرہٹی، گجراتی اور بنگالی میں معاملہ مقدمہ کے بھی اکثر
الفاظ اور اصطلاحات عربی یا فارسی ہیں، ہم اپنے صوبہ میں دیہاتی کسانوں کے سردار
کو چودھری کہتے ہیں لیکن مہاراشٹر میں اس کا نام مقدم ہے، کلرک کے لئے آپ
محرر بولتے ہیں، مگر وہاں اس کو کارکن کہتے ہیں۔

زراعت ہندوستان کا پیشہ تھا، مسلمانوں نے آکر اس پیشہ کو فن کی حیثیت
سے جو ترقی دی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مختصراً اتنا کہنا ہے کہ کابل، ترکستان
اور ایران کے بیسیوں میوے اور پھل وہ ہندوستان لائے، اور ان کے ساتھ ساتھ
اُن کے نام بھی آئے اور یہ سارے ہندوستان میں ہر بولی بولنے والوں کی زبانوں
پر بعینہٖ چڑھ گئے، انگور، انار، سیب، بہی، انجیر، نارنگی، خربزہ، تربزہ، بادام، منقیٰ،
کشمش، پستہ، شفتالو، ناشپاتی، آلو بخارا، شہتوت، خوبانی، بلغوزہ، فندق کے مزوں سے
اہل ہند ایسے مانوس ہوئے کہ ان پھلوں کے ساتھ ساتھ اُن کے ناموں سے بھی اپنی
زبان کو نئی لذت بخشی، پھولوں کے بہت سے اقسام مسلمان ہندوستان لائے۔ مثلاً

گلاب، سوسن، سنبل، ریحان، بنفشہ، خطمی، نرگس، نسرین، نسترن، گل طرہ، گل لالہ، عباسی
گل شبو، گل شب بو، گل مخمل وغیرہ۔ آج یہ واقعہ تعجب سے سنا جائے گا کہ تغلقوں کے
زمانہ میں دہلی اور اس کے نواح میں بارہ[12] سو باغ تھے، جن میں نو قسم کے انگور تھے، زیادہ تر فیروز شاہی
میووں کی تمہید سے مسلمانوں کے دسترخوان کے الوانِ نعمت یاد آئے، خشکہ، پلاؤ،
قبولی، بریانی، زردہ، شیر برنج، قورمہ، قلیہ، شوربا، کباب، یخنی، دم پخت، قیمہ، کوفتہ،
مزعفر، متنجن، حلوا، وغیرہ مسلمانوں نے پیش کیا، اور پورے ملک کے کام و دہن نے
ان کے ناموں سے لذت پائی۔ ٹھنڈک کے لئے شربت، فالودہ اور برف کا آبخورہ
سامنے رکھا۔ ہندوستان کی ایک روٹی کو کبھی نان بنایا، کبھی شیرمال، کبھی آبی اور
کبھی باقرخانی اور کبھی روغنی اور کبھی چپاتی اور کبھی کاک، اور کبھی کلچہ۔ مٹھائی ہندوستان
کی چیز ہے، مگر صورت اور مادہ کے ساتھ ناموں کا تنوع اسلامی تہذیب نے بخشا،
یہاں تک کہ مٹھائی بنانے والے کے لئے عربی نام حلوائی، مہابرہمن کی پاک اور پوتر
زبان کو بھی مجبوراً چھو لیتا ہے، اور حلوائی کے "خوانچہ" پر بالو شاہی جس کی اصل شاہ بالا
شاہی ہو، قلاقند یا برفی، شکر پارے، نمک پارے، خرمے، نقل، گلاب جامن
حبشی، نہ زعفرانی وغیرہ ملیں گے۔

کپڑوں کی نئی نئی صنعت کاریوں کی ایجادات کے ساتھ ان کے ناموں کو
بھی ہندوستان کی زبانوں میں فروغ دیا، مخمل، قاقم، کاشانی، زربفت، طاس،
منقش، شروانی، مشجر، کمخواب، دیبا، اطلس، تافتہ، بافتہ، مشروع، زری، گلبدن،
تن زیب، شال باف، جامہ دار، محمودی، علی قلی خانی، زرتار، چارخانہ، جامدانی، کامدانی،
برہنہ تن ہندوستان کو ان کپڑوں کی بدولت کرتہ، اچکن، چکن، پیشواز، مرزائی،

نیم آستین، جامہ، عبا، قبا، چوغا، فرغل، کلاہ، دستار، کلغی، شال، دوشالہ، چادر، پوستین، شلوار، پاجامہ، ازار، توشک، لحاف، فرش، قالین، مسند، بستر، رضائی، دولائی، تکیہ، غلاف، چادر، رومال، مندیل، موزے، ازار بند، کمربند کے نام عربی فارسی اور ترکی سے آئے، پان ہندوستان کی چیز تھی، مگر اس کے لئے پاندان، خاصدان اور اگالدان اسلامی تہذیب نے پیش کئے، کھانا کس ملک میں پکایا اور کھایا نہیں جاتا۔ مگر ہندوستان کی قناعت پسند طبیعت مٹی کے ہانڈیوں اور کیلے کے پتوں سے آگے نہیں بڑھی، مسلمانوں آئے تو دیگ، دیگچی، کفگیر، چمچہ، رکابی، پیالہ، بادیہ، قاب، دسترخوان، آفتابہ، آبخورہ، سیلابچی، صابون، خلال، بکاول، باورچی، رکابدار، خانساماں اپنے ساتھ لائے، مسلمان جب یہاں آئے تو سرِ شام یہاں دیا اور دیپک جلتا پایا، انھوں نے برسرِ محفل شمع جلائی، قندیل روشن کی، اور جابجا فانوس، دیوار گیر، لالٰہ، مردنگ اور فتیلہ سوز رکھے، اور ان سے مشعل چی نے مشعل جلا کر راستہ کو پُرنور کیا، ہندوستان ہمیشہ سے گرم ملک تھا، مگر شورہ لگا کر اور پہاڑوں سے برف منگا کر گرمی میں پانی کو ٹھنڈا مسلمانوں نے کیا اور چق، چلمن اور پردے لٹکا کر کمروں کو محفوظ کیا اور ہندوستان ہی کی ایک گھاس کو "خس" کہہ کر پکارا، اور اس کی ٹٹیاں بنا کر کھڑکیوں میں لگائیں۔

گھوڑے کی سواری کہاں نہ تھی، مگر جب مسلمان یہاں آئے تو لگام، زین، تنگ، خوگیر، رکاب، نعل، نکتہ، جل، جس کی خرابی جھول ہے، سائیس، سوار، شہسوار، تازیانہ، چابک، سب اپنے ساتھ لائے۔

جواہرات میں دُر عمانی، عقیق یمنی، لعل بدخشانی، زمرد، زبرجد، یشب، فیروزہ،

لہ اس کی تفصیلات بابر کی تزک میں ملیں گی۔

سنگ ستارہ، سب اُن کے لائے ہوئے ہیں، تعمیری پتھروں میں سنگ مرمر، سنگ سُرخ، سنگ سماق، سنگ لرزاں، سنگ خارا سب اُن کے نکالے ہوئے ہیں زیوروں میں سرپیچ، مرنا، آپے پرما، کلغی، طرہ، کانوں میں دُرّہ، گوشوارے، ہاتھوں میں دست بند جہانگیری، بازو بند، تونگے، جوشن، پری بند، گلے میں ہیکل، طوق، تعویذ، گلوبند، زنجیر، کمر میں کمرزیب، اور پاؤں میں پاؤزیب یہ اُن بیسیوں ناموں کو چھوڑ کر ہے جو ہندی میں وضع کئے۔

خوشبوؤں میں عطر اُن کی ایجاد ہے۔ اور خود عطر اور اس کے بیسیوں ہندی، فارسی اور عربی نام ان کے وضع کئے اور وہی ملک کی ہر زبان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ان مثالوں سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب یہاں قدم رکھا تو اپنے پورے تمدن و معاشرت، ساز و سامان اور اپنی اصطلاحات و ایجادات کو ساتھ لے کر یہاں وارد ہوئے، اور ان سب کے لئے نام، اصطلاحات اور الفاظ بھی اپنے ساتھ لائے اور چونکہ یہ ہندوستان میں بالکل نئی چیزیں تھیں اس لئے ہندوستان کی بولیوں میں ان کے مرادفات کی تلاش بیکار تھی، اور وہی الفاظ ہندوستان میں رائج ہو گئے۔

زبان کی ترتیب کے تین عناصر

زبان کی ترکیب تین چیزوں سے ہوتی ہے، اسم، فعل، حرف۔ مسلمانوں نے یہاں آکر جو زبان اختیار کی اس کے تمام فعل اور حروف ہندوستان ہی کے بولیوں کے اختیار کئے، البتہ آدھے اسماء جن میں بڑا حصہ نئی چیزوں اور نئے ناموں کا تھا، وہ اپنی زبان سے لائے، بقیہ اسماء بھی ہندوستان ہی کے ہیں، ایسی حالت میں ہندو مسلمانوں کے مسلمہ اصول تقسیم حقوق تہائی فیصدی سے زیادہ قبضہ تو مسلمانوں کا اس زبان پر نہیں، پھر کیا یہ ظلم نہیں کہ اس سے بھی

... ALI AHMAD RESEARCH ... INSTITUTE ... DELHI

دست بردار ہونے پر ہم کو مجبور کیا جاتا ہے۔

سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ

گذر چکا ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں الگ الگ بولی تھی، مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا "ہیولیٰ" اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا، عربی و فارسی بولنے والے مسلمان تاجر عراق، بندر ابلہ، سیراف اور بصرے سے نکل کر، سندھ کے بندروں سے گذر کر، گجرات ہو کر، بحر ہند کے کنارے کنارے سفر کرتے تھے، آخر پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی ساتویں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا، یہ اسلامی لشکر شیراز اور عراق سے مرتب ہو کر آیا تھا، جس کے یہ معنی ہیں کہ اس لشکر کے لوگ فارسی اور عربی بولتے تھے، اس کے بعد جو سوداگر اور تاجر یہاں آکر بود و باش اختیار کرنے لگے تھے وہ بھی عربی اور فارسی بولتے تھے، جہاز رانوں کی زبان بھی عربی و فارسی سے مرکب تھی، خود سندھیوں کی آمد و رفت بھی عراق میں لگی رہتی تھی خصوصاً جب ۱۳۲ھ میں خلافت کا مرکز شام سے عراق کو منتقل ہو گیا، اور سندھ کے پنڈت بغداد جا کر اپنی زبان سے عربی میں کتابوں کے ترجموں میں مدد دینے اور وہاں کے مختلف علمی و طبی منصبوں پر سرفراز ہونے لگے، اس زمانہ میں عربی میں ہندی کے بہت سے اصطلاحی لفظ، دواؤں اور خوشبوؤں کے نام داخل ہوئے، مثلاً بیڑہ جس کی عربی شکل بارجہ ہے، پلنگ جس کی عربی صورت فلنجہ ہے، جہاز کے خوابگاہ کے معنوں میں عرب ملاحوں نے اس کو استعمال کیا ہے، اسی طرح خوشبوؤں میں صندل (چندن)، کافور (کپور)، قرنفل (کرن پھول)، عود قماری (راس قماری کا عود) وغیرہ لفظ ہیں، دواؤں میں سب سے عجیب نام مجھے "بھط" معلوم

ہوتا ہے، جس کو خوارزمی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا، مفاتیح العلوم میں نقل کیا ہے جو ہمارے "بھات" کی خرابی ہے۔ جو مریضوں کی غذا تجویز کی گئی تھی، پھلوں میں انبج (انب) آم اور لیموں ہیں، جن کا ذکر سنہ ۳۰۴ھ میں مسعودی نے کیا ہے[1]، سندھ اور ملتان میں مسلمانوں کی ریاستیں تین سو برس تک قائم رہیں، اور آخر سلطان محمود المتوفی ۴۲۱ھ کے ہاتھوں ان دونوں ریاستوں کا خاتمہ ہوا، ان ریاستوں کا مذہبی تعلق بغداد اور مصر سے تھا اور خراسان، عراق، یمن، ایران اور مصر سے یہاں آنے والے تاجروں اور مسافروں کی برابر آمد و رفت لگی رہتی تھی، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ سندھ اور ملتان میں دیسی بولیوں کے ساتھ عربی و فارسی کا میل جول بڑھتا رہے، اور ایک نئی مرکب بولی کا ہیولیٰ تیار ہو، خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے پاس بعض ایسی شہادتیں موجود ہیں، جن سے کچھ نہ کچھ اس خیال کی تائید ہوتی ہے، بزرگ بن شہریار ملاح جو سنہ ۳۰۰ھ میں بحر ہند کے سواحل سے گزرتا رہتا تھا، اس نے اپنے بحری سفرنامہ میں جس کا نام عجائب الہند ہے کئی ہندی لفظ استعمال کئے ہیں، وہ سنہ ۲۷۰ھ کا ایک قصہ ہم کو سناتا ہے، شہر الورا واقع سندھ کے ایک ہندو راجہ نے منصورہ واقع سندھ کے مسلمان بادشاہ سے ایک ایسے مسلمان عالم کی درخواست کی جو اس کو اس کی زبان میں اسلام کی خوبیاں بتا سکے، بادشاہ نے ایک ایسے عراقی عالم کا انتخاب کیا جو ہندوستان کی بہت سی بولیاں جانتا تھا، چنانچہ وہ گیا اور سب سے پہلے راجہ کی خدمت میں اپنا ہندی قصیدہ پیش کیا، اور پھر قرآن کا ترجمہ کیا، بغداد کا سیاح اصطخری سنہ ۳۴۰ھ میں سلطان محمود سے تقریباً ساٹھ برس

---

[1] اب ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اورینٹل کالج میگزین مئی سنہ ۱۹۴۳ء میں "قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ" پر مضمون شائع کیا ہے۔

پہلے سندھ اور ملتان آیا تھا، وہ کہتا ہے:

"منصورہ (یعنی موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے، اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے"

(صفحہ ۱۷۷ طبع لائیڈن)۔

اس کے بعد بغداد کا دوسرا سیاح ابن حوقل بھی جس کی سندھ اور ملتان میں آمد کا زمانہ ۳۵۸ھ ہے یہی کہتا ہے کہ:

"منصورہ (بھکر) اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے" سفرنامہ ابن حوقل صفحہ ۲۳۲ لائیڈن)

اس کے چند سال کے بعد ۳۷۵ھ میں بشاری مقدسی ملتان آیا، وہ لکھتا ہے: "اور یہاں فارسی زبان بھی بولی جاتی ہے" (سفرنامہ بشاری صفحہ ۴۸۰ لائیڈن)

پھر دیبل یعنی ٹھٹھہ واقع سندھ کے حال میں کہتا ہے:

"دیبل (ٹھٹھہ) سمندر کے ساحل پر ہے اس کے چاروں طرف سو گاؤں کے قریب ہیں، اکثر غیر مسلم [illegible] ان کی زبان سندھی اور عربی ہے [illegible]"

ان معاصرانہ شہادتوں کی بنا پر یہ ماننا پڑے گا کہ عربی و فارسی الفاظ کا میل جول ہندوستان کے جس حصہ میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے، جس کی حد اس زمانہ میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھہ کے سواحل تک پہنچی تھی۔ اس زمانہ میں ایران و ترکستان و خراسان سے ہندوستان آنے کا راستہ براہ راست ملتان ہو کر تھا، چنانچہ سلطان محمود غزنوی بھی اسی راستہ سے ہندوستان آیا، اس کا منشا یہ تھا کہ اور ملک دل

سے علم و فن کے کامل اور شعر و ادب کے ماہر اسی راستہ سے آکر ہندوستان کے جس پہلے
شہر میں داخل ہوتے تھے وہ ملتان تھا، چنانچہ سلطان ناصر الدین قباچہ
کے زمانہ تک جو سلطان التمش کا معاصر و حریف تھا، ملتان ہی اسلامی علوم و فنون
کا مرکز اور اسلامی تعلیم کی درسگاہ تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ مرکز تعلیم ملتان سے
لاہور کو اور پھر لاہور سے دہلی کو منتقل ہو گیا۔

اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے
پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی اور ملتانی ہے، پھر
پنجابی، اور بعد ازاں دہلوی۔ سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں
ہے، چنانچہ ہماری اردو کی طرح سندھی بھی عربی و فارسی الفاظ سے اسی طرح گرانبار ہے
اور سب سے عجیب یہ کہ اس کا رسم الخط آج تک ٹھیٹھ عربی نسخ ہے، اور عربی کے
بہت سے ثقیل الفاظ مستعمل ہیں۔ مثلاً پہاڑ کو جبل اور پیاز کو بصل کہتے ہیں۔

سندھی ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی جلتی ہیں۔ تینوں میں بہت الفاظ
کا اشتراک ہے، تینوں میں عربی و فارسی کا میل ہے۔ صیغوں کے طریق میں تھوڑا تھوڑا فرق
ہے۔ یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضروری ہے جس کے رو سے عام طور سے یہ سمجھا
جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ
موجودہ اردو انہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے۔ یعنی جس کو
ہم اردو کہتے ہیں اس کا آغاز انہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا
اور آگے چل کر دار السلطنت دہلی کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری
زبان بن گئی۔ اور یہی دار السلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیلی

گئی، علامہ بیرونی المتوفی ۴۴۲ھ جس نے ہندوستان میں شاید ملتان اور سندھ میں رہ کر کتاب الہند کا مسالہ جمع کیا ہے، اس نے اپنی اس کتاب میں جس لہجہ اور طرز ادا میں ہندی الفاظ لکھے ہیں۔ ان سے ماہرین ادب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ملتانی اور سندھی شکل میں ہیں۔

غزنوی دور میں

بہر حال اب وہ زمانہ ہے جب غزنین میں آل سبکتگین کی حکومت قائم ہے اور سبکتگین اور اس کا نامور فرزند ہندوستان پر پے در پے حملے کرتے ہیں۔ ان حملہ آوروں کی مادری زبان ترکی مگر علمی و ادبی و سرکاری زبان فارسی تھی، سلطان محمود غزنوی المتوفی ۴۲۱ھ نے گو گجرات تک دھاوا کیا، مگر اس کی سلطنت بالآخر پنجاب و سندھ میں سمٹ کر رہ گئی، جہاں تقریباً ڈیڑھ سو برس تک وہ قائم رہی، اس میل جول کا اثر یہ ہوا کہ ترکستان، ایران اور کابل کے ہزاروں لاکھوں آدمی ہندوستان آکر بس گئے اور ہزاروں ہندوستانی ان ملکوں میں جا پہنچے، اور ہندی غلاموں اور کنیزوں کی گھر گھر فراوانی ہوئی، غزنویوں کی فوج میں ابتدا سے ہندو افسر و سپاہی نوکر تھے اور وہ حدود سلطنت میں موقع بموقع بھیجے جاتے تھے۔

سلطان محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم تلک نام ایک ہندو تھا جس کی تعلیم و تربیت کشمیر میں ہوئی تھی اور اصفہان جاکر اس نے فارسی سیکھی تھی، سلطان مسعود کے زمانہ میں جو ۴۲۱ھ میں تخت پر بیٹھا تھا، اس عہدہ پر ایک ہندو بیربل نام سرفراز تھا، سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے ادبا رہتے تھے، فضلائے ہند بھی ان کے پہلو بہ پہلو تھے، کالنجر کے راجہ انند نے ۴۱۳ھ میں ہندی میں بادشاہ

۱؎ علاوہ تاریخوں کے دیکھو قابوس نامہ "پند و چہ دیہان"

کہہ لیے مدحیہ شعر لکھے ۔

"ابیات بزبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد، سلطان آں را بفضلائے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ ہمگی تحسین و آفریں کردند" (فرشتہ)

اس اختلاط اور میل جول کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ اہل ولایت کی زبانوں پر ہندی الفاظ اور ہندوؤں کی زبانوں پر فارسی الفاظ چڑھ گئے، چنانچہ یہی سبب ہے کہ غزنوی عہد کے بعض اُن شعراء کی زبانوں سے بھی ہندی الفاظ ادا ہوئے ہیں جنھوں نے ہندوستان کا منہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حکیم سنائی غزنوی (سنہ ۵۴۵ھ یا سنہ ۵۲۵ھ) جو بہرام شاہ غزنوی کے معاصر تھا اپنے ایک قصیدہ میں زبانوں کے اختلاف کو ظاہر کر کے فرماتے ہیں۔[1]

تو بلے مرگ اگر بہ جائے زبانی ز تنگ نعمتہائے اپنی و آنی
اسامی دنبل ہمہ ہم اسپ از بنہ ناش چہ آبہ وچہ نان وچہ میخ چہ پانی

عہد غزنوی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان جو خاص لاہور میں پیدا ہوا تھا اُسکی نسبت عوفی اور امیر خسرو نے لکھا ہے کہ وہ عربی و فارسی کے علاوہ ہندی کا بھی شاعر تھا اور اس زبان میں اپنا ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا۔ اس کے دیوان میں ایک شعر کا دوسرا مصرع ہے۔

بر آمد از پس دیوار حصن مارا مار[2]

ان شعروں میں پانی اور مارا مار اور شاید دوسرے ہندی لفظ ہیں[3] جو اہل ولایت کی زبانوں پر چڑھ گئے تھے۔ اب ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں نیا دور شروع ہوا۔

---

[1] دیوان سنائی بمبئی صفحہ ۹ ۔ [2] بحوالہ پنجاب میں اردو ۔ [3] لفظ بیا فارسی لغات میں کم ملتا ہے۔ برہان قاطع میں ہے مگر خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندی ہے کیونکہ یہاں شاعر نے آب اور پانی کو جس طرح مقابل استعمال کیا ہے ویسے ہی نان اور ... کو بالمقابل شاید رکھا ہے بطور لف و نشر غیر مرتب

جنھوں نے بہت جلد لاہور اور ملتان سے آگے بڑھ کر اصل ہندوستان پر قبضہ کیا اور دلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اب اس مشترکہ زبان کا قدم اور آگے بڑھا، انکی حکومت پشاور سے گجرات اور بنگال تک قائم ہوگئی، اور اس پورے ملک میں جہاں کہیں کہیں بدل چال کی ایک زبان تھی ایک مشترک زبانِ ہند کا ہیولیٰ تیار ہوگیا، قاضی سراج منہاج جو ۶۲۴ھ میں سندھ اور ملتان کی راہ سے ہندوستان آئے تھے، اپنی تاریخ میں کوچ بہار اور اس کے قریب نواح کے فتوحات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"و ایں را اندر زبان دیگر است میان لغت ہند و تبت" (صفحہ ۱۵۲ کلکتہ)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کی ایک زبان پنجاب سے لے کر بنگال تک پیدا ہو چلی تھی، جس کے برخلاف وہاں کی زبان ہندوستانی زبان اور تبت کی زبان کے بیچ میں تھی۔

یہیں خلیج فارس اور بحرِ ہند کے ذکر میں وہ لکھتے ہیں:-

"آب بگمتی گویند چوں بدریائے ہندوستان درآید او را بلغت ہندوی سمندر گویند"

(صفحہ ۱۵۲ طبقات ناصری سراج منہاج کلکتہ)

دلی کے سب سے پہلے سلطان قطب الدین ایبک کو رعایا نے اس کے جود و کرم کے صلہ میں "لکھ بخش" کا خطاب دیا تھا، (فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۳) یعنی "لاکھوں کا دینے والا" اس کے زمانہ کی تعریف میں اہل ہند "کال قطب الدین" کہتے تھے، "دکال زمانہ را گویند" (فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۳ نول کشور) اس عہد کے سکوں پر بادشاہ کے نام کے ساتھ "شری امیرا" لکھا ملتا ہے شری کا لفظ آج بھی ہندوؤں میں شری مہراج کی ترکیب میں مستعمل ہے، مگر اس وقت کی اس ترکیب "شری امیر" پر ذرا غور کیجیے۔

ملتان سے دہلی شمس الدین التمش نے اپنے خواجہ تاش، لیکن حریف ناصر الدین قباچہ کو ۶۲۵ھ میں شکست دے کر ملتان اور سندھ کو بھی دہلی سے ملا لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اطراف کے بہت سے تاجر اور سوداگر دہلی آ گئے، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ "ملتانیاں" کا لفظ اس زمانہ میں "سوداگران پارچہ" کے ہم معنی ہو گیا تھا[1]۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اب ملتان اور لاہور اور دہلی کی مشترکہ عادات اس متحدہ زبان کے بنانے میں شامل ہو گئی تھیں، اس کی سند میں ایک بزرگ ہستی کا نام لینا ہے جن کی پیدائش اور تعلیم و تربیت تو ملتان اور سندھ میں ہوئی، مگر روحانی اکتساب فیض دہلی میں فرمایا اور آخر سکونت اور دائمی آسودگی لاہور کی مملکت میں اختیار فرمائی یعنی حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ۔

ہندوستان کے روحانی فاتح جن لوگوں کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ یہاں کی روحانی تاریخ کے مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ یہ تسلیم کریں گے کہ ہندوستان غزنی اور غور کے سلاطین ملکی فتوحات کے لیے جہاں جہاں بڑھتے گئے ان سے پہلے یہ روحانی سلاطین اپنی روحانی فتوحات کے لئے آگے بڑھتے جاتے تھے، اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک کو غزنی اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا ہے تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خانوادہ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا، یہ ایک خود مستقل موضوع ہے اور کبھی فرصت سے یہ بڑی داستان بھی سننے کے لائق ہے۔

یہ روحانی فاتح عوام سے ملتے ہیں ہندوستان میں کسی ایک متحدہ زبان کی ضرورت جتنی

---

[1] دیکھو تاریخ فیروز شاہی۔

سلطنت کو محسوس ہوتی تھی، اس سے کہیں زیادہ عوام کو اور اُن سے زیادہ صوفیوں کو جو ہر بولی کے انسانوں تک پہنچنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اب تک اُردو کی تاریخ میں اکبر اور شاہجہاں اور ان کے مینا بازار اور اُردوئے معلّٰی کو اہمیت دی گئی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان سے کہیں زیادہ اہمیت صوفیہ کو حاصل ہے، جن کو ہندوستان کے عوام کی زبان کو اختیار کرنے میں نہ سلطنت کے رعب داب کا خیال مانع آسکتا تھا، اور نہ علم ظاہر کے جبہ و دستار کے وقار کا، بلکہ عوام کی اصلاح اور حق کی تبلیغ کی خاطر ان کو ہندوستان کے عوام کی دیسی زبان کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہ تھا، ٹھیک جس طرح مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کے عوام کی زبان کو بودھ نے اپنے دھرم کے پرچار کے خاطر اختیار کیا، اور اسی میں اپنا اُپدیش دیا، اور جس طرح مسلمانوں کے بعد عیسائی پادریوں اور مشنریوں نے یہاں کے عوام کی بولیوں کو بے تامل استعمال کیا، اسی طرح ان صوفیہ نے اس وقت کے عوام کی دیسی زبان کے چلنے میں سرپرستی کی۔

حضرات صوفیہ اور نئی زبان

اس وقت تک اُردو کے جتنے قدیم نقوش مل سکتے ہیں وہ عموماً صوفیوں کے ملفوظات ہیں، اور اُردو کی پرانی تصنیفیں خواہ دکھنی ہوں یا گجراتی، وہ سب صوفیوں کی لکھی ہیں، جس طرح ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے کچھ پہلے دہلی کے علم و عرفان کے مشہور خاندان نے وقت کی اُردو زبان کو جس کو اس وقت ہندی زبان کہتے تھے اپنے اصلاحی رسالوں اور تفسیر قرآن و احادیث کے ترجموں کے لئے فارسی کے بجائے پسند کیا، اور عوام تک پہنچنے کی خاطر اُردو ہی کو جس میں اس وقت تک شمالی ہند میں لکھنا پڑھنا عیب سمجھا جاتا تھا، بے تکلف قبول کیا، اور اصلاح دین اور ردِّ بدعات کا بڑا ذخیرہ اُردو میں

جمع کر دیا جس نے رفتہ رفتہ اہلِ علم سے اس نئی زبان میں لکھنے پڑھنے کا حجاب اٹھا دیا۔

خواجہ فرید گنج شکر ملتانی

خانوادۂ چشت کے فردِ فرید شکرستانِ معرفت کے مشہور گنج شکر سے کون واقف نہیں، حضرت خواجہ فرید گنج شکر کا خاندان اگر کابل کا تھا۔ مگر شہاب الدین غوری کے زمانہ میں ملتان آکر بس گیا تھا، اور خواجہ کی ولادت یہیں قصبہ کھتوال مضافات ملتان میں سنہ ۵۶۹ھ میں ہوئی۔ خواجہ کا نشو و نما اور اُن کی تعلیم و تربیت ملتان میں ہوئی۔ اٹھارہ برس کی عمر تھی ملتان کے مدرسہ میں مولانا منہاج الدین ترمذی سے فقہ میں کتاب نافع کا درس لے رہے تھے، کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا گزر ہوا، اور ایک ہی نظر کیمیا اثر نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، پھر جانی ملتان سے چل کر قندھار اور دوسرے ممالک سے اخذِ فیض کے بعد پھر اپنے وطن واپس آئے، اور اپنے پیر کے حضور میں دلی آئے، اور یہاں سے پنجاب کے شہر اجودھن میں اقامت اختیار کی، اور وہیں سنہ ۶۶۴ھ میں آسودۂ خاک ہوئے۔

اس وقت تک اس زبان کی ابتدائی تاریخ کا جہاں تک پتہ لگ سکا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیریں زبان جن کے منہ سے مصری کی یہ ڈلیاں پہلے نکلیں خواجہ فرید گنج شکر ہیں، چنانچہ ملفوظات اور تصوف کی کتابوں میں موصوف کے چند فقرے ملتے ہیں۔

۱۔ پہلا فقرہ وہ مکالمہ ہے جو حضرت خواجہ اور ان کے مرید شیخ جمال الدین ہانسوی کی بیوہ کے درمیان ہوا، خواجہ نے شیخ جمال الدین کے خورد سال بچہ برہان الدین کو اُن کے باپ کی وفات کے بعد اپنے حلقۂ بیعت میں لے لیا۔ اس پر ان کی والدہ نے کہا "خوجا برہان الدین بالا ہے"۔ خواجہ نے فرمایا "پونوں کا چاند بالا"

ہوتا ہے۔[1] یہ بالا وہی لفظ ہے جو لڑکے بالے اور بچہ بالا کے ساتھ آج بھی بولا جاتا ہے۔

اب تک صوفیانہ ذکر اور مراقبہ میں عربی یا فارسی کے فقرے استعمال ہوتے تھے۔ خواجہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ان کو ہندوستانی زبان میں ادا فرمایا۔ ہمارے کتب خانہ میں اوراد و تصوف کی دو قلمی کتابیں ہیں جن میں حضرت کے یہ فقرے مذکور ہیں۔ فرمایا[2]

۱۔ دو در راستا بگوئی "اوہی ہی" و در چپا بگوئی "یہی ہی" در دل بگوئی "ایہی ہی"

دیگر بزبان ہندی:

۲۔ در راستا "ہمہ توں" در چپا "ہی توں" و در دل "ہمہ توں"

۳۔ دیگر گوید از طرف دل "ہوں توں" و طرفِ آسمان "توں ہوں" "توں ہوں" کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ یہ عربی فقرہ "انا انت" کا ترجمہ ہے۔

تصوف کے اذکار کے ایک اور رسالہ میں جس کا نام "جواہر خمسہ" ہے اور جس کا ۹۵۶ھ کا لکھا ہوا نسخہ کتب خانہ دار المصنفین میں ہے یہ مذکور ہے۔[3]

بعد کی حضرت قطب الاقطاب حضرت شیخ فرید شکر گنج قدس سرہٗ ذکر بزبان ہندی وضع فرمودہ اند و در عمل آوردہ اند، در باب وی اندر اہو بنہ توں اہو نہہ توں ایہیں توں سوئے آسمان نگریستہ بزبان گوید اہو نہہ توں ..... باز روئے سوی زمین کردہ بہمان طریق ایں بزبان گوید اہو نہہ توں ... بعد نظر بار بزانو در بر خود گمارد و بیا بے سکوت یا نفتہ کرت، ایہیں توں۔

شیخ اپنے ایک دوست کو "بجھیا" کہا کرتے تھے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ ذہن کا مقام

---

[1] سیر الاولیاء بحوالہ پنجاب میں اردو۔ [2] رسالہ شیخ بہاؤ الدین بن ابراہیم عطاء اللہ قادری قلمی دار المصنفین۔ [3] تاریخ اردوئے قدیم بحوالہ اسرار الاولیاء صفحہ ۳۔

کہاں ہے تو فرمایا "پیچ شر کے"۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بابا فرید اپنی آنکھوں پہ پٹی باندھے تھے، ان کے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سبب پوچھا تو بابا نے ہندی زبان میں جواب دیا۔ "آنکھ آئی ہے" شیخ نے فرمایا اگر آئی ہے "چرا بستہ اید"۔

سرسہ کے مقام پر بابا فرید ایک بزرگ کے مزار پہ جایا کرتے تھے، کچھ لوگ ان کے راستہ میں چھپ کر بیٹھ گئے، جب آپ کو معلوم ہوا تو ناخوش ہوئے اور ہندی میں فرمایا "سرسہ کبھی سرسہ کبھی نرسہ"

ہمارے وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) میں اردو کا ایک کتب خانہ ہے اس میں چند پریشان اوراق کا ایک پرانا مجموعہ ہے جس میں کسی صاحب نے حضرت بابا فرید کے کچھ فارسی اقوال لکھے ہیں۔ اور ساتھ ہی ذیل کی ایک نظم بھی ہے۔

وقت سحر وقت مناجات ہے	خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا	خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
باتن خود ہمدم و ہشیار باش	صحبت اغیار بری بات ہے
باتن تنہا چہ روی زیں زمیں	نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج بدل وجاں شنو	ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

اس نظم کو اردو کے ایک مشہور مؤلف نے حضرت شکر گنج کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ میرے خیال میں یہ حضرت کے فارسی اقوال کے جامع کی نظم ہے، نہ کہ خود حضرت کی ہے، ان کے شعر میں شکر گنج کے توصیفی لقب کو تخلص سمجھنا تعجب انگیز ہے۔ ظاہر ہے

لہ ایضاً، بحوالہ جواہر فریدی صفحہ ۲۰۸ ۲ه پنجاب میں اردو، بحوالہ جواہر فریدی۔

کہ خود حضرت اپنے آپ کو شکر گنج نہیں کہتے تھے، اتنا صحیح ہے کہ حضرت کی زبان مبارک سے بعض ہندی دوہرے ادا ہوئے ہیں، جن میں سب سے مقدم اور مستند وہ ہے جو میر خورد دہلوی نے سیر الاولیاء میں نقل کیا ہے۔

"این دوہرہ کہ بزبان مبارک حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین گذشتہ است مناسب این معنی است":

گنت مہوتین کارڑی ناکان ست منلسے
بس کندے مدھن گرہو رین لہائشے،

بہرحال اس نظم سے قطع نظر کرکے اوپر کے فقروں میں "کا" اور "کے" اضافت کی علامت "ہوتا ہے" اور "آئی ہے" فعل اور "بول" "توں" اور "ہی" بہی ضمیر اور "اپنی" اور "ہوان" ظرف اور "ہالا" "چاند" "نکھ" "بھیا" اسماء اس میں موجود ہیں۔

حضرت نظام الدین دہلوی: خواجہ فرید شکر گنج کے مرید حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء المتوفی ۷۲۵ھ کے ملفوظات فوائد الفواد ہیں جس میں ۷۰۷ھ سے ۷۲۲ھ تک کے ملفوظات امیر خسرو کے دوست امیر حسن دہلوی نے جمع کئے ہیں جسب ذیل ہندوی الفاظ آپ کی زبان مبارک سے بے تکلف ادا ہوئے ہیں، پیانہ (صفحہ ۹) لنگوٹہ (صفحہ ۹) کھٹ (یعنی کھاٹ صفحہ ۵) کندوری (صفحہ ۵۵) پچھیہ (صفحہ ۶۸) لنگھن (فاقہ ۸۶) دھاڑی (یعنی ڈاکو صفحہ ۱۲۸) لت (صفحہ ۲۴۳) حضرت سلطان الاولیاء کی زبان سے یہ شعر ادا ہوا ہے۔

لنگھنت گر کند ترا فربہ سیر خوردن ترا ز لنگھن بہ

سیر الاولیاء ص ۳۸۴، فوائد الفواد صفحہ ۸۶، یہ شعر حکیم سنائی کی حدیقہ صفحہ ۵۶۸ طبع لکھنؤ میں بھی ہے

حضرت سلطان الاولیاء نے شیخ احمد نہروالی کے ذکر میں فرمایا کہ شیخ احمد بہت خوش آواز تھے "ہندوی بہا خوش گفتہ" (ہندوی ہمی گفت) یعنی ہندی گایا کرتے تھے جامع مسجد اجمیر کے امام و فقیہ مادھو (ذرا ایک ہندی عالم کے اس عالمانہ نام پر نظر رہے) نے ایک دفعہ اُن کا ہندی گانا سنکر فرمایا "چنیں آوازے کہ تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندی خرچ کنی" شیخ احمد نے اسی وقت سے قرآن یاد کرنا شروع کردیا (صفحہ ۴۷ مطبع اودھ اخبار)

شیخ نصیر الدین اودھی

شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی (المتوفی ۷۵۷ھ) نے جب اپنے ایک ساتھی شیخ اخی سراج کو بنگالہ رخصت کیا تو انھوں نے عرض کی کہ اس مملکت پر تو شیخ علاؤالدین قبل سرفراز ہیں فرمایا "تم اوپر تل تھے"

خواجہ بندہ نواز دکنی

شیخ نصیر الدین دہلوی کے دوسرے ممتاز مرید حضرت خواجہ بندہ نواز ہیں جو ۸۰۱ھ میں دہلی سے بہمنیوں کی سلطنت گلبرگہ میں آگئے، اور یہیں ۸۲۵ھ میں وفات پائی، اُن کا ایک فقرہ اُن کے ایک مرید نے یہ نقل کیا ہے "لکھوکوں موتے سوں خدا کچھ اپڑتا ہے تم کوں اپڑنے کی استعداد ہوتی ہے" اُن کا پورا ہندی رسالہ معراج العاشقین چھپ چکا ہے،

ان بزرگوں کے ان مسلسل فقروں کو سنکر اب اس میں شک کی کیا گنجائش رہتی ہے کہ اس زبان کی عمر جتنی سمجھی جاتی ہے، اس سے کہیں زیادہ ہے، یہ حقیقت میں ہندوستان ہی کی زبان تھی جس کو ان بزرگوں نے قبولیت کی نظر سے دیکھا اور محبت کی شان میں گھولا

---

[1] تاریخ فرشتہ ج۲ صفحہ ۴۰۰ نولکشور۔ [2] تاریخ زبان اردو نسخہ قدیم نولکشور صفحہ ۳۲ بحوالہ عشق نامہ عبداللہ بن عبدالرحمن چشتی۔

خلجی اور تغلق دور میں

یہ خلجی اور تغلق سلاطین کا دور ہے، ان بادشاہوں کے زمانہ کی دو یادگار تاریخیں ہمارے سامنے ہیں، تاریخ فیروز شاہی ضیائے برنی، اور تاریخ فیروز شاہی سراج عفیف، ان دونوں تاریخوں میں جن میں سے پہلی دہلی میں چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں اور دوسری ساتویں صدی کے بیچ میں تصنیف ہوئی ہے، بہت سے ہندی الفاظ اور مصطلحات ملتے ہیں اور جو آج تک اس مشترکہ ہندوستانی زبان کا سرمایہ ہیں۔

بجرہ لکھ (لاکھ) کہار (صفحہ ۸۶) ٹھگ (۱۸۹) لونڈی (صفحہ ۱۹۲) ٹیکہ، ہندوان (صفحہ ۲۲) منڈ (صفحہ ۲۱۶) گھٹی صفحہ ۲۲۰ بی پٹواریان (صفحہ ۲۸۸) ڈھولک (صفحہ ۳۴۵) چبوترہ (صفحہ ۳۲۲) مٹھ (صفحہ ۳۴۳) لبوہ، چرائی، ڈیہہ، قصبات (صفحہ ۲۸۸) منڈہ، منڈی غلہ (صفحہ ۳۴۴) اٹش، موٹھ (صفحہ ۳۵۰) سٹی (صفحہ ۳۰۴) مہین (صفحہ ۳۱۰) ریوڑی (صفحہ ۳۱۶) تھانہ (صفحہ ۳۳۰) دھاوگان (جمع فارسی دھاوا بمعنی ڈاک دوڑیہ (صفحہ ۱۳۳) موڑہ (مونڈھا، صفحہ ۲۷۳) چودھری (صفحہ ۲۸۸) بی بی (صفحہ ۳۷۳) بھٹی (صفحہ ۳۰۶) تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی) بی بی (صفحہ ۲۹) لک (لاکھ صفحہ ۸۴) لکھ رکی (ربع لاکھ صفحہ ۲۳۱) چونہ پز (چونہ پکانے والا) راج (معمار) سونہار (سونار، صفحہ ۳۴۳) بھٹر بھیتر (صفحہ ۱۰۸) کنگرہ کرڑہ ہر (صفحہ ۱۷۰) چودھریان (صفحہ ۳۷) لت لات (صفحہ ۳۴۷) بھرلر (صفحہ ۳۹۳) ھتریان (صفحہ ۳۴۳) ھٹریال خانہ (صفحہ [illegible]) درخت سنبل (صفحہ ۳۱۱) پیوند (صفحہ ۳۱۰) (سراج عفیف)

تاتار خان اعظم نے عورتوں کی پردہ سواری کے لئے گرو نہار است کہ نامیدہ بود کہ از زبان ہندی ٹھپ کر "گو بندیہ" (۲۹۳ سراج عفیف) محمد تغلق کی زبان سے ایک دفعہ

ایک بیدیؔ کا فقرہ نکلتا ہے، مولانا عماد بر سرِ دربار اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ "مُوز" (اخبار الاخیار صفحہ ۱۰۸) فیروز شاہ کے عہد میں سکندر حاکم بنگال ایک افسر ملک قبول سے پوچھتا ہے "چہ نام داری" ملک قبول بزبانِ ہندی گفت "تورا بانہ" اب اس کو "تورا بندھو" سمجھئے یا "تورا بندہ" (شمس سراج عفیف صفحہ ۱۶۰)

سلطان محمد تغلق نے جب سندھ کے حملہ میں جان دی اور سلطان فیروز شاہ نے ناکام حملہ کے بعد سندھ چھوڑ کر گجرات کا رُخ کیا تو سندھیوں نے کہا:

"بو برکت شیخ پٹھا، ایک موا ایک نٹھا" (شمس سراج عفیف صفحہ ۲۲۱)

امیر خسرو کا عہد اب وہ زمانہ ہے جب کل ہندوستان ایک دہلی کے عَلَم کے نیچے جمع ہو گیا تھا، اور ہندوستان کے اندر ایک متحدہ زبان کا پیکر تیار تھا، جس نے عوام کے بازاروں سے اہلِ علم کے حلقوں تک رسائی حاصل کر لی اور امیر خسرو المتوفی ۷۲۵ھ جیسے ہمہ گیر سلطانِ ادب نے اس کی سرپرستی کی اور اس کو عربی و فارسی منظومات کے پہلو بہ پہلو جگہ دی، امیر کی فارسی مثنویوں اور تاریخی تصنیفوں میں بے شمار ہندی الفاظ استعمال پائے ہیں، ان کی ہندی نظمیں جو پہیلیوں اور مکرنیوں کی صورت میں ہیں بہت مشہور ہیں، گو اس وقت ہمارے پاس اُن کی ان ہندی منظومات کا کوئی مستند حصّہ نہیں ہے تاہم انھوں نے اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ میں جو طویل فارسی نثر لکھی اس میں اپنی ہندی نظم پر خود فخر کیا ہے، فرماتے ہیں:

بیش ازیں پادشاہانِ سخن کسے را سہ دیوان نہ بود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلامم، مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اما آں سہ دیوان او عبارت است از عربی و فارسی و ہندوی، اما در پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نہ کردہ جز من کہ دریں کار قسام

عادلم ۔ ع ۔ قسمت چو چنیں بود چہ تدبیر کنم[1]

امیر خسرو کی اس عبارت کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے بھی مسعود سعد کی طرح عربی و فارسی اور ہندی کے تین الگ الگ دیوان تیار کئے تھے بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسعود سعد نے تینوں زبان میں الگ الگ تین مستقل دیوان تیار کئے تھے، اور میں نے ایک زبان فارسی میں ہندی اور عربی کو ملا کر ایک "سخن" کا سراپا تیار کیا۔

امیر کو اپنے ہندی کلام پر جو ناز تھا وہ ان کے اس شعر سے نمایاں ہے جس کو انھوں نے اپنی اسی کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے۔

چو من طوطی ہندم ار راست پرسی ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

اسی خاتمہ میں ابہام کی ایک نئی صنعت پیدا کرنے پر فخر کیا ہے۔

"بار ایہامے دیگر بربست کردہ ام کہ یک طرف ہمہ ہندوی خیزد افتد، و جانبِ دیگر پارسی می خیزد۔"

آہی آئی ہماں پیاری آہی ماری ماری بر آئی موری ماہی[2]

امیر نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی ایک فضیلت یہ بیان کی ہے کہ یہاں کے لوگ ہر ملک کی زبان بول سکتے ہیں، مگر بیرونی لوگ یہاں کی زبان نہیں بول سکتے، کہتے ہیں ؎

ہست دوم آنکہ ز ہند آدمیاں جملہ بگویند زبان ہا بہ بیان

لیک از افاضلِ دگر ہر کسے گفت نیارد سخنِ ہندیے

ہست خطا و مغل و ترک و عرب در سخنِ ہندوی ما دوختہ لب

---

[1] خاتمہ غرۃ الکمال امیر خسرو قلمی دار المصنفین۔ [2] اس شعر کو میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔

غرض ہر جگہ وہ اپنی زبان کو ہندوی کہتے ہیں۔ اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندوی زبان اس وقت کے ہندوستان کے بول چال میں تھی۔

شیخ شرف الدین منیری بہاری

حضرت شیخ شرف الدین احمد منیری (المتوفی ۷۸۲ھ) جن کا وطن اور مسکن بہار ہے اور تعلیم و تربیت بنگال میں پائی تھی اور بیعت دلی جا کر حاصل کی تھی، ان کے بہت سے ہندوی دوہے ہیں، جن میں بعض بیماریوں کی مجرب دوائیں بتائی گئی ہیں مثلاً

لودھ پھٹکری مردا سنگ ہلدی زیرا ایک ایک ٹنگ

افیون چنہ بھر مرچیں چار اردھ پھر تھوتھا اس میں ڈار

پوسٹ کے پانی پوٹلی کرے نینا پیرا پل میں ہرے

(شفاء الامراض حکیم محمدی دہلوی مرحوم قلمی دیسنہ)

حضرت شیخ کے ملفوظات کا مجموعہ معدن المعانی کے نام سے اُن کی زندگی ہی میں زین بدر عربی نے فارسی میں لکھ کر نذر گذرانی تھی، اس میں ایک موقع پر اُردو کے دو فقرے استعمال ہوئے ہیں، خواجہ جلال الدین حافظ ملتانی نے عرض کی۔

بزبان ہندوی نیکو گفتہ "است ہر کہ گفتہ است" باٹ بھلی پر سانہ کرے"

حضرت شیخ نے اس کی تائید میں فرمایا۔

بعد ازاں بندگی مخدوم عظم اللہ بزبان مبارک راند" دیر بھلا پہ دور" (معدن المعانی مطبوعہ شرف الاخبار بہار ۱۳۰۱ھ ۱۸۸۴ء جلد اول صفحہ ۲۰۳)

۱؎ نومبر ۱۹۲۶ء کے اورنٹیل کالج میگزین میں امیر خسرو کی مختلف تصانیف سے ہندوستانی الفاظ تلاش کر کے لکھے گئے ہیں ۲؎ ان اشعار کو آزاد نے آب حیات میں امیر خسرو کی طرف منسوب کیا ہے۔

ہوتا ہے[1]۔ یہ بالا وہی لفظ ہے جو لڑکے بالے اور بچہ بالا کے ساتھ آج بھی بولا جاتا ہے۔

اب تک صوفیانہ ذکر اور مراقبہ میں عربی یا فارسی کے فقرے استعمال ہوتے تھے۔

خواجہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ان کو ہندوستانی زبان میں ادا فرمایا، ہمارے کتبخانہ

میں اوراد و تصوف کی دو قلمی کتابیں ہیں جن میں حضرت سے یہ فقرے مذکور ہیں، فرمایا[2]

۱۔ سور راستا بگوئی "اوہی ہی" و در چپا بگوئی "یہی ہی" و در دل بگوئی "ایہی ہی"

دیگر بزبان ہندی:

۲۔ ور راستا "ہمہ توں" و در چپا "ہی توں" و در دل "ہمہ توں"

۳۔ دیگر گو بیداز طرفِ دل "ہوں توں" دطرفِ آسمان "توں ہوں" "توں ہوں" کی

نسبت یہ کہا گیا ہے کہ یہ عربی فقرہ انا انت کا ترجمہ ہے۔

تصوف کے اذکار کے ایک اور رسالہ میں جس کا نام "جواہر خمسہ" ہے اور جس کا

۹۹۰ھ کا لکھا ہوا نسخہ کتب خانہ دار المصنفین میں ہے یہ مذکور ہے:

> یعنی کی حضرت قطب الاقطاب حضرت شیخ فرید شکر گنج قدس سرہٗ ذکر بزبان ہندی وضع
>
> فرمودہ اند بعمل آوردہ اند، درباب دین اندا ایہو نہ توں، اہو نہ توں، ایہنیں توں
>
> سوئے آسمان نگریستہ بزبان گویند اہو نہہ توں ...... بازروئے سوی زمین
>
> کردہ بہمان طریق ایں بزبان گویند اہو نہہ توں ... بعد نظر بار بار دور بر خود
>
> گمارد و بیاید بے سکوت بایستہ کرت، ایہنیں توں۔

شیخ اپنے ایک دوست کو "بھیا" کہا کرتے تھے[3]۔ آپ سے پوچھا گیا کہ ذہن کا مقام

---

[1] سیر الاولیاء بحوالہ پنجاب میں اردو۔ [2] رسالہ شیخ بہاؤ الدین بن ابراہیم عطاء القادری قلمی دار المصنفین۔ [3] تاریخ اردوئے قدیم بحوالہ اسرار الاولیاء صفحہ ۳۰۔

کہاں ہے تو فرمایا "بیچ شہر کے"[1]

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بابا فرید اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے تھے، ان کے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح نے سبب پوچھا تو بابا نے ہندی زبان میں جواب دیا۔ "آنکھ آئی ہے" شیخ نے فرمایا اگر آئی ہے "چرا لبستہ اید"۔

سرسہ کے مقام پر بابا فرید ایک بزرگ کے مزار پر جایا کرتے تھے، کچھ لوگ ان کے راستہ میں چھپ کر بیٹھ گئے، جب آپ کو معلوم ہوا تو ناخوش ہوئے۔ اور ہندی میں فرمایا "سرسہ کبھی سرسہ کبھی نرسہ"[2]

ہمارے وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) میں اردو کا ایک کتب خانہ ہے اس میں چند پریشان اوراق کا ایک پرانا مجموعہ ہے جس میں کسی صاحب نے حضرت بابا فرید کے کچھ فارسی اقوال لکھے ہیں۔ اور ساتھ ہی ذیل کی ایک نظم بھی ہے۔

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے	خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا	خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
بادم خود ہمدم و ہشیار باش	صحبت اغیار بوری بات ہے
باتن تنہا چو روی زیر زمیں	نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج بدل و جاں شنو	ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

اس نظم کو اردو کے ایک مشہور مؤلف نے حضرت شکر گنج کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ میرے خیال میں یہ حضرت کے فارسی اقوال کے جامع کی نظم ہے، نہ کہ خود حضرت کی ہے، اخیر شعر میں شکر گنج کے توصیفی لقب کو تخلص سمجھنا تعجب انگیز ہے ظاہر ہے

[1] ایضاً بحوالہ جواہر فریدی صفحہ ۲۰۸ [2] پنجاب میں اردو، بحوالہ جواہر فریدی۔

کہ خود حضرت اپنے آپ کو شکر گنج نہیں کہتے تھے، اتنا صحیح ہے کہ حضرت کی زبان مبارک سے بعض ہندی دوہرے ادا ہوئے ہیں، جن میں سب سے مقدم اور مستند وہ ہے جو میر خورد دہلوی نے سیر الاولیاء میں نقل کیا ہے۔

"ایں دوہرہ کہ بر زبان مبارک حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین گذشتہ است مناسب ایں معنی است":

کنت مہو تین کاری ناکان ست منائے
بس کندے دھن گرہو رین لہاشئے،

بہر حال اس نظم سے قطع نظر کر کے اوپر کے فقروں میں "کا" اور "کے" اضافت کی علامت "ہوتا ہے" اور "آئی ہے" فعل اور "ہوں" "توں" "اوہی" یہی ضمیر اور "ایہی" اور "ہواں" ظرف اور "ہالا" "چاند" "آنکھ" "بھیا" اسماء اس میں موجود ہیں۔

حضرت نظام الدین دہلوی	خواجہ فرید شکر گنج کے مرید حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء المتوفی ۷۲۵ھ کے ملفوظات فوائد الفواد میں جس میں ۷۰۷ھ

سے ۷۲۲ھ تک کے ملفوظات امیر خسرو کے دوست امیر حسن دہلوی نے جمع کئے ہیں حسب ذیل ہندوی الفاظ انکی زبان مبارک سے بے تکلف ادا ہوئے ہیں، بیانہ (صفحہ ۹) لنگوٹہ (صفحہ ۹) کھٹ (یعنی کھاٹ صفحہ ۵) کندوری (صفحہ ۵) ٹکیہ (صفحہ ۶۸) ننگھن (فاقہ ۸۶) دھاڑی (یعنی ڈاکو صفحہ ۲۸) لت (صفحہ ۶۳) حضرت سلطان الاولیاء کی زبان سے یہ شعر ادا ہوا ہے۔

ننگھت گر کند ترا فربہ — سیر خوردن ترا ز ننگھن بہ

سیر الاولیاص ۳۹۴ م کہ فوائد الفواد صفحہ ۶۸ یہ شعر حکیم سنائی کی حدیقہ صفحہ ۶۶۸ طبع لکھنؤ میں بھی ہے

حضرت سلطان الاولیاء نے شیخ احمد نہروالی کے ذکر میں فرمایا کہ شیخ احمد بہت خوش آواز تھے، "ہندوی با خوش گفتے" و ہندوی می گفت" یعنی ہندی گایا کرتے تھے[۱] جامع مسجد اجمیر کے امام و فقیہ مادھو (ذرا ایک ہندی عالم کے اس عالمانہ نام پر نظر رہے) نے ایک دفعہ اُن کا ہندی گانا سنکر فرمایا "چنیں آوازے کہ تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندی خرچ کنی"۔ شیخ احمد نے اسی وقت سے قرآن یاد کرنا شروع کردیا (صفحہ ۱۷۴ مطبع اودھ اخبار)

شیخ نصیر الدین اودھی | شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی (المتوفی ۷۵۷ھ) تھے جب اپنے ایک ساتھی شیخ اخی سراج کو بنگالہ رخصت کیا تو انھوں نے عرض کی کہ اس مملکت پر تو شیخ علاء الدین قبل سرفراز ہیں، فرمایا "تم اوپر تل تلے"

خواجہ بندہ نواز دکنی | شیخ نصیر الدین دہلوی کے دوسرے ممتاز مرید حضرت خواجہ بندہ نواز ہیں جو ۸۰۱ھ میں دہلی سے بہمنیوں کی سلطنت گلبرگہ میں آگئے، اور یہیں ۸۲۵ھ میں وفات پائی، اُن کا ایک فقرہ اُن کے ایک مرید نے یہ نقل کیا ہے "بھوکوں موتے سوں خدا کچھ اپڑ پتا ہے تو خدا کون اپڑنے کی استعداد ہوتی ہے" اُن کا پورا ہندی رسالہ معراج العاشقین چھپ چکا ہے،[۲]

ان بزرگوں کے ان مسلسل فقروں کو سن کر اب اس میں شک کی کیا گنجائش رہتی ہے کہ اس زبان کی عمر جتنی سمجھی جاتی ہے اس سے کہیں زیادہ ہے، یہ حقیقتاً یہی ہندوستان ہی کی زبان تھی جس کو ان بزرگوں نے قبول کی نظر سے دیکھا اور محبت کی شکر میں گھولا۔

---

[۱] تاریخ فرشتہ ۲ صفحہ ۴۰۰ نولکشور۔ [۲] تاریخ زبان اردو ۔ قدیم نولکشور صفحہ ۴۳ بحوالہ عشق نامہ عبداللہ بن عبد الرحمن چشتی۔

خلجی اور تغلق دور ہیں | یہ خلجی اور تغلق سلاطین کا دور ہے، ان بادشاہوں کے زمانہ کی دو یادگار تاریخیں ہمارے سامنے ہیں، تاریخ فیروز شاہی ضیائے برنی، اور تاریخ فیروز شاہی سراج عفیف، ان دونوں تاریخوں میں جن میں سے پہلی دہلی میں چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں اور دوسری ساتویں صدی کے بیچ میں تصنیف ہوئی ہے، بہت سے ہندی الفاظ اور مصطلحات ملتے ہیں، اور جو آج تک اس مشترکہ ہندوستانی زبان کا سرمایہ ہیں۔

بجرہ لکھ (لاکھ) کہار (صفحہ ۱۸۶) ٹھگ (۱۸۹) لونڈی (صفحہ ۱۹۲) ٹیکہ ہندوان (صفحہ ۲۲۰) منڈھ (صفحہ ۲۱۶) گھٹی صفحہ ۲۲۰ بی بٹواریان (صفحہ ۲۸۸) ڈھولک (صفحہ ۲۵۰) چبوترہ (صفحہ ۲۲۰) مٹھ (صفحہ ۳۴۴) لبوہ، چرائی، ڈیہہ قصبات (صفحہ ۲۸۸) منڈہ، منڈی غلہ (صفحہ ۳۴۰) اٹش، موکھ (صفحہ ۲۵۰) سنڈی (صفحہ ۳۰۴) مہین (صفحہ ۳۱۰) ریوڑی (صفحہ ۳۱۶) تھانہ (صفحہ ۳۴۰) دھاوکان (جمع فارسی دھاوا بمعنی ڈاک دوڑیہ (صفحہ ۲۴۱) موڑہ (موڑھا، صفحہ ۲۷۳) چودھری (صفحہ ۲۸۸) بی بی (صفحہ ۳۷۳) بھٹی (صفحہ ۳۴۱) تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی، بی بی (صفحہ ۲۹) ٹکہ (لاکھ صفحہ ۱۰۴) لکھوک (جمع لاکھ صفحہ ۲۳۱) چونہ پز (چونہ پکانے والا) راج (معمار) سونھار و سونار (صفحہ ۳۴۳) بھتر بھیتر (صفحہ ۱۰۸) لنگرہ کنڑہ (صفحہ ۲۷۱) چودھریاں (صفحہ ۲۷) لت الات (صفحہ ۲۷) بھیرلو (صفحہ ۳۹۲) کھتریاں (صفحہ ۳۴۲) کھڑیال خانہ (صفحہ ..) درخت سنبھل (صفحہ ۲۱۱) چوترہ (صفحہ ۳۱۰) (سراج عفیف)

تاتار خان اعظم نے عورتوں کی پردہ سواری کے لئے گرو ونہار است کہ نامیدہ بودکہ آنرا بزبان ہندی ڈولہ گویند" (ص ۲۹۲ سراج عفیف) محمد تغلق کی زبان سے ایک دفعہ

ایک بیدیی کا فقرہ نکلتا ہے، مولانا عماد بر سرِ دربار اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ "مخور" (اخبار الاخیار صفحہ ۸۸) فیروز شاہ کے عہد میں سکندر حاکم بنگال ایک افسر ملک قبول سے پوچھتا ہے "چہ نام داری" ملک قبول بزبان ہندی گفت "تورا بانہ" اب اس کو "تورا بندہ" سمجھئے یا "تورا بندہ" (شمس سراج عفیف صفحہ ۱۶۰)

سلطان محمد تغلق نے جب سندھ کے حملہ میں جان دی اور سلطان فیروز شاہ نے ناکام حملہ کے بعد سندھ چھوڑ کر گجرات کا رخ کیا تو سندھیوں نے کہا

"برکت شیخ پتھا، ایک موا ایک نٹھا" (شمس سراج عفیف صفحہ ۲۳۱)

امیر خسرو کا عہد اب وہ زمانہ ہے جب کل ہندوستان ایک دہلی کے علم کے نیچے جمع ہو گیا تھا، اور ہندوستان کے اندر ایک متحدہ زبان کا پیکر تیار تھا، جس نے عوام کے بازاروں سے اہل علم کے حلقوں تک رسائی حاصل کر لی اور امیر خسرو (المتوفی ۷۲۵ھ) جیسے ہمہ گیر سلطان ادب نے اس کی سرپرستی کی اور اس کو عربی و فارسی منظومات کے پہلو بہ پہلو جگہ دی، امیر کی فارسی مثنویوں اور تاریخی تصنیفوں میں بے شمار ہندی الفاظ استعمال پائے ہیں، ان کی ہندی نظمیں جو پہیلیوں اور مکرنیوں کی صورت میں ہیں بہت مشہور ہیں، گو اس وقت ہمارے پاس ان کی ان ہندی منظومات کا کوئی مستند حصہ نہیں ہے تاہم انھوں نے اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ میں جو طویل فارسی نثر لکھی اس میں اپنی ہندی نظم پر خود فخر کیا ہے، فرماتے ہیں:

پیش ازیں از بادشاہان سخن کسے را سہ دیوان نہ بود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلامم، مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اما آں سہ دیوان او عبارت است از عربی و فارسی و ہندوی اما در پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نہ کردہ جز من کہ دریں کار قسام

حادلم ۔ ع ۔ قسمت چو چنیں بود چہ تدبیر کنم[1]

امیر خسرو کی اس عبارت کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے بھی مسعود سعد کی طرح عربی و فارسی اور ہندی کے تین الگ الگ دیوان تیار کئے تھے بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسعود سعد نے تینوں زبانوں میں الگ الگ تین مستقل دیوان تیار کئے تھے، اور میں نے ایک زبان فارسی میں ہندی اور عربی کو ملا کر ایک "سخن" کا سراپا تیار کیا۔

امیر کو اپنے ہندی کلام پر جو ناز تھا وہ ان کے اس شعر سے نمایاں ہے جس کو انھوں نے اپنی اسی کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے۔

چو من طوطی ہندم ار راست پرسی   ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

اسی خاتمہ میں ایہام کی ایک نئی صنعت پیدا کرنے پر فخر کیا ہے۔

"بارا ایہامے دیگر برست کردہ ام کہ یک طرف ہمہ ہندوی خیزد می افتد وجانب دیگر پارسی می خیزد۔"

آہی آئی یہاں پیاری آہی   ماری ماری بہ[2] آئی موری ماہی

امیر نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی ایک فضیلت یہ بیان کی ہے کہ یہاں کے لوگ ہر ملک کی زبان بول سکتے ہیں، مگر بیرونی لوگ یہاں کی زبان نہیں بول سکتے، کہتے ہیں ؎

ہست دوم آنکہ ز ہند آدمیاں   جملہ بگو ینید زبان ہا بہ بیان

لیک از اخصائے دگر ہر کسے   گفت نیارد سخن ہندیے

ہست خطا و مغل و ترک و عرب   در سخن ہندوی ما دوختہ لب

---

[1] خاتمہ غرۃ الکمال امیر خسرو قلمی دارالمصنفین۔ [2] اس شعر کو میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔

غرض ہر جگہ وہ اپنی زبان کو ہندوی کہتے ہیں۔ اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندوی زبان اس وقت کے ہندوستان کے بول چال میں تھی۔

شیخ شرف الدین منیری بہاری

حضرت شیخ شرف الدین احمد منیری المتوفی ۷۸۲ھ جن کا وطن اور مسکن بہار ہے اور تعلیم و تربیت بنگال میں پائی تھی اور بیعت دلی جا کر حاصل کی تھی، ان کے بہت سے ہندوی دوہے ہیں، جن میں بعض بیماریوں کی مجرب دوائیں بتائی گئی ہیں مثلاً

لودھ پھٹکری مرداسنگ — ہلدی زیرا ایک ایک ٹنگ
افیون چنہ بھر مرچیں چار — دردھ پھر تھوتھا اس میں ڈار
پوستکے پانی پوٹلی کرے — نینا پیرا پل میں ہرے

(شفاء الامراض حکیم محمدی وسینوی مرحوم قلمی دلبینہ)

حضرت شیخ کے ملفوظات کا مجموعہ معدن المعانی کے نام سے اُن کی زندگی ہی میں زین بدر عربی نے فارسی میں لکھ کر نذر گذرانی تھی، اس میں ایک موقع پر اُردو کے دو فقرے استعمال ہوئے ہیں، خواجہ جلال الدین حافظ ملتانی نے عرض کی۔

"بزبان ہندوی نیکو گفتہ است ہر کہ گفتہ است "باٹ بھلی پر سانکرے"۔"

حضرت شیخ نے اس کی تائید میں فرمایا۔

بعد ازاں بندگی مخدوم عظمہ اللہ بر زبان مبارک راند "دیر بھلا پہ دور"۔ (معدن المعانی مطبوعہ شرف الاخبار بہار ۱۸۸۴ء / ۱۳۰۱ھ جلد اول صفحہ ۲۰۳)

---

[1] نومبر ۱۹۲۶ء کے اورینٹل کالج میگزین میں امیر خسرو کی مختلف تصانیف سے ہندوستانی الفاظ تلاش کر کے لکھے گئے ہیں۔ [2] ان اشعار کو آزاد نے آب حیات میں امیر خسرو کی طرف منسوب کیا ہے۔

ہمارے وطن (دلیسنہ ضلع پٹنہ) کے کتب خانۂ اصلاح میں ایک فالنامہ کے دو (۲) صفحے پرانے کاغذ کے ہیں، جن میں اسی زبان میں مختلف اعداد کے جوابات بتلائے گئے ہیں، اور اس کے سرنامہ پر اس فالنامہ کی نسبت حضرت مخدوم کی طرف کی گئی ہے، اس میں کل ستائیس فقرے ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱۱۱ جو من کی منسی کیا ہوئی سو ہوئی۔

۱۱۲ ناہیں کچھ کر دنصیب لاگی بات ہے۔

۱۳۱ ایہین، اھیین ناہین۔

۳۱۱ اھیین ناہین، سونت رہو جلئے۔

۳۲۲ راج پاٹ اچل کے دیا تمکون

۲۲۲ آگے بڑے دن گئے اب سکھ پاوہ گے۔

۲۳۳ اھیین ناہین آگو ہو چکا۔

۳۱۱ تو رہے دن کے اب سکھ سو جینا ناہین۔

مخدوم اشرف کچھوچھوی اودھی اسی طرح حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی (المتوفی ۸۰۸ھ) ہیں، ان کا بڑا حصہ بنگال، بہار اور اودھ میں بسر ہوا اور کچھوچھہ ضلع فیض آباد میں مدفون ہوئے، ان کے ملفوظات کے مشہور مجموعہ لطائف اشرفی میں الفاظ و عبارتیں اور منتر اردو یا ہندی میں ملتے ہیں، اس کے مؤلف نظام حاجی غریب یمنی سنہ ۸۰۵ھ میں ان کے مرید ہوئے تھے، اس مجموعہ میں ایک حکایت ہے کہ سید اشرف جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ دہلی کے پاس سے گزرے، اسی کے قریب ایک گاؤں میں مولانا کریم الدین نامی بزرگ رہتے تھے، سید موصوف ان سے ملنے کے لئے چلے، کسی نے مولانا کو جا کر اطلاع دی،

انھوں نے یہ خبر سنکر خاکساری کی راہ سے فرمایا،[1] "مثل ہندوی فرمودہ" "چھیری کے منھ کھنڈا سماۓ" چھیری مشرقی اضلاع کے دیہاتوں میں بکری کو کہتے ہیں، اور کھنڈا چاولوں کے چورا کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ بکری کو کھنڈا کھانے کو ملے یہ اس کی عزت افزائی ہے، سید اشرف[2] کی زبان سے اس میں سانپ اور بچھو کے کاٹے کے کئی منتر لکھے ہیں، جو نسخ و کتابت کی غلطیوں سے مسخ ہو گئے ہیں، بچھو کے کاٹنے کا ایک منتر صاف ہے "دھر بندھوں، دھر کندھوں اسوا لاکھ سپاری بندہوں اپنے بھگت گرو کے سکت ہوں بکہ جو آگین (آگے پڑھے)،

دوسرا- ایکی لکڑی، پانی پرائی آنکس بندہوں نرس پرائی مری بکہ جو اگین (آگے) جاۓ،

دوسرا- کالی کونی جنگل کے کا جل دھکا ناتھ پانچ چیرا الخ ......

شیخ علاء الدین بنگالی	شیخ علاء الدین لاہوری پنڈوی بنگالی المتوفی ۸۰۰ھ اور شیخ نور الحق پنڈوی بنگالی المتوفی ۸۱۳ھ باپ بیٹے تھے، یہ تھے لاہوری مگر سکونت

بنگال جا کر اختیار کی، شیخ نور الحق اپنے مکتوبات میں ایک فارسی شعر لکھ کر اس کے ہم معنی ہندی شعر لکھتے ہیں۔

همه شب به ناله ام شد که صبا نماد بوۓ — ندمید صبح بختم چه گنه نهم صبا را

برہن سب آئی سویا بیچ، نلہ دھا تھا نون — پیو پیو چھے پاتری مجھ سہاگن نوں

(صفحہ، قلمی دار المصنفین)

اسی زمانہ کے ایک اور بزرگ شیخ الاسلام سعد اللہ لکھنوی اور ان کے بیٹے

[1] لطائف اشرفی صفحہ ۳۸ نصرت المطابع دہلی، [2] ایضاً صفحہ ۳۹

شیخ امین الدین لکھنوی المتوفی ۹۶۵ھ ہیں، یہ دونوں ہندی کے شاعر تھے، ان کے مکتوبات میں ہندی الفاظ، دوہے اور ہنڈولے ملتے ہیں، لکھتے ہیں:

"در شب روز تحریر "جگری" بجیاں گذشتہ فیضہ شدہ است، ذوق خواہند گرفت جگری مذکور اینست، ہندوی۔

کون پراجت دیا کینو ن　　　شہ کل با نہہ دئی کرسو تون

عقدہ

مجھ برہا، برن جگا وے　　　ہور مرتین چال بنا وے

جی ہون بہیون بھول کندھیلائے　　　جو بھنج تن جرجا کانٹ کنیا سے

عقدہ

جی ہون سعد پیارے جیبون　　　سکھ دکھ پی کے بات کھیتون

امین الدین مادھی جودی ہیو　　　شہ کے بدنش داری جیو

مخدوم عبدالحق ردولوی

مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی المتوفی ۸۳۷ھ کے ملفوظات میں بہتیرے سے فقرے ملتے ہیں، شیخ نے کچھ زمانہ شام (پنجاب) میں بسر کیا تھا، فرماتے ہیں کہ وہاں ایک زاہدہ بی بی رہتی تھیں جو بڑی عبادت گزار تھیں، رات کو تہجد میں شیخ سے پہلے اٹھتیں اور:

"این فقیر را بلطف می فرمودند بزبان ہندی، بیٹا احمد آب گرم موجود است بیاید کہ باآب سرد وضو کنی" (۱۹)

شیخ کا ایک مرید شب و روز یہ جپتا تھا:

آہ شیخ احمد مادیجے بارہ، (صفحہ ۱۰۰)

شیخ نے ایک دفعہ یہ ہندی دوہرہ زبان مبارک سے ادا فرمایا۔

کنوا ہو تو باٹوں اسمندر کہ پاٹن جائے
بارا ہو رہوں جھیل کہ برجن جائے

شیخ احمد عبد الحق رودولوی کے ملفوظات، شیخ عبد القدوس گنگوہی المتوفی ۹۴۵ھ نے جمع کئے ہیں رودولی اور گنگوہ ہمارے صوبہ کے ابتدائی اور انتہائی کنارے کہے جا سکتے ہیں، اس مجموعہ میں حسب ذیل الفاظ نہایت بے تکلفی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں، ہنڈولہ (صفحہ ۳۷)، پلنگ (صفحہ ۳۸) اور اس سے بڑھ کر جب انکہ چارپائی (صفحہ ۴۰)، چبوترہ (صفحہ ۶۰)، جنگل (صفحہ ۶۷)، کھچڑی (صفحہ ۶۳)، دھکا (صفحہ ۷۲)، کنوارہ (صفحہ ۷۸)، آب ادبانسے سے (صفحہ ۹۰)، پالکی (صفحہ ۹۵)، دیپک (صفحہ ۹۹)، کندوری (کھانا صفحہ ۱۰۰)، مہاجن (صفحہ ۱۲۳)

دھنیے اور گوجری وغیرہ | اب ہم اس زمانہ میں پہنچ گئے ہیں جب ہندوستان کی اس متحدہ زبان نے نظم کی زمین پر قبضہ کیا، شروع شروع میں یہ مذاقیہ اور تفریحی منظومات میں اسی طرح کام میں لائی گئی ہے، جیسے ہمارے عہد میں اکبر مرحوم نے انگریزی لفظوں اور جملوں کا استعمال اُردو شعروں میں کیا، مگر یہ ظرافت بہت جلد سنجیدگی سے بدل گئی، محمد تغلق نے ہندوستان و دکن کو ایک کر دیا اور دولت آباد دکن کو اپنی حکومت کا دار السلطنت اور دِلی اُجاڑ کر اہل دہلی کو دولت آباد میں لے جا کر بسایا یہ پہلا دن تھا جس میں اس زبان کا تخم دکن کی سرزمین میں ڈالا گیا، یہاں کی آب و ہوا اس کو ایسی راس آئی کہ تخم بڑھ کر پودا ہوا، اور پودا ایک عظیم الشان درخت بن گیا، اور جیسا کہ آگے سنا جائے گا کہ اس درخت نے شمال سے پہلے دکن میں پھل دیئے تصوف اور عوام کے مذہبی جذبات نے اس زبان کو اپنے فیوض سے

مالا مال کرنا شروع کر دیا، جس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ دکن کے بہمنی بادشاہوں نے آٹھویں صدی ہجری میں دہلی سے الگ ہو کر گلبرگہ میں جب اپنی نئی خود مختار حکومت قائم کی تو اپنا سرکاری دفتر فارسی کے بجائے ملک کی دیسی زبان میں رکھا، اس کے قدرتی نتیجے دو ہوئے، ایک تو یہ کہ برہمنوں نے سرکاری دفاتر میں جگہ پائی، اور دوسرا یہ کہ دیسی زبان نے ترقی شروع کی، بہمنی مٹ کر جب عادل شاہی و قطب شاہی وغیرہ پیدا ہوئے تو انھوں نے بھی اسی زبان کی سرپرستی کی، اور چونکہ شمالی ملک کے سلاطین کی طرح اُن کے کابل و ایران سے تازہ تازہ تعلقات نہ تھے۔ اور نہ خود اجنبی نسل و وطن پر فخر کرتے تھے، اس لئے ان کے دربار کی زبان فارسی کے بجائے ہندوستانی ہو گئی تھی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی ان کی مادری زبان تھی۔

ہندوستانی مسلمانوں کی مادری زبان

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ سے ۱۰۳۷ھ) جو تخت نشینی کے وقت تک جاہل رہا تھا، اور پھر رفتہ رفتہ اس نے پڑھنا سیکھا اور فارسی پڑھی، اس کے حال میں اس کے معاصر مورخ فرشتہ نے لکھا ہے:-

"فارسی خواں گردید، بنوعے فارسی را خوب می گفت کہ تا با ہندوستانی متکلم نمی شد، ہیچ کس نمی توانست فہمید کہ غیر از فارسی زبان دیگر آشنائی دارد" (ج ۳ صفحہ ۸۰ نولکشور)۔

اس اہم فقرہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک تو ہندوستانی زبان کا وجود اور دوسری یہ کہ ان بادشاہوں کی عام بول چال کی مادری زبان یہی ہندوستانی تھی،

جس میں اُن کے عہد کی تصانیف ملتی ہیں۔

موجودہ صوبہ جات متحدہ کی مادری زبان بھی اس عہد میں اسی قسم کی ہندوی یا ہندوستانی تھی، بدایوں جو مغلوں سے پہلے ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا، وہاں کے عبدالقادر بدایونی جنھوں نے ۱۰۰۴ھ میں اپنی تاریخ لکھی ہے۔ اس وقت کے ایک نو سالہ (۹۴۷ھ کی ولادت) استاد شیخ عبداللہ بدایونی کا حال لکھتے ہیں کہ بچپن میں وہ اُستاد سے بوستاں پڑھ رہے تھے، شعر یہ آیا۔

محال است سعدی کہ راہ صفا   تواں یافت جز از پئے مصطفیٰ!

"پرسید کہ معنی ایں بیت چیست، بزبان ہندی بیاں کنید .... چو معنی آں گفتند ......" (ج ۳ صفحہ ۵۴)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بچوں کی مادری زبان ہندوی ہو چکی تھی، اکبر کی زبان میں ملا بدایونی وغیرہ نے پنڈتوں کی مدد سے جن ہندی سے فارسی میں سنسکرت کتابوں کے ترجمے کیے تھے اس سے مراد یہی اس وقت کی اُردو ہے، پنڈت سنسکرت سے اُس وقت کی ہندوی میں، اور ملا ہندوی سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ ملا نے سنسکرت جاننے کا کہیں دعویٰ نہیں کیا ہے۔

شیخ عبدالوہاب متقی جن کا وطن مالوہ تھا، ۹۶۳ھ میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، اور وہاں ممالک اسلامی کے طلبہ کو درس دیتے تھے، اس درس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر ملک کے طالب علموں سے ان ہی کی زبان میں تقریر فرماتے تھے، اس سلسلہ میں ہندیوں کو وہ ہندی میں سبق پڑھاتے تھے، شیخ عبدالحق دہلوی جو ان کے شاگرد خاص تھے، اُن کے حال میں لکھتے ہیں:۔

"وبا ہندیان در تقریر فارسی تکلف نکنند، وہم بہ زبان ہندی، اکتفا فرمایند"[1]

یہ واقعہ بھی اس دعوے کی شہادت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زبان ایک مدت سے ہندوستانی ہو چکی تھی۔

شیخ عبدالوہاب متقی کے استاد شیخ علی متقی مشہور محدث ہیں ان کا آبائی وطن تو جونپور تھا، لیکن پیدائش برہان پور میں ہوئی اور ابتدائی ملازمت شاہان مالوہ کے ہاں منڈو میں کی، شیخ باجن کے مرید اور ان کے لڑکے سے چشتی خرقہ پہنا پھر ملتان جا کر شیخ حسام متقی کی صحبت اٹھائی، پھر ہندوستان سے ہجرت فرما کر مکہ معظمہ چلے گئے، کبھی کبھی سلاطین گجرات کے اصرار سے احمد آباد گجرات آجاتے تھے، ۹۷۵ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی، غور کیجئے کہ ان کا تعلق ہندوستان کے کن کن صوبوں سے رہا، جونپور (پورب)، برہانپور[2] (خاندیس) منڈو (مالوہ) ملتان (سندھ و پنجاب) اور احمد آباد (گجرات) با ایں ہمہ جو ان کی زبان تھی وہ اس دوہرہ سے ظاہر ہے جس کو انھوں نے اپنی موت سے کچھ دنوں پہلے مرض الموت کی حالت میں پڑھا، فرمایا کہ کھانے کو پیس ڈالو۔

آں چناں سحق کن کہ ہمہ یکے شود دوئی نماند، چناں چہ ایں دوہرہ خبر می دہد و می گوید[3]، دوہرہ۔

سن سہیلی پریم کی باتا یوں جل رہی جیون دودھ نباتا

دیکھئے کہ اردو کی پوری نشان اس شعر میں موجود ہے۔

---

[1] تاریخ اردوئے قدیم حکیم سید شمس اللہ قادری، نقلاً از زاد المتقین الی طریق سلوک الیقین شیخ عبدالحق دہلوی قلمی، [2] برہانپور اب سی۔پی میں ہے [3] اخبار الاخیار صفحہ ۲۹۴ طبع ہاشمی میرٹھ،

تاہم اس میں شک نہیں کہ جب تک شمالی ہند میں حکومت کا رعب و داب قائم رہا اس مادری زبان میں لکھنا پڑھنا اور تصنیف و تالیف معیوب رہی، اور اس کے برخلاف دکن اور گجرات میں خود صوفیہ نے اور شیعہ بادشاہوں نے پہل کی۔ صوفیہ نے اس زبان میں صوفیانہ رسالے لکھے اور بیجاپور اور گولکنڈہ کے بادشاہوں نے اس میں امام حسین علیہ السلام کے مرثیے اور مناقب لکھے اور رفتہ رفتہ شاعری کے دوسرے مضامین بھی بندھنے لگے، اور اس طرح نثر کے ساتھ نظم نے بھی دکن اور گجرات میں ترتیب و تدوین کی عزت پہلے پائی۔

ہم سب کو انجمن ترقی اردو اور دکن کے بعض دوسرے اہل قلم کا ممنون ہونا چاہیے جنھوں نے اس عہد کی دکھنی نظم و نثر کتابوں کو حلیۂ طبع سے آراستہ کرنا شروع کر دیا ہے، یہ وہی ہندوستانی زبان ہے جس کو لوگ بعد میں دکھنی کے نام سے یاد کرنے لگے ہیں۔

اس کے صوبہ وار نام حقیقت یہ ہے کہ نئی قوم کے اختلاط اور میل جول نے ہر صوبہ کو متاثر کیا اور اس طرح اس نئی زبان کو بھی مقامی اور صوبہ وارانہ اثرات نے داخل ہو کر مختلف بولیوں میں منقسم کر دیا، دکھنی، گوجری، دہلوی، لکھنوی، بہاری، پنجابی، ہر صوبہ کی ہندوستانی بولی میں علیحدہ علیحدہ کچھ کچھ امتیازات پیدا ہو گئے تھے، اور اس لئے اس نئی زبان کا نام ہر جگہ الگ الگ پڑا، مثلاً دہلوی، دکھنی، گوجری، ہندی، ہندوی، یہ سب بتفاوت اسی ایک کے نام ہیں۔

اردو نام تاہم یہ بات تعجب کے ساتھ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ شروع سے لے کر اب تک اس زبان کا نام کہیں "اردو" سننے میں نہیں آیا، حالانکہ ہم نے

آج اس نام کے سوا اس کے اور سب نام بھلا دیئے ہیں، یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اردو ترکی لفظ ہے جس کے معنی لشکر شاہی یعنی لشکر گاہ اور کیمپ کے ہیں، اور اس معنی میں اس کا استعمال بہت قدیم ہے یہاں تک کہ تغلقوں کی تاریخ میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں بولا گیا ہے، پھر تیموریوں اور خصوصاً شاہجہان کے عہد میں "اردوئے معلیٰ" شاہی لشکر گاہ اور دہلی کے قلعۂ معلیٰ کو کہنے لگے، مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی کا شاعرانہ تسلط بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا، اور اس نئی زبان کی طاقت روز بروز ابھر رہی تھی، عام بازاروں، گلیوں اور معمولی گھروں سے نکل کر شاہی دربار تک اس کا اثر پھیل رہا تھا، اس لئے شروع شروع میں اس کو لوگوں نے "زبان اردوئے معلیٰ" کا خطاب دیا، چنانچہ بارھویں صدی ہجری کے اواخر کی تصنیفات تذکرہ نکات الشعراء میر (صفحہ ۱) اور ذکر میر (صفحہ ۶۷) اور نو طرز مرصع مرقومۂ تحسین میں یہ نام یعنی "زبان اردوئے معلیٰ" کی لغوی اضافت کے ساتھ استعمال پاتا ہے تیرھویں صدی کے اوائل سے کثرت استعمال کے سبب یہ اضافت جاتی رہتی ہے اور خود زبان کا نام اردو ہو جاتا ہے[1]، تذکرہ مخزن الغرائب میں (۱۲۱۸ھ

---

[1] زیر تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اضافت کے بغیر یہ اردو نام بارھویں صدی ہجری کے اخیر ہی سے استعمال میں آ گیا تھا، پروفیسر شیرانی نے اس کے ثبوت میں مصحفی کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفیؔ اردو ہماری ہے

"خدا رکھے" سے ظاہر ہے کہ اس وقت میر و مرزا زندہ تھے، اس لئے یہ شعر مصحفی نے ۱۱۹۵ھ سے پہلے کہا ہوگا، خواجہ میر درد کی شاگردی کے مدعی محشر کا بھی ایک شعر لکھا ہے،

گر گفتگو زبان اردو کی کوئی ہم سے سیکھ جائے
کیا ہوا نہیں میں محشر اپنی بید الشق نہیں

[illegible] محشر ۱۲۰۸ھ میں مارے گئے (تذکرہ ہندی مصحفی ص ۲۲۴) مصحفی نے اپنے اس تذکرہ میں بھی جو مخزن الغرائب کے بعد ۱۲۲۱ھ ۱۲۳۶ھ کی تالیف ہے شاعر کے حال میں (ص ۲۵۵) زبان اردو لکھا ہے۔ مگر اس وقت یہ نام ہو چکا تھا۔

کی تالیف ہے، مرزا مظہر جانجاناں کے حال میں ہے :[1]

"در زبان ہندی کہ مراد از اردو است نہایت فصیح و بلیغ بود۔"

باغ و بہار وغیرہ فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات میں یہ لفظ زبان کے معنوں میں عام طور سے بولا گیا ہے، ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کے نام کے طور پر آج سے صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کی ایجاد ہے۔

دہلی کے اردوئے معلّٰی پر جب تباہی آئی تو گو دہلی کے علم و ادب اور شعر و سخن کا خزانہ لٹ گیا، مگر اس کا اتنا فائدہ ہوا کہ حسب استعداد حصّہ رسدی کے مطابق تمام صوبوں میں جہاں چھوٹی چھوٹی نوابیاں قائم ہو گئی تھیں، بزرگوں کا یہ اندوختہ سرمایہ بٹ گیا، اہل علم دہلی سے نکل نکل کر پہلی منزل لکھنؤ میں دوسری عظیم آباد میں اور تیسری مرشد آباد بنگال میں کرتے تھے، اور آخر میں ایک اور منزل فورٹ ولیم کلکتہ میں قائم ہوئی، بہت سے عزم و ارادہ والے ایسے بھی تھے جو دکن و ارکاٹ جا کر پناہ گزیں ہوئے، اور اس طرح پورے ملک میں اردوئے معلّٰی کی زبان نے اشاعت پائی ع

بلد و شود سبب خیر مگر خدا خواہد

یہ اس زبان کی مختصر تاریخ ہے جو آج ہماری ملکی اور قومی زبان ہے بلکہ جو آج اس پورے ملک کی واحد متحدہ زبان ہے۔

چونکہ مسلمانوں سے پہلے یہ ملک بہت سی راج دھانیوں میں بٹا ہوا تھا، اس لئے اس میں کوئی ایک متحدہ زبان تھی اور نہ کسی متحدہ قومیت کا وجود تھا، اور نہ ایک متحدہ مملکت تھی، مسلمانوں نے آکر اس بر عظیم کو ایک علم کے نیچے ایک

---

[1] خزینہ صرف اس کی تاریخ ہے جیسا کہ مصنف نے خاتمہ میں لکھا ہے، جس سے ۱۲۱۸ھ نکلتا ہے

رگزی کے ماتحت، ایک ملک بنایا جس کا نام پہلے ہند اور پھر ہندوستان رکھا۔ اور یک زبان پیدا کی جس کا نام زبانِ ہند، لغتِ ہند، ہندوی، ہندی، زبانِ ہندوستان ور ہندوستانی رکھا۔

ہندی لفظ | آج کل جس کو "ہندی" کہتے ہیں، وہ پورب کی ایک صوبہ وار بولی ہے، جس کے لئے یہ کوشش کی جارہی ہے کہ یہ پورے ملک کی بولی ہو جائے، مگر حقیقت میں اس کا ایسا نام جس کی معنویت کے دائرہ میں سارا ہندوستان داخل ہو جائے، خود بدیسی ہے، پھر بھی اس کے لئے ایسا نام اختیار کرنا اس لئے مناسب ہے کہ اس سے سارے ملک ہند کا خیال سامنے آتا ہے، ورنہ اگر اس کو برج بھاشا یا پوربی بھاشا کہہ دیا جائے تو یہ ملک کے ایک محدود جغرافی حصہ کے ساتھ خاص ہو جائے۔

اہلِ عرب یہاں کی قدیم زبانوں میں سے ہر ایک کو "ہندی" یا "ہندیہ" کہتے تھے، وہ سنسکرت، پالی، سندھی، ملتانی، گجراتی سب کو ہندی ہی کہتے تھے، چنانچہ بزرگ بن شہریار کی روایت کے مطابق ۲۷۰ھ میں جس زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا گیا تھا اس کا نام اس مصنف نے "ہندیہ" بتایا ہے۔

ان یفسرلہ شریعۃ الاسلام بالھندیۃ — شریعت اسلام کا ہندی میں حال لکھے۔
(عجائب الہند صفحہ ۳)

ان یفسرلہ القراٰن بالھندیۃ — قرآن کا ہندی میں مطلب بیان کرے۔
(عجائب الہند صفحہ ۳)

اسی طرح الفہرست میں جو ۳۷۷ھ کی تصنیف ہے، ہندوستان کی جس زبان سے عربی میں طب کی کتابیں ترجمہ ہوئی اس کے بیان میں ہندوستان کی زبان کا

نام "ہندی" ہی رکھا گیا ہے۔

نقل من الہندی الی الفارسی، (صفحہ ۲۴ مصر) ہندی سے فارسی میں نقل ہوا۔

اس لئے مسلمانوں نے اپنی حکومت کے بعد اس زبان کو جس کو ہندوستان میں آکر انھوں نے اختیار کیا، ہندی کا نام بخشا، انتہا یہ ہے کہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی نے قرآن پاک کا جس زبان میں ترجمہ فرمایا، اس کو بھی ہندی ہی فرمایا، اس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندی کی وسعت کہاں تک تھی، اور اس میں ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہ تھا، ایک ہی زبان تھی جو پورے ملک پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

اردو اور ہندی کی تقسیم

لیکن انگریزوں نے دہلی کے اردوئے معلیٰ کو اجاڑ کر کلکتہ کے فورٹ ولیم میں اپنا نیا "اردوئے معلیٰ" بنا کر کھڑا کیا، زبان کو اپنے ہم قوم عہدہ داروں اور تعلیمی اداروں کی خاطر ملکی زبان کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی، مگر ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ان کو ہندوستان میں حکومت کرنا ہے تو اس متحدہ قومیت کے درخت پر جو صدیوں کی خونریزی سے سینچ سینچ کر تیموریوں کی باغبانی سے تیار ہوا تھا، پہلے کلہاڑی مارنا ضروری ہے، اس کے لئے ضرورت تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتیازات کے حدود کو جس قدر ممکن ہو ابھارا جائے، چنانچہ فورٹ ولیم میں اردو اور ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے، ایک کو مسلمانوں کے سر پر تھوپا، اور دوسرے کو ہندوؤں کے سر مڑھا، اور اس کا نام علمی قدردانی، اور ادب نوازی رکھا، اور دونوں زبانوں میں کتابیں لکھوا لکھوا کر لوگوں میں تقسیم کی گئیں، یہ ہے آغاز اس انجام کا جو آج اردو اور ہندی کے جھگڑا پیدا ت

کی صورت میں ملک میں قائم ہے۔

شاید آج لوگوں کو یہ واقعہ بھی یاد نہ ہو جس کا تعلق عظیم الشان درس گاہ کے پہلے بانی سے ہے۔ ہندی اردو کا جھگڑا ۱۸۶۷ء سے شروع ہوا ہے۔ اسی سال بنارس میں بعض سربرآوردہ ہندوؤں نے یہ کوشش شروع کی کہ تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط موقوف ہو کر ہندی بھاشا اور دیوناگری خط جاری ہو۔ سرسید اس وقت سے لیکر مرنے سے نو دن پہلے تک اسکے خلاف قلمی جہاد میں مصروف رہے، اور انہی کی مخالفت کا اثر تھا کہ انکی زندگی تک یہ تجویز سرکاری طور سے منظور نہ ہو سکی۔ انکی وفات کے چند سال بعد غالباً ۱۹۰۰ء میں سر میکڈانل صاحب لفٹننٹ گورنر صوبۂ متحدہ نے اس صوبہ میں ہندی کو قانوناً ممتاز حیثیت بخشی، اور اردو ہندی کی ناگوار بحث کا وہ تخم اس سرزمین میں بو دیا جس کو اس سے پہلے وہ بہار میں بو چکے تھے۔ لکھنؤ کے گنگا پرشاد ورما لائبریری ہال میں سرسید کے جانشین اور اس درسگاہ کے سیکریٹری نواب محسن الملک مرحوم کی صدارت میں اردو کے ماتم کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مرحوم نے ایک دلگداز موثر تقریر کے بعد اردو کے لئے یہ مصرع پڑھا تھا ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اور یہی وہ فیصلہ ہے جسمیں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، اور ہندی بھی پنڈت مالویہ کی کوششوں کی زیر سرپرستی روز بروز ترقی پانے لگی۔ ہندی اخبار اور رسائل اور تصنیفات کا انتظام ہوا اور پورے ملک میں اردو اور ہندی دو حریف کی حیثیت سے صف آرا ہو گئیں اور اب تک ہیں اور اب انھوں نے ہندو مسلمان دونوں کی دو الگ الگ زبانوں کی شکل اختیار کر لی ہے جو حد درجہ افسوسناک ہے۔

علی گڑھ کی تحریک کا حصہ اردو زبان کی ترقی میں

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی میں نئی تحریک اور نئے تعلیمی و ادبی انقلاب کی آواز اسی درسگاہ کی چہار دیواری سے اٹھی، ایک مولوی محمد حسین صاحب آزاد کو چھوڑ کر جو ایک مستقل ادبی ریاست کے بانی ہیں، باقی اردو کے تمام علمبردار اسی کی ہمہ گیر سلطنت سے وابستہ تھے، اردو زبان کو قصص و حکایات اور قصائد و غزلیات کے تنگ کوچہ سے علوم و فنون کی شاہراہ پر جو لایا وہ سر سید مرحوم ہی تھے، اردوئے معلی اور عود ہندی والے غالب کے بعد جس نے عروس اردو کو سادگی کا گہنا پہنا کر تکلفات نا لطائف کی گرانباری سے آزاد کیا وہ اسی درسگاہ کا بانی اول تھا، سر سید مرحوم کی اردو کی پہلی تصنیف آثار الصنادید ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے مسجع و مرصع عبارت میں لکھی گئی تھی، مگر اس کا دوبارہ اڈیشن صاف و رواں عبارت میں شائع ہوا۔

گو یہ صحیح ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھیوں نے سر سید کیا بلکہ غالب سے بھی پہلے سادہ نگاری کا آغاز کیا، مگر وہ تحریک صرف مذہبی دائرہ میں سمٹ کر رہ گئی، اسی طرح حیدرآباد میں نواب شمس الامراء بہادر نے جدید علوم پر متعدد نام اردو رسالے تصنیف کئے اور دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر نے پولیٹیکل اکانومی کے ترجمے کئے، مگر یہ افراد کی محدود کوششیں تھیں، سر سید نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے باقاعدہ ایک علمی انجمن اس غرض سے قائم کی کہ علوم و فنون کی نئی نئی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں، آج جو مسلم یونیورسٹی پریس ہے اس کی بنیاد اول اسی سائنٹفک سوسائٹی کا پریس ہے، جو پہلے سر سید کا ذاتی پریس تھا، اس سوسائٹی کی طرف سے چالیس کتابیں

چھوٹی بڑی، تاریخ اور سائنس کی چھپ کر شائع ہوئیں۔

سرسید نے اپنی کشش اتصال سے علم و ادب کے ایسے منفرد ستاروں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک نظام شمسی تھا، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا نذیر احمد، مولانا شبلی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور بہت سے اہل قلم یکجا ہو گئے، جنھوں نے اپنی کوششوں سے اس بولی کو زبان کا درجہ دے دیا اور ہر قسم کی ادائے مطلب کا اہل بنا دیا۔

علی گڑھ کی درسگاہ کو اس زبان کی ترقی کی تاریخ میں بہت سے اولیات حاصل ہیں۔

۱۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے اس زبان کے لئے علمی و ادبی ذخیرہ فراہم کیا۔

۲۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس کے احاطہ میں اس زبان کے مسلّم و مستند مصنف اور اہل قلم پیدا ہوئے۔

۳۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ اس زبان کے معیاری ذخیرہ کو اہل نظر اور شائقین کے لئے فراہم کیا "علی گڑھ کالج بکڈپو" آج سے تیس برس پہلے اس زبان کا واحد ذخیرہ گاہ تھا، جہاں سے کم از کم ایک ہزار ماہوار کی کتابیں فروخت ہوتی تھیں۔

۴۔ اور سب سے آخری یہ ہے کہ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے دہلی اور لکھنؤ اہل زبان اور زباندان اور شہری اور قصباتی کی دیرینہ جنگ کا خاتمہ کیا، اور جس طرح یہ زبان خود ایک مشترکہ زبان ہونے کی حقیقت کی مدعی ہے، اسی طرح علی گڑھ نے اس کو مشترکہ ہندوستان کی ادبیت کا خزینہ دار بنا دیا، اور دہلی و لکھنؤ کے پرانے پیدائشی دعووں کو مٹا کر اہلیت و استعداد کی شرط کے مطابق حقیقی فضل و کمال کو زباندانی کا معیار قرار دیا۔ اور ادبیات کی ایک آزاد ہندوستانی حکومت قائم کی، جس میں ہر صوبہ کے ہر شہر کے

اہلِ قلم اور اہلِ علم برابر کے شریک ٹھہرے۔ سر سید دہلی کے تھے، محسن الملک اٹاوہ کے، مولانا حالی پانی پت کے، مولانا نذیر احمد بجنور کے، مولانا شبلی اعظم گڑھ کے، مگر ان سب کی تصنیفات نے مل کر اس زبان کا ایک متحدہ معیار مقرر کر دیا۔ سر سید مرحوم نے جس دن مولانا شبلی کی المامون پر یہ فقرے لکھے۔

"یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی گئی ہے، اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔" (دیباچہ طبع دوم المامون)

تو درحقیقت انھوں نے اس وقت اس زبان کو لکھنؤ اور دہلی کی گرفت سے آزادی کا خط فرمان لکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شہر و دیار کے اہلِ قلم کو زبان کھولنے کی جرأت اور اپنی اپنی بساط کے مطابق عرض متاع کی ہمت ہوئی اور کچھ ہی دنوں میں اس زبان کا خزانہ ہر قسم کے قیمتی سامانوں اور ذخیروں سے مالا مال ہونے لگا۔

موانع کے باوجود اُردو کی ترقی

اس انقلاب نے ملک میں علوم و فنون اور سنجیدہ علوم کی تصانیف کا وافر ذخیرہ فراہم کر دیا، اور وہ زبان جو پہلے صرف چند دیوانوں اور کہانیوں کی مالک تھی، وہ ہر قسم کے علم و ہنر سے معمور ہوتی جاتی ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں حکومت و سلطنت کی ذرا بھی مدد شریک نہیں ہے بلکہ لوکل سلف گورنمنٹ کی تعلیمات کا جہاں تک تعلق ہے اردو کو اپنی اشاعت میں ایک انگلی کا اشارہ بھی نہیں مل رہا ہے، حالانکہ ہم کو معلوم ہے کہ ہندی پرچارنی سبھا نہ صرف اس صوبہ کی گورنمنٹ کی مالی امداد سے بار بار مستفید ہوتی ہے بلکہ ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے تعلیمی نصابوں کے وسیع سلسلے کے ذریعہ ہندی دیہاتی اور شہری زبانوں پر روز بروز تسلط کرتی چلی جاتی ہے، شاید یہ بیان تعجب سے سنا جائے کہ ہندو ممبروں

اور کتابوں کے انتخاب کی کمیٹیوں میں ہندو ممبروں کی کثرت کے سبب سے نصاب میں کسی ایسی کتاب کا داخل ہونا اور چلنا ممکن نہیں جس کی اُردو ہندی نہ ہو۔

یہ واقعات شکایت کے طور پر نہیں کہے جا رہے ہیں، بلکہ یہ کہنا ہے کہ باوجود اس کے کہ ہماری زبان کو گورنمنٹ اور گورنمنٹ کے کسی ادارہ سے کسی قسم کی امداد نہیں مل رہی ہے، پھر بھی اس کی ترقی جاری ہے۔

اُردو ایک اور امداد سے بھی قدرتاً محروم ہے، اس بات کی پرزور کوشش کی جا رہی ہے، کہ آیندہ "ہندی قومیت" کی منشا کہ قومی زبان ہندی ہو جائے، اس خواہش کی تکمیل میں کانگریس سے لیکر ناگری پرچارنی سبھا تک یکساں شریک ہیں۔ کانگریس اور دوسرے پولیٹیکل جلسوں میں جن میں گو ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوں، ہندو نوجوان اپنی تقریر ایسی زبان میں کرینگے جن کو جلسہ کے نصف حاضرین نہیں سمجھ سکتے، اکثر ایسی تجویزوں کی تائیدوں کی عزت مسلمانوں کو حاصل کرنی پڑی اور کرنی پڑتی ہے جن کی "ہندی پرستاؤ" کا ترجمہ اُردو میں کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، دوسری بات ایک اور چل گئی ہے کہ اُردو نے جن ہندی لفظوں کو اپنے قالب میں ڈھال کر اپنے کینڈے کا بنا لیا ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ اب اُن کو اصل ہندی تلفظ کے مطابق ادا کیا جائے۔

دوسری طرف ہندو ریاستوں نے ایک ایک کر کے ہندی کو اپنی سرکاری زبان بنانا شروع کر دیا ہے، گجراتی والی ریاست بڑودہ اور اُردو والی ریاست الور سے لیکر مارواڑ، کشمیر اور راجپوتانہ تک یہ تحریک عام ہو رہی ہے۔ اُن سب کے جواب میں ہمارے پاس صرف ایک چیز ہے اور وہ سرکار نظام خلد اللہ ملکہ، لیکن میری پیشین گوئی یہ ہے۔ کہ ان سب حالات کے باوجود ہندوستان کا مستقبل اُردو کے ہاتھ میں ہے ہندوستان:

ہیں جب تک مختلف قومیں باقی ہیں، اور بیرونی دنیا سے اس کے تعلقات قائم ہیں، اس میں ایک ایسی زبان کا وجود جیسی کہ اردو ہے ناگزیر ہے۔

ہندوستان کو اگر ایشیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے ہیں تو اس کو اپنی جس زبان کے ذریعہ سے ان تعلقات کا رشتہ مضبوط کرنا ہوگا، وہ اردو ہے اس کی ایک سمت میں کابل و بلوچستان سے لیکر بغداد تک فارسی حکمراں ہے، اور دوسری طرف سواحلِ عرب و افریقہ سے لے کر جبرالٹر تک عربی پھیلی ہے، ان تمام بیرونی قوموں کے لئے ہندوستان کی جس زبان کا سیکھنا نہایت آسان ہے وہ اردو ہے، یہی سبب ہے کہ یہ زبان اُن تمام ملکوں اور جزیروں میں آسانی کے ساتھ پھیل گئی ہے، جہاں ہندوستانیوں کی آمد ورفت ہے، برما، آسام، سیلون، مالدیپ، انڈمان، ماریشس سنگاپور، پورٹ بلیر، اور افریقہ کے ان مختلف ملکوں میں جہاں جاکر ہندوستانی بسے ہیں اس زبان کو اپنے سینوں سے لگا کر ساتھ لے گئے ہیں، ادھر سواحل عرب میں عدن، جدہ بلکہ مکہ معظمہ تک اس زبان میں بات چیت ہوتی ہے، انتہا یہ ہے کہ پورٹ سعید کے ملاحوں اور مصر کے بازاروں تک میں اس کے بولنے والے ملتے ہیں، کیا اس پر آپ کو حیرت نہ ہوگی کہ قسطنطنیہ میں اُردو سیرۃ النبی اور سیرۃ عائشہ وغیرہ کے ترجمے براہ راست ترکی میں ہوئے، مکہ معظمہ میں میری ماسکو کے ایک عالم موسی جاراللہ سے ملاقات ہوئی جو اردو تصنیف ارض القرآن کو ہندوستانیوں سے پڑھتے تھے، ادھر عربی درسگاہوں اور مسافروں اور تاجروں کے ذریعے یہ زبان یاغستان، افغانستان، بخارا بلکہ چینی کاشغر تک اپنا سلسلہ ملا چکی ہے۔

ہندوستان میں پشاور سے کسی ریل پر بیٹھ کر آپ ہندوستان کے جس گوشہ

میں جائیں، قلی، اہل اسٹیشن، خوانچہ فروش، مسافر، صاف صحیح نہ سہی تو ٹوٹی پھوٹی زبان وہ بولتے چالتے اور سمجھتے آپ کو سنائی دیں گے وہ بھی زبان ہوگی۔

ہندوستان کے پورے طول و عرض میں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں، خواہ اُنکی مادری زبان کچھ ہو اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور اُن صوبوں میں اردو کی تعلیم کے مکتب اور اسکول قائم ہیں، اس لئے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ زبان اب تک ملک کی واحد مشترکہ زبان ہے۔

اس موقع پر ناشکری ہوگی اگر پنجاب کی اُن خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے جو اُس نے اس زبان کی اشاعت میں انجام دیں، لاہور ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے مولانا حالی سب سے پہلے سیراب ہوئے اور گو شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد دِلّی کے تھے، مگر انکے ادبی فضل و کمال کی شہرت کی خوشبو اسی مشک نادر سے نکل کر پورے ملک میں پھیلی، اگر علی گڑھ کا تہذیب الاخلاق اردو کا پہلا معیاری رسالہ ہے جس کو پرانے بزرگوں کے تجربہ کار قلم نے وجود بخشا تھا تو لاہور کا مخزن پہلا معیاری رسالہ ہے جس کو جدید تعلیم یافتوں کے پُرزور دست و بازو نے نکالا اور چمکایا اور جس کے بعد دوسرے ادبی رسالے نکلے اور بڑھے یہاں تک کہ آج اس وسیع ملک کا کوئی نامور شہر ایسا نہیں جس کو اردو کے کسی ادبی رسالہ کا مولد نہ سہی تو مدفن بننے کا شرف حاصل نہ ہوا ہو۔

اُردو اخبارات نے بھی اس زبان کی ترویج و اشاعت میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے، اور کس قدر خوشی اور مسرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ آج پشاور کی پہاڑیوں سے لیکر بمبئی، رنگون، مدراس اور کراچی کے سواحل تک اردو اخبارات پھیلے ہیں، اور اکثر صوبوں سے روزانہ اخبارات نکل رہے ہیں، اور ہفتہ وار صحیفے اور ماہوار رسالوں کی تعداد ان کے علاوہ ہے، بلکہ ہندوستان سے باہر جہاں بھی

ہندوستانی آباد ہیں، اس زبان کے پیغامبر موجود ہیں، اور آج ہندوستان کے جس شہر میں کوئی خطیب چاہے اپنے لئے سامعین کا گروہ پا سکتا ہے ایسے بھی موقعے آئے ہیں کہ انگلستان اور امریکہ تک سے کبھی نوائے کیمبرج اور کبھی صدائے وطن سنائی دی ہے۔

ہندوستان کی اس زبان نے یہاں تک وسعت پائی ہے کہ یورپ کی یونیورسٹیوں اور لائبریریوں میں اس نے اپنی جگہ حاصل کر لی ہے، کیا ہمارے لئے یہ فخر کی بات نہیں کہ ہماری زبان سے انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی میں تصانیف کے ترجمے ہوئے ہیں چند ہفتے ہوئے کہ پوٹسڈم واقع جرمنی سے میرے پاس ٹوٹی پھوٹی اردو میں ایک جرمن ڈاکٹر کا خط موصول ہوا

ہندی کی اشاعت اردو کے لئے مفید بھی ہے

ہندوستان کے ان صوبوں میں جہاں ہندوؤں میں اردو بہت کم رائج ہے، جیسے مدراس اور بنگال، اگر وہاں ہندی کا رواج دوسری زبان کی حیثیت سے ہو جائے تو میرے خیال میں یہ بھی ہندوستان کیلئے نہایت مفید ہے، اول یہ کہ کم از کم کوئی ایک زبان تو ہندوستان کے منہ میں ہوگی، دوسرے یہ کہ ہندی اردو کا ایک درمیانی زینہ ہے، مجھے ایک دفعہ مدراس جانے کا اتفاق ہوا، ریل میں ایک مدراسی ہندو بزرگ کے سوا کوئی رفیق نہ تھا، وہ ناگری پرچارنی سبھا کی مدراسی شاخ کے ذریعہ ہندی سیکھ رہے تھے، اتنے سہارے پر یہ ممکن ہو سکا کہ ہم انگریزی کی مدد لیے بغیر ایک دوسرے کی کچھ سمجھ سکیں۔

قوموں کے بنانے میں زبان کا درجہ

اصل یہ ہے کہ ہمارے وطنی بھائیوں نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ قوم کی پیدائش اور ترقی میں اسکی زبان کو کس درجہ اہمیت حاصل ہے، انسان جانوروں کو تو لگام لگا کر اپنا تابعدار بناتے ہیں، لیکن جب ایک انسانی قوم دوسری انسانی قوم کو اپنی تابعدار بناتی ہے تو گو اس کے منہ میں لوہے کی لگام نہیں

لگاتی، تاہم اس کے منہ میں ایک لگام لگا دیتی ہے، جس کا نام "بدیسی زبان" ہے، انسان کے تمام اعمال اس کے خیالات کے ماتحت ہیں، خیالات کی روح الفاظ کے جسم میں جلوہ گر ہوتی ہے، الفاظ زبان کا دوسرا نام ہیں، اس لئے کسی دوسری قوم کی زبان کے معنی اس قوم کا تمدن، تاریخ، مذہب، جذبات ہر چیز ہیں۔

آپ جب انگریزی پڑھتے ہیں، یا انگریزی بولتے ہیں، تو نادانستہ طور سے آپ کے جسم و جان اور ارادہ و روح انگریز کی صورت اختیار کر لیتی ہے، زبان کے الفاظ، محاورات ضرب الامثال استعارات، ہر چیز اس زبان کی قومیت کی جیتی جاگتی تاریخ ہوتی ہے، اور یہ تاریخ اُس قوم کی زندگی کی تجلیوں کا خزانہ ہوتی ہے، جب آپ انگریزی بول رہے ہوتے ہیں، غور کیجئے گا کہ اس وقت آپ اپنے اندر انگریزی تاریخ، انگریزی جذبات، انگریزی احساسات، انگریزی خیالات کا زندہ پا مجسمہ بنجاتے ہیں، اور خود اپنی تاریخ اپنے قومی جذبات، اپنے مذہبی احساسات، اپنے ادبی خیالات سے یکسر عاری ہوجاتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ اس زبان کے آداب و معاشرت، طرز تمدن، لباس و پوشاک، لب و لہجہ ہر چیز میں اس بدیسی قوم کی نقالی کرنی پڑتی ہے، اب ایسی قوم کو جو قلباً و قالباً روح و جسم ظاہر اور باطن دونوں میں دُوسری قوم کی نقالی کر رہی ہے، خود اپنی قومیت کا وجود اسکے اندر کہاں رہا، اب وہ ایسے افراد بن گئے ہیں جو اپنی قومیت کے عناصر کو تو فنا کر چکے ہیں، مگر دوسری قوم جس کی وہ نقالی کر رہے ہیں وہ اپنے اندر ان کو شمار کرنے سے رہی، اس لئے ان کی حیثیت "معزز اچھوت" سے بڑھ کر نہیں۔

اس مختصر بیان سے اس نتیجہ کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہونا چاہیے کہ قومیت کی تخلیق میں زبان کا درجہ مذہب کے بعد سب سے بڑھ کر ہے، اگر اس نکتہ کو ہم اب تک

نہیں سمجھ سکے ہیں تو یقین کرنا چاہیئے کہ ہم اب تک قومی حقیقت کی معرفت سے کوسوں دور ہیں ہم غیر زبانوں کے سیکھنے میں عمریں برباد کرتے ہیں، اور بدیسی جذبات وخیالات کی نقالی سے اپنی قومی ترقی کا مجنونانہ خواب دیکھتے ہیں۔

مادری زبان میں تعلیم

آج دنیا کے وسیع عرصۂ کائنات میں ہزاروں قومیں آباد ہیں کیا کسی ایک قوم کا بھی نشان دیا جا سکتا ہے، جس نے غیر مادری زبان میں تعلیم کے ذریعہ ترقی کی منزلِ مقصود کو پایا ہے، خود مسلمانوں نے اپنے عقلی علوم وفنون کا بڑا حصہ یونانیوں، مصریوں، ہندوؤں اور ایرانیوں سے حاصل کیا، مگر اس طرح نہیں کہ انھوں نے دمشق و بغداد اور شیراز و قرطبہ میں بدیسی زبانوں کی درسگاہیں کھول دی ہوں بلکہ اس طرح کہ تمام زبانوں کے علمی خزانوں کو ان زبانوں سے لیکر اپنی زبان میں منتقل کر لیا ہے بےشبہ دوسری علمی زبانوں کا سیکھنا بھی ترجمہ و تشریح کے لئے قومی ترقی کے سفر کی ابتدائی منزل ہوتی ہے، مگر وہ خود قومی ترقی کے ہر سفر کی منزل مقصود نہیں ہوتی، وہ ایک عارضی گذرگاہ ہے دائمی قیام گاہ نہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے بہادرانہ اقدام نے ہندوستانیوں کے اس بزدلانہ عقیدہ کو زائل کر دیا ہے کہ دیسی زبان تعلیم کا ذریعہ نہیں بن سکتی، اور حوصلہ دلایا ہے کہ حیدرآبادیوں کی پیروی میں پورا ہندوستان اپنا سفر شروع کرے، ہندوستان کی سب سے پرانی یونیورسٹی نے بھی اپنا چولا بدلنے پر آمادگی ظاہر کی ہے، اور میٹرک تک دیسی زبان ذریعۂ تعلیم بنا دی ہے۔

ہمارے صوبہ کی دوسری قومی درسگاہ ہندو یونیورسٹی بھی ہندی کو میٹرک تک ذریعۂ تعلیم بنانے کا اعلان کر چکی ہے اس سے ہندی زبان کی ترقی و اشاعت اور ہندو

توسیت کی تخلیق کا جو فائدہ اس قوم کو پہنچے گا اس کا اندازہ آسان ہے، کیا ہماری قومی درسگاہ اس مسئلہ پر کبھی سنجیدگی سے غور کرے گی؟

اگر کبھی مسلم یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ آیندہ اس درسگاہ کی تعلیمی زبان اردو ہوگی تو آپ کو چند سال میں معلوم ہو جائے گا کہ اردو زبان کہاں سے کہاں پہنچ گئی، واقعات کی بنا پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ نے اپنی پندرہ سال کی زندگی میں علوم و فنون اور زبان اور قوم کو جو فائدہ پہنچایا ہے، وہ ہماری بدیسی یونیورسٹیوں نے ساٹھ اور ستر سال کی زندگیوں میں بھی نہیں پہنچایا، حیدرآباد میں علمی انقلاب ہو گیا ہے، تصانیف تحقیقات اور جدت خیالات کی نئی دنیا پیدا ہو گئی ہے، اور پیدا ہونے کی امید ہے۔

آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ کا اُس چانسلر حیدرآباد کی اس تعلیمی کشتی کا ناخدا تھا اگر وہ ہمت کرے تو کول کی سرزمین میں بھی وہی کچھ ہو سکتا ہے، جو دکن کی سرزمین میں ہو رہا ہے، اصطلاحات کی مشکلیں ختم ہو چکی ہیں، علوم کی قابل نصاب کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہو سکتی ہیں، اور اب اچھے سے اچھے زبان داں اور مستند پروفیسر ہاتھ آ سکتے ہیں۔

بیشک بعض نئی کتابوں کے ترجمہ کی دقت اٹھانی پڑے گی، لیکن اس مشکل کا حل یہ ہے کہ اردو کے موجودہ اداروں سے امداد و اعانت لیجائے، اور باہمی اشتراک عمل سے اس کام کو انجام دیا جائے، خود جامعہ عثمانیہ نے اپنی بہت سی کتابیں انجمن ترقی اردو، جامعہ طبیہ اور دار المصنفین کے بعض ممبروں سے ترجمہ کرائی ہیں اور پسند کی گئی ہیں۔

اردو کے موجودہ ادارے | اس وقت اردو کی خدمت کے لئے ملک میں متعدد مجلسیں قائم ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی بساط بھر اپنے فرائض انجام دے رہی ہے، اردو کی خدمت کی سب سے پرانی مجلس انجمن ترقی اردو ہے، جو تیس سال سے برابر اپنے کام میں لگی ہے، اور اس وقت تک

تقریباً ستر کتابیں جن میں زیادہ حصہ ادبیات کا، اور پھر سائنس کا ہے وہ شائع کر چکی ہے۔
اس کے بعد دارالمصنفین ہے، جس نے اپنی اٹھارہ سال کی عمر میں پچاس کتابیں شائع کی ہیں جن میں بڑا حصہ اسلامی تاریخ، اسلامی علوم اور جدید فلسفہ کا ہے، عمر میں تیسرا اور کام میں سب سے پہلا درجہ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کا ہے، جس نے اپنی سولہ سترہ سال کی محنت میں سائنس، ریاضیات، سیاسیات، نفسیات، فلسفہ، طبیعات تاریخ اور مختلف علوم وفنون کی درسی کتابوں کا ایک ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، جامعہ ملیہ کی اردو اکاڈیمی کا نام بھی لینا چاہیے جس نے بعض فلسفیانہ تراجم اور اقتصادیات کی، اور بچوں کی تعلیم وتدریس اور مطالعہ کے لئے تاریخی، مذہبی اور ادبی کتابیں شائع کی ہیں، آخر میں ہم ایک اور ادارہ کا نام لینا چاہتے ہیں جس کا شمار اب تک اردو کے محسنوں میں نہیں، حالانکہ حق ہے کہ ہم اس کے خدمات کا کم از کم اعتراف کریں، یہ اسلامیہ کالج پشاور ہے، جس کے بعض اساتذہ نے ہماری زبان میں سائنس اور خصوصاً فلکیات پر متعدد کتابیں پیش کی ہیں۔ آئنسٹائن کے نظریۂ اضافیت اور ریڈیو پر ضخیم کتابوں کا معاوضہ اور راحت کی توقع کے بغیر لکھنا اور چھاپ کر شائع کرنا، ہمارے خالص شکریہ کا مستحق ہے۔

جی چاہتا تھا کہ اس موقع پر مسلمانوں کی سب سے بڑی درس گاہ مسلم یونیورسٹی کا نام بھی لوں جہاں کے اساتذہ بھی انفراداً کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں، مگر سوال ادارہ کا ہے، میری ایک دیرینہ تحریک ہے کہ مسلم یونیورسٹی سیریز کے نام سے ایک مستقل ادارہ قائم کیا جائے اور جو باہتمام مولوی مقتدا خاں شیروانی" چھپ کر ملک کو اپنے کارناموں سے روشناس کرائے، میرولایت حسین صاحب خدا ان کی عمر میں برکت دے گواہی دیں گے کہ جب علی گڑھ کالج بک ڈپو" اردو کی مستند تصانیف کا تنہا ذخیرہ تھا، وہ کالج کے لئے ذریعۂ امداد تھا،

بابارِ دوش ؛ بہرحال مسلم یونیورسٹی میگزین، حیوانات اور طبیہ کالج میگزین اس یونیورسٹی میں ہماری امیدوں کا سہارا ہیں۔

عزیزانِ جامعہ المسلمین! آپ کی یہ تعلیم گاہ پچاس سال تک مسلمانوں کی امیدوں کا قبلہ رہی ہے، اور اب بھی ہے، صرف اتنی شرط ہے کہ یہ قبلہ اپنا منھ مغرب سے پھیر کر مشرق کی طرف کرلے، اور ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنی نظر سے دیکھے یہ درسگاہ تمام ہندوستان کے اسلامی صوبوں کا نچوڑ ہے، اگر اس زبان کی اہمیت نے اس درسگاہ کے دل پر قبضہ پالیا، تو پورے ہندوستان کا میدان اس کے ہاتھ میں ہوگا دیکھنے والوں کو ہندوستان کے تعلیمی مطلع میں عظیم الشان انقلاب کا غبار اڑتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے لئے ابھی سے تیاری کرنا ہے۔

ہندوستان میں زبان کا انقلاب ہوکر رہے گا، اور جس قدر ہندوستان زیادہ متحد ہوتا جائیگا اتنا ہی اسکی متحدہ زبان کا امکان بڑھتا جائے گا، جو لوگ ہندوستان میں دو زبانیں پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کو ہشیار رہنا چاہیئے کہ وہ اس موجودہ ہمالیہ سے بڑھ کر اور ایک ہمالیہ بنا رہے ہیں، جو پہلے ہمالیہ سے زیادہ اونچا ہوگا، پہلا ہمالیہ چاہے ٹوٹ کر چور چور ہو جائے، مگر ہندوستان کو دو منفرق زبانوں میں تقسیم کرنے سے دونوں قوموں کے درمیان ایک ایسا ہمالیہ کھڑا ہو جائے گا، جو پھر قیامت تک ٹوٹ نہ سکے گا

عزیزو! ملک کے سیاسی لیڈر سیاسی سوراج کے لئے لڑ رہے ہیں، آؤ ہم تم ملک کے "زبانی سوراج" کے لئے اپنی جد وجہد شروع کریں، ہمارے وطنی بھائیوں نے عزم راسخ کرلیا ہے، اب تم کو اپنے عزم راسخ کا اعلان کرنا ہے۔

چند مشورے | ہم کو یقین ہے کہ اگر اس زبان کے حامی تھوڑی سرگرمی دکھائیں تو اس بنا پر

کہ اس زبان کی طبعی صلاحیت ہندوستان جیسے ملک کے بالکل مطابق ہے، یہ زبان بھی ہر مخالفانہ کوشش کے باوجود اس ملک میں پھیل کر اور بڑھ کر رہے گی، ضرورت ہے کہ اس زبان کے اہل قلم اور زباندان اس زبان کی آسانی اور سہولت کے لئے کچھ اصلاحات قبول کریں۔

۱۔ اس سلسلہ میں ہماری سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ ہم اس زبان کا نام "اردو" جو صرف سوڈیڑھ سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا ہے، یک قلم چھوڑ دیں، اس کا نام ہندوستانی رکھیں اور اسی کو شہرت دے کر عام کریں، دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم کے نام سے منسوب و موسوم ہوتا ہے، اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسا اجنبی نام جس سے قومی و ملکی جذبہ کو کوئی تحریک نہ پہنچے احتراز کے قابل ہے اور اس کے بجائے اس کا "ہندوستانی" نام ہندوستان اور وہ بھی ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ وطن کے نام کے تصور کے حامل ہونے کے سبب سے پوری طرح اپنے اندر ہمدردانہ جذبات کی روح رکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی زبان کا نام ہے جس کو پورے ملک سے تعلق ہے، اور وہ پورے ملک کی متحدہ زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ یہ ہندوستانی نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، مگر یہ واقعہ نہیں ہے ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں فرشتہ کی زبان سے یہ فقرہ آپ کو سنایا ہے

"بنوعے فارسی را خوب می گفت کہ تا بہ ہندوستانی متکلم می شد۔"

دیکھئے کہ اس زبان کا یہ نام قدیم ہے، شاہجہان کے دربار میں مغل خاں گویا کا نام اسی وصف کے ساتھ آتا ہے:

"دریں عہد سعادت عہد سر مد نغمہ سرایانِ ہندوستانی زبان است"۔ (بادشاہ نامہ لاہوری ۳ صفحہ ۵)

ہم اس نام کے ذریعہ سے ملک کے سامنے وہ تخیل پیش کریں گے جو ہندو مسلم کے مشترکہ وطن کے تصور کی ترجمانی کرے گا، اور مغلوں کی لشکری استیلا کی تاریخ سے جو لفظ "اردو" میں چھپی ہے، ہم کو نجات دے دیگا۔

۲۔ اُردو بول چال اور تقریر و تحریر میں اب تک عربی و فارسی کے جو لفظ آ کر رل مل چکے ہیں، اور وہ ہماری زبان کا جزو بن چکے ہیں، ان کے علاوہ فرہنگ اور قاموس دیکھ دیکھ کر نئے نئے لفظوں کو اب اس زبان میں رواج دینے سے پرہیز کرنا چاہیے الا یہ کہ علمی اصطلاحات یا کسی نئی چیز کے نام رکھنے کے لئے کسی نئے لفظ کی منتی مانگنے کی ضرورت پیش آئے۔

۳۔ لفظوں کی عربی اور فارسی جمع، اور واو عطف اور فارسی اضافتوں سے جہاں تک ہو سکے بچا یا جائے۔ اور انکی جگہ ہندوستانی جمع، اور واو عطف اور اضافت کو رواج دیا جائے۔

۴۔ ہندی کے اُن لفظوں کو جو ہندوستانی میں کھپ سکتے ہیں اکھپانے میں ضد اور ہٹ سے کام نہ لیا جائے، غالب اور مومن سے پہلے ہماری شاعری میں ہندی کے سینکڑوں اچھے اور پیارے لفظ تھے، جن کو خیال سے بے سبب باہر کر دیا گیا ہے، اب آج کل کی نئی تحریکیں، پرچار، پریم ادیب، سوراج، سماج اور ایسے بیسیوں لفظ ہیں جو ہمارے سیاسی مقرروں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں، اور وہ ہم کو اب اجنبی اور بیگانے نہیں لگتے۔

عزیزانِ جامعۃ المسلمین! یہ ادبی وعظ جو کافی حد تک لمبا ہو چکا ہے، بہتر ہے کہ اور لمبا نہ ہو، ہم اپنے اس طولانی بیان کی معافی چاہ کر آپ سے رخصت ہوتے ہیں۔

خطبۂ صدارت ہندوستانی اکاڈیمی

جو
۱۶ر جنوری ۱۹۳۷ء کو بمقام لکھنؤ ہندوستانی اکاڈیمی کی پانچویں اردو کانفرنس میں پڑھا گیا

لکھنؤ سے نسبت | شرفائے علم و ادب! کرم فرمائی کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی اس علمی و ادبی مجلس میں ایک حقیر کو پائیں سے اٹھا کر صدر میں بٹھایا، آپ کی اس ذرہ نوازی کی قدر اور بڑھ جاتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مجھے اس اعزاز کی دولت اُس سرزمین میں بخشی گئی ہے، جو ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں کا مرکز ہے خاکسار کو گو لکھنؤ سے وطن کی نسبت حاصل نہیں، لیکن گذشتہ چھبیس برس سے مجھے اس سے جو علمی و تعلیمی تعلق رہا ہے، وہ وطن ہی کے مانند ہے، اسی کی گود میں میرے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں میری تعلیم و تربیت ہوئی، اور اسی کی آب و ہوا میں میرا علمی و ادبی نشو و نما ہوا، اس لئے اس سرزمین کا ہر گوشہ میرے لئے مانوس اور اس چمن زار کی ہر کیاری میرے لئے نظر افروز ہے۔

مفارقت کے داغ | خوشی اور غم توام ہیں اس خوشی کے موقع پر اُن چند دوستوں کی یاد آتی ہے جو اس سال ہم کو اپنی دائمی مفارقت کا داغ دے گئے، اور جو خود اس بزم ادب کے رکن رکین اور باعث تزئین تھے، منشی پریم چند کا ماتم اسی وقت تک رہیگا

جب تک ہماری زبان میں ان کی کہانیوں کا ایک ورق بھی باقی ہے؛ وہ ہمارے ملک کے دیہاتیوں کے دل اور زبان تھے، دیہات کے دکھ درد کو ان کا دل جو محسوس کرتا تھا وہ اُنکے قلم کی زبان سے ادا ہوتا تھا، سادہ فقرے بے تکلف بیان، لیکن درد اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی کہانی، ان کا قلم ہمارے پرانے کیریکٹر اور قومی آن بان کا سچا قدر دان تھا

اصغرؔ مرحوم کی یاد دل سے کوئی کیونکر بھلائے، گو اُن کے جسم خاکی کا وطن گونڈا تھا مگر انکی شاعرانہ مقبولیت کا وطن اعظم گڑھ تھا، اسی ویرانے سے اُن کی شہرت کی بو نکل کر ملک کے چمن زاروں تک پہنچی، وہیں اُن کا پہلا دیوان مرتب ہوا، وہیں اُن کے شاعرانہ امتیازات کے جوہر کھولے گئے، اور وہیں سے اُن کا نشاط روح مطبوع ہو کر نشاطِ عالم کا باعث ہوا، وہ ہماری زبان کے ان شعراء میں سے تھے جنھوں نے ہندوستانی زبان کی موجودہ شاعری کا رُخ پلٹا ہے اور ایک نئے دورِ سخن کا آغاز کیا ہے

ان جوانوں کے ساتھ بوڑھے نیرؔ کے فضل و کمال سے ہماری محرومی بھی اس سال کا افسوسناک حادثہ ہے، وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے اور خود بھی شاعر اور شاعر سے بڑھ کر محقق فن تھے، ہماری زبان میں فرہنگ آصفیہ کے بعد دوسرا مکمل لغت نور اللغات ان ہی کے آزمودہ کار ہاتھوں نے ترتیب دیا، سب سے آخر میں لکھنؤ کے مایۂ ناز ادیب اور شاعر و مصنف نواب حسام الملک سید محمد علی حسن خاں طاہرؔ کا ماتم کرنا ہے، جن کے قلم اور زبان نے کم از کم پچاس برس تک شعر و سخن اور علم و ادب کا ہنگامہ برپا رکھا۔

لکھنؤ کے خدمات | آج ہم جس تاریخی شہر میں جمع ہیں، وہ گو ہمارے پورے ملک کی راجدھانی کبھی نہیں بنا لیکن یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ ہمارے علوم و فنون اور شعر و ادب کا مدتوں پایۂ تخت رہا ہے اور اب بھی ہے، شاہ پیر محمد صاحب جن کا ٹیلہ اور ٹیلے پر والی

مشہور ہے، یہاں کے سب سے پہلے عالم ہیں، عالمگیر کے عہد میں یہاں ہی سے فرنگی محل کو علم و فن کا وہ خاندان منتقل ہُوا جو صدیوں تک ہمارے علوم و فنون کا محافظ اور شیراز ہند پورب کا دار العلوم رہا، اور اس نئے زمانے میں مسلمانوں کی نئی عربی درسگاہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی یہیں بنیاد پڑی، یہاں کا خاندانِ اجتہاد پورے ملک کے طول و عرض پر تنہا حکمران ہے

دلّی کے باغ میں جب خزاں آئی، تو یہاں بہار کا دور آیا، اس اُجڑے باغ کے کتنے مرغ خوش لحن تھے جنھوں نے اڑ اڑ کر اس چمن کی شاخوں پر بسیرا لیا، ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلّی میں حاصل کی لیکن تہذیب اور سلیقہ یہیں لکھنؤ میں سیکھا۔

اودھ کی راجدھانی جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئی تو اس کو اور چار چاند لگ گئے، میر تقی میر، انشاء اللہ خاں انشا، جرأت اور مصحفی وغیرہ نے ادھر کا رخ کیا، میر انیس کا خاندان دلّی سے پہلے ہی آچکا تھا، ان بزرگوں کے دم قدم سے بادشاہوں کے دربار، امرا کی ڈیوڑھیاں اور اہلِ علم کی محفلیں شعر و سخن کے نغموں سے پُرشور بن گئیں، ناسخ و آتش، وزیر و صبا اور ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں نے شعر و ادب کے جواہر ریزوں کے ڈھیر لگا دیے۔

شعر و سخن کے چرچوں اور شاعروں کے لفظی جھگڑوں کو چھوڑ کر نفس زبان کی ترقی محاورات کی نزاکت، الفاظ کی تراش خراش اور اصول و قواعد کے وضع و تالیف کا جو اہم کام گذشتہ دو صدیوں میں یہاں انجام پایا، اُسی کا اثر ہے کہ اُس نے بولی سے بڑھ کر زبان کا درجہ پایا، ملک سخن کے دو اخیر فرمانروا انیس و دبیر نے شاعری نہیں کی، بلکہ اپنے نام کے زبان و ادب کے سکے ڈھال ڈھال کر اہلِ ملک میں تقسیم کرتے رہے،

ناسخ نے زبان کی نزاکت و لطافت میں وہ کام کیا، جو ہر ایک ہوشیار جوہری جواہرات کے نوک پلک نکال کر جلا دینے میں کرتا ہے، ان کے شاگرد والا جاہ میر اوسط علی رشک نے صحیح و غلط، ثقیل و سبک لفظوں کو اس طرح پرکھ کر الگ کر دیا کہ انکی پسند فصاحت کا معیار بن گئی، سینکڑوں الفاظ جو بول چال میں رائج تھے مگر شعر و انشاء کی بارگاہ میں اُن کو بار حاصل نہ تھا، ان کو خود اپنے شعروں میں نظم کر کے پھلنے پھولنے کیلئے سند پیدا کی، لکھنؤ میں غالباً یہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۲۵۶ھ میں اُردو لغت ترتیب دیا جس کا نام نفس اللغۃ ہے، سید انشاء اللہ خاں کے دریائے لطافت کا دھارا بھی یہیں بہا۔

شیخ امداد علی بحر المتوفی ۱۳۰۰ھ کی نسبت بھی مشہور ہے کہ انھوں نے کوئی لغت لکھا تھا، مگر اس کا سراغ نہیں ملتا۔

حکیم ضامن علی جلال جن کے دیدار کا شرف مجھے بھی حاصل ہے، اُن شعرا میں ہیں جنھوں نے زبان کو نہ صرف شاعری بلکہ وضع اصول اور تحقیقات کے لحاظ سے بھی مالامال کیا ہے، سرمایۂ زبان اُردو، مفید الشعراء، تنقیح اللغات، گلشن فیض اور قواعد المنتخب وغیرہ ان کی وہ کتابیں ہیں جو اردو زبان کا سرمایہ ہیں، منشی امیر احمد امیر مینائی کے شاعرانہ خدمات سے قطع نظر، امیر اللغات کے مصنف کی حیثیت سے ہماری زبان پر اُن کا بہت بڑا احسان ہے کہ اردو کے اس عظیم الشان لغت کے دو حصے الف ممدودہ اور الف مقصورہ تک چھپ سکے، ان کے جلیل القدر شاگرد نواب فصاحت جنگ جلیل سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ رام پور میں اس لغت کا پورا مسودہ موجود ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہماری زبان کی بڑی بدقسمتی ہوگی کہ ترقی کے اس روز بازار میں بھی مشتاقوں کی آنکھیں اس عروس فن کی دید سے محروم رہیں،

لکھنؤ نے شعر و سخن کے ذریعے سے اس زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ ہماری

علمی محفلوں کی بار بار کی دہرائی ہوئی کہانیاں ہیں، اور جو شہرت کی بناء پر زبان زد خاص و عام ہیں۔ مجھے اس شاہراہ سے ہٹ کر لکھنؤ کی وہ خدمتیں گنانی ہیں، جن کو اس دور کے قدردان بھول گئے ہیں، یا ہماری زبان کی تاریخ سے یہ اوراق گر کر کھو گئے ہیں۔

عہدِ جدید کی تابانی لکھنؤ کے افق میں

ہمارے ملک میں سات سمندر سے آکر جب اہلِ یورپ نے اپنے نئے علوم و فنون کی نمائش کی ہے تو یہ لکھنؤ کا وہ وقت تھا، جب وہ عیش و مسرت کی شراب سے بدمست تھا، اس وقت کس کو ہوش تھا کہ وہ دساور کی نئی چیزوں کی قدر کرے، اور بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کمائی اور اپنے گھر کی اندوختہ دولت میں جس پر اُن کو بڑا غرور تھا، باہر سے خرید کر کچھ اور قیمتی سامانوں کا اضافہ کرے، تاہم اس میخانے میں کچھ اہلِ ہوش بھی تھے، انھوں نے نئے اور پرانے کا جائزہ لیا، اور جو چیز اُن کے ہاں نہ تھی وہ فرنگستان کی دکان سے خرید کر لائے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ خاص حالات نے سرکار اودھ اور سرکار کمپنی کو متحد کر دیا تھا۔ اس کا اثر یہ تھا کہ انگریزی ریذیڈنٹ اور ان کا عملہ لکھنؤ میں اور سرکار اودھ کا وکیل کلکتہ میں اور کبھی کبھی لندن میں رہتا تھا، اس میل جول سے وہ عظیم الشان مشرقی اور مغربی تمدنوں کا سب سے پہلے یہیں پیوند لگا، اس زمانے کے ریذیڈنٹ اور انگریز حکام اردو اور فارسی میں پوری مہارت رکھتے تھے، نواب سعادت علیخاں کے دربار میں بیلی صاحب ریذیڈنٹ اور انشاء اللہ خاں کی ادبی نوک جھونک کی حکایتیں آبِ حیات کے ذریعہ مشہور عام ہیں۔ سرکار اودھ کی طرف سے وکالت اور انشاء کے منصب پر جو لوگ سرفراز ہوتے تھے وہ عموماً اہلِ علم کے طبقے سے ہوتے تھے، انگریزوں کے میل جول سے وہ بھی انگریزی علوم و فنون سے آشنا ہو جاتے تھے، اور بعض بعض تو کسی نہ کسی جدید علم میں مہارت پیدا کر لیتے

تھے، خان علامہ تفضل حسین خاں ان ہی لوگوں میں سے تھے، وہ گو رہنے والے سیالکوٹ کے تھے، اور ریاضیات اور متوسطات کی تعلیم دلی میں پائی، لیکن انتہائی تعلیم لکھنؤ میں ملا حسن فرنگی محلی سے حاصل کی، پہلے نواب سعادت علی خاں کے اتالیق مقرر ہوئے، پھر نواب آصف الدولہ نے انکو اپنا وکیل بنا کر کلکتہ بھیجا، اسی اثنا میں انھوں نے انگریزی اور لاطینی زبانیں سیکھیں اور جدید ریاضیات وہیئت کو حاصل کیا، نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں درس و تدریس اور تالیف و تصنیف کا مشغلہ جاری کیا، اور جدید علم ہیئت اور جبر و مقابلہ میں کئی کتابیں تصنیف کیں، ۱۲۱۵ھ میں وفات پائی۔

نواب محمد علی خاں کے زمانے میں منشی الملک فخر الدولہ دبیر الملک ہشیار جنگ رتن سنگھ زخمی نے علوم و فنون کی نئی بساط بچھائی، گو اُن کے بزرگوں کا وطن دہلی تھا، مگر ان کے فضل و کمال کی بہار لکھنؤ میں آئی، بادشاہ کے میر منشی تھے، قدیم علوم کے ساتھ جدید ہیئت و ریاضیات میں بھی ماہر تھے، انگریزی سیکھی تھی، حدائق النجوم انکی مشہور تصنیف ہے جو ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں تالیف پائی، نئے علم کے لئے نئی اصطلاحوں کا وضع کرنا ان کا خاص کارنامہ ہے، کہتے ہیں:

"باید دانست کہ چوں ایراد الفاظ زبانی و برطانیہ (انگریزی) بعینہ در کتاب فارسی و عربی مکروہ و غیر مانوس است و کتب عرب بجمیع مذاہب بطلیموس کم فیثاغورس نیز اگرچہ بعضے مطابق بانست لیکن بسیارے مخالف آنست و بہ نسخ جدید کہ تشکلے ازاں در تصانیف تدلر سیا نیست ناچار بوضع بعضے از اصطلاحات جدیدہ با تصرفے در لغات وجز آں چنانکہ عادت مترجمان قدیم ہنگام نقل علوم از یونانی بعربی بودہ است من ہم اقتضائے ایشاں کردم" (ص ۹)

ان ہی لوگوں میں ایک ذی فضل بزرگ منشی رائے منوں لال فلسفی کی ہے، ان کا وطن

سند یافتہ تھا، فلسفہ و حکمت کے علوم میں دسترس رکھتے تھے، نواب آصف الدولہ کے دربار میں نوکر تھے، دوسری تصانیف کے ساتھ علم حساب و جغرافیہ و ہیئت اور حکمت انگریزی میں رسائل یادگار چھوڑے ۱۲۴۸ھ میں وفات پائی۔

سرکار اودھ کی طرف سے جو علماء وقتاً فوقتاً لندن بھیجے گئے، اُن میں سے دو نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں مولوی محمد اسماعیل لندنی اور مولوی محمد حسین لندنی، ان دونوں نے یورپ کے جدید علوم و فنون سے اہل ملک کو آشنا کیا، مولوی محمد اسماعیل لندنی مراد آباد کے رہنے والے تھے، نواب نصیر الدین حیدر کی طرف سے سفیر لندن مقرر ہوئے تھے، منطق کی بعض پرانی کتابوں پر ان کے حاشیے ہیں ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی۔

مولوی محمد حسین کا ایک عربی رسالہ ندوہ کے کتب خانہ میں ہے، جس میں یورپ کے نئے علوم و فنون، جارج سیل کے ترجمۂ قرآن اور یورپ کے بعض اختراعات کا تذکرہ ہے۔

نواب نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ان دو کے علاوہ دو اور صاحب قابل تذکرہ ہیں مولوی عبد الرب اور مولوی کمال الدین حیدر، لکھنؤ میں جو یورپین علماء رہتے تھے اُن سے برابر ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں، اسی کا نتیجہ وہ رصدخانہ ہے جو ۱۲۴۷ھ میں شاہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں جنرل ولکاکس کی کوٹھی میں بننا شروع ہوا، اور محمد علی شاہ کے زمانے میں بنکر تیار ہوا، اس رصدخانے میں کرنل ولکاکس وغیرہ علماء کے علاوہ مولوی عبد الرب صاحب، مولوی کمال الدین حیدر صاحب اور مولوی اسماعیل صاحب مراد آبادی شریک تھے، اور اب یہ وہ مقام ہے جس میں امپیریل بنک کی عمارت قائم ہے۔

اب تک ملک میں جدید علوم و فنون کی اشاعت کی تاریخ میں لکھنؤ کا نام نہیں لیا جاتا تھا، حالانکہ شاہان اودھ کے زمانے میں لکھنؤ میں بھی ایک دار الترجمہ قائم تھا، نئے

علوم و فنون کی کتابیں یہاں ترجمہ ہوکر مطبع سلطانی سے شائع ہوتی تھیں، اس محکمے کی طرف سے انیس رسالے چھپ کر شائع ہوئے تھے، جن میں دس رسالوں کے نام مجھ کو معلوم ہیں اُن کی تفصیل میں نے معارف ۱۹۱۷ء میں کی ہے، یہ ہیئت، کیمیا، مناظر، اور طبیعیات اور اس کے اقسام، قوتِ مقناطیسی، علم الماء، علم الہوا، علم الحرارت وغیرہ سائنس کے مختلف علوم پر ہیں، لارڈ بروم (BROUGHAM ATTEATISEONTHEOBJEOTS, ADVANTAGES & PLEASURES OF SCIENCE) کا اردو ترجمہ مقاصد العلوم کے نام سے محمد علی شاہ کے زمانے میں چھپا، اور بھوپال کے دفتر عبیدہ تاریخ میں میری نظر سے گزرا ہے۔

لکھنؤ کی اس علمی دنیا کی مجلس کا نام اسکول بک سوسائٹی تھا، اور اسکی ایک جنرل کمیٹی تھی، جو کتابوں کے ترجمہ و اشاعت کا کام کرتی تھی، اور صدر خانہ سلطانی کا انگریز مہتمم ان ترجموں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ایک انگریز نے اردو میں فن زراعت پر کتاب لکھی تھی ضرورت ہے کہ لکھنؤ کی اس اسکول بک سوسائٹی کے مطبوعات کا پتہ چلایا جائے، اور آئندہ دلی سوسائٹی، اور فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جائے، اسی عہد کی ایک کتاب اردو حساب میں لوگارثم ہے جس کا ایک نسخہ ہمارے ہاں ہے۔

لکھنؤ کی ادبیات لکھنؤ نے اس کے بعد زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں افسوس ہے کہ ان کی کوئی مفصل تاریخ موجود نہیں، بادشاہوں کے زمانے میں داستان گوئی کا ایک مستقل فن تھا اور بڑے بڑے زباندان اور زبان آور بادشاہوں اور امیروں کے شبستانوں میں بیٹھ کر اپنی دلچسپ داستانوں سے بادشاہوں اور امیروں کے دل بہلایا کرتے تھے۔ حکیم ضامن علی جلال کے دادا بزرگوار حکیم اصغر علی اس فن کے ماہر تھے، اخیر زمانے میں اس فن پر کتابیں

بھی لکھی جانے لگیں، اس وقت کہانیوں کے کردار، دیو، پریاں اور جادوگر اور طلسم ساز ہوتے تھے۔ داستان امیر حمزہ، انوشیرواں نامہ، طلسم ہوشربا، ایرج نامہ وغیرہ مختلف ناموں سے ہزاروں صفحات میں خیالی ادب اور زور بیان کا ایک طلسم کھڑا کیا گیا، اس کتابی طلسم کا فاتح ہمارے ملک کا کوئی دوسرا انشاء پرداز نہیں کرسکتا۔ ان کتابوں کے مصنف جن کو خدا جانے کس مصلحت سے مترجم کا درجہ دیا جاتا ہے۔ امیر محمد حسین جاہ، منشی احمد حسین قمر، شیخ تصدق حسین اور تو تارام شایان وغیرہ ہیں۔ نظم و نثر کے ہزاروں صفحات حق یہ ہے کہ ہماری پرانی زبان کا بہترین نمونہ ہیں۔ نثر میں سرور کا فسانہ عجائب، اور نظم میں نواب مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم وغیرہ کی مثنویاں وہ جواہر پارے ہیں جن سے کبھی ادب اردو کی الماریاں سجائی جاتی تھیں۔

امانت کا اندر سبھا مدتوں تک اہل شوق کا تماشا گاہ رہا ہے، اور اب یہ بات پوری تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ یہ صرف شاعرانہ فسانہ نہ تھا، بلکہ واقعی لکھنؤ میں اندر کا یہ اکھاڑا لگتا تھا، اور اس کا تماشا پردوں کے ساتھ کھیل کر دکھایا جاتا تھا، اور اس طرح اردو میں ان جدید تماشوں اور ناٹکوں کی تمدنی بدعت بھی یہیں پیدا ہوئی۔

میں نے ہندوستانی ادب کی اس صنف کی یہ تمہیدی تاریخ اس لئے بیان کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ قدیم و جدید سے مل کر ہماری زبان میں ناولوں کی پیدائش کے لئے لکھنؤ ہی کی زمین کیوں موزوں ہوئی؟ جو شرر، سرشار، مرزا رسوا، سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ اور جوالا پرشاد برق کی تخلیق کا باعث ہوئی۔ شرر نے قومی تاریخ اور اصلاح معاشرت کے بعض موضوعات کو اور سرشار نے لکھنؤ کے آخری تمدن کے رسم و رواج اور طریق کو اور مرزا رسوا نے لکھنؤ کے ایک خاص طبقے کی خصوصیات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ انیسویں صدی کا اخیر عہد انہی کے دم قدم سے پر رونق تھا۔ لکھنؤ کے

اس ادبی دور میں سرشار کی سیر کہسار اور فسانۂ آزاد، شرر کی فردوس بریں اور مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا اور سجاد حسین کی حاجی بغلول، ادب اردو کی بہترین کتابیں ہیں۔

مطبعے | آجکل ادبیات کے سلسلۂ تاریخ کی ایک کڑی مطبعے بھی ہیں، لکھنؤ میں مطبع سلطانی کے علاوہ مطبع محمدیہ (۱۲۵۵ھ) بعہد محمد علی شاہ) محمد یعقوب، مطبع علوی علی بخش خاں (۱۲۶۳ھ) مطبع مصطفائی، محمد مصطفیٰ خاں (۱۲۷۱ھ) کانپور (۱۲۶۳ھ) مطبع محمدی محمد حسین لکھنوی (۱۲۶۲ھ) مطبعۂ جعفریہ حکیم مرزا جعفر خاں (۱۲۶۵ھ) مطبع امینی محمد عباس، مطبع صدیقی عنایت اللہ وغیرہ بہت سے مطبعے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مطبعے مطبع سلطانی سلطان المطابع کے قانوناً زیر نگرانی تھے، لوح پر اس کے مہتمم کپتان مقبول الدولہ احسان الملک مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر قبولِ ثابت جنگ کا نام باقاعدہ لکھا جاتا تھا یہ نام اس عہد کی مطبوعہ کتابوں پر اکثر لکھا ہوا ملتا ہے

مطبع مصطفائی اپنی صحت اور صفائی میں معیار کے بلند درجے پر تھا، علماء اور طلبہ اس کی چھپی ہوئی کتابوں کے قدردان تھے، اور اب بھی اس کی چھپی ہوئی کتابیں اہل شوق ہیں اشرفیوں کے مول خریدی جاتی ہیں۔

سب سے آخر لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب اسّی برس کے قریب پہنچ گئی ہے، اس سے میری مراد نولکشور کا مشہور نولکشور پریس ہے جو غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا، اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی علوم و فنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں اُن کا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کر سکتا ہماری زبان کی اکثر ادبی اور علمی کتابیں اسی مطبع سے چھپ کر نکلیں، شعراء کے دواوین، مثنویاں، قصائد، مرثیے، قصے، افسانے، داستانیں، اور درس کی عام کتابیں سب اسی کی کوششوں کی ممنون ہیں، تاہم غلط نویسی اور غفلت جو گزشتہ کا نتیجہ ہے، اس کی شہرت کے چہرے کا بدنما داغ ہے

شعرائے قدیم، میر، سودا، ناسخ، آتش، جرأت، مصحفی، انشا، رند، وزیر، صبا، انیس، دبیر، امیر، مونس، اسیر، اور آمیر وغیرہ کے دیوان اور کلاموں کے مجموعے اسی مطبع سے نکل کر دنیا کا اجالا ہوئے اور ملک کے گوشے گوشے میں زبان کی اشاعت کا سبب بنے۔

مطبع نیر بہادر بھی صدی کے وسط میں ادب کی اشاعت کا اچھا ذریعہ تھا۔

اخبارات | زبان کی اشاعت کا تیسرا ذریعہ اخبارات ہیں، ہمارا یہ شہر اس سلسلے میں بھی پیچھے نہیں رہا، یہ نہیں معلوم کہ یہاں کا پہلا اردو اخبار کون سا ہے، تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صوبے میں اردو کا پہلا روزانہ اخبار، اودھ اخبار یہیں سے نکلا اور جو آج تک نکل رہا ہے اس کے آغاز کی تاریخ ۱۸۵۸ء ہے، اور بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اخبار نے اس ملک کے مشہور ادیبوں کے پیدا کرنے اور ان کو پروان چڑھانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے، سرشار اور شرر دونوں اسی اخبار کے ذریعہ شہرت کے اسٹیج پر آئے۔

اردو کا سب سے پہلا کامیاب مذاقیہ اخبار اودھ پنچ بھی اسی شہر کے افق پر نمودار ہوا۔ سید سجاد حسین جن کی ملاقات کی عزت مجھے حاصل ہے، اس کے اڈیٹر تھے، یہ وہ اخبار ہے جس کے صفحات میں منشی احمد علی کسمنڈوی، منشی احمد علی شوق، میر اکبر حسین، اور نواب سید محمد آزاد وغیرہ ہماری زبان کے وہ پرانے ادیب جو نئے طور وطریق سے آگاہ تھے، روشناس ہوئے سنجیدہ اخباروں میں مشیر قیصر، مرتبہ مولوی غلام محمد خاں تپش (۱۸۸۳ء) اور آئینہ اور آزاد ہفتہ وار اخبار بھی گذشتہ صدی کے ادیبوں کی پیدا وار میں معین ہوئے، آزاد آخر میں اودھ پنچ کا ضمیمہ ہو گیا تھا، یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا، سجاد حسین مرحوم بے کار ہو چکے تھے اس وقت اس آزاد کی چند ماہ "شکمی" اڈیٹری کا فرض چند دوستوں کے ساتھ ملکر ہم نے بھی ادا کیا تھا۔

اردو کے سب سے پہلے آزاد سیاسی اخبار ہندوستانی نے بھی اسی شہر میں جنم لیا۔

گنگا پرشاد ورما اس کے اڈیٹر تھے، یہ اپنے زمانے میں کانگریس کے خیالات کا بہترین وکیل تھا، مولانا شبلی مرحوم جو خود بھی کانگریسی خیال کے تھے، اس کو بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اخبار یہ ہے۔

آج تو مسلمانوں میں بہت سے آزاد سیاسی اخبار ہیں، لیکن زمیندار کے بعد ۱۹۱۰ء میں اس صوبہ کا سب سے پہلا آزاد مسلمان سیاسی اخبار مسلم گزٹ بھی یہیں سے نکلا، جس کے اڈیٹر مرحوم وحیدالدین سلیم اور اس کے مشیر خاص اور مضمون نگار مولانا شبلی رحمہ تھے۔

رسالے: رسائل کے لحاظ سے بھی یہ شہر پیچھے نہیں رہا، میرے موجودہ معلومات کے لحاظ سے یہاں کا سب سے پہلا ادبی رسالہ محشر ہے، جو مولوی عبدالحلیم شرر کا پہلا ادبی کارنامہ تھا۔ یہ ۱۸۸۲ء میں نکل کر دو سال کے بعد بند ہو گیا تھا، ۱۸۸۶ء میں شرر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ دلگداز نکالا، جو اپنے زمانہ میں جدید طرز تحریر کا بہترین معیار تھا، یہی وہ رسالہ ہے جس نے ملک میں اردو کے بے شمار ادیب اور نثار پیدا کئے، نثر نویسی کا سلیقہ سب سے پہلے شرر ہی کی تحریروں سے ہمارے نوجوانوں میں پیدا ہوا۔

لکھنؤ کا ایک اور ادبی رسالہ ذکر کے قابل ہے، منشی نثار حسین کا پیام یار، یہ گلدستہ ایک زمانے میں شوق کے ہاتھوں سے لیا اور عزت کی آنکھوں سے پڑھا جاتا تھا، اس میں اس عہد کے بڑے بڑے شعراء امیر، داغ، جلیل، اور تسلیم وغیرہ اور ان کے باکمال شاگردوں کی غزلیں چھپتی تھیں، یہ انیسویں صدی کے اواسط میں حسن و عشق کا تنہا پیامبر تھا، جس کی باتوں کو سن کر خدا جانے کتنوں کو عروس سخن کا شیدائی بننا پڑا، اور صحیح زبان کے سیکھنے اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

اس عہد کا ایک اور ادبی رسالہ مرقع عالم ہے، جو حکیم محمد علی خاں کی ایڈیٹری میں ہردوئی

سے نکلتا تھا، اس کو دلگداز کا حریف سمجھنا چاہیئے، حکیم صاحب ناول نویسی میں بھی اپنے وقت میں شہرت رکھتے تھے، اور ان کا قلم وقت کا استعمال اور سینری دکھانے میں خاص ملکہ رکھتا تھا۔

اوپر کے صفحوں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس شہر کی انفرادی کوششوں کا ذکر تھا جنھوں نے اس زبان کو ملک میں مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا، لیکن اب جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے انفرادی کوششوں کے بجائے اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے، اب ہر چیز اسی پانی سے نشو و نما پا رہی اور بڑھ رہی ہے، اسی لئے زبان کی ترقی میں بھی اب شخصی کوششوں کے بجائے قوم کی یکجائی کوشش کی حاجت ہے، میں چاہتا تھا کہ ذرا تفصیل سے آگے کے کام کا نقشہ پیش کروں، مگر وقت کی کمی کا خیال کر کے اختصار کے ساتھ اپنا مدعا عرض کرتا ہوں

۱۔ ہم کو اپنا لٹریچر اس لئے ناچیز معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ہمارے سامنے ہماری پچھلی کوششوں کے ثمرات ایک جگہ نہیں ہیں، اس لئے ایک وسیع کتب خانے کا قیام نہایت ضروری ہے، اس غرض کے لئے میں یہ تحریک کرتا ہوں کہ ہندوستانی اکیڈیمی اگر پورے ہندوستان میں نہیں تو یوپی گورنمنٹ کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے آئندہ اسمبلی میں یہ تجویز پاس کرائے کہ برٹش میوزیم لائبریری کے اصول کے مطابق صوبہ یوپی کا ہر مطبع ہر کتاب کا ایک ایک نسخہ اس کے کتب خانے کے لئے کلکٹر ضلع کے دفتر میں پیش کرے۔

۲۔ ہم کو ہندوستانی زبان کی ترقی کے لئے اس پرانے خیال کو دل سے نکال دینا چاہیئے کہ یہ زبان، فارسی یا سنسکرت سے پیدا ہوئی ہے یا وہ کسی بھاشا کا ضمیمہ ہے، بلکہ وہ خود ایک مستقل زبان ہے جس کے الفاظ خود اسی کے ہیں، اور جس کے قواعد خود اسی کے ہیں، یہ نکتہ ذہن میں نہ رہنے کے سبب سے ہم میں سے بعض صاحبوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی لفظوں کی صحت اور غلطی کی پہچان عربی، فارسی یا ہندی اور سنسکرت سے کرتے

ہیں، اس اکیڈیمی کے ایک لائق صدر نے ہندوستانی میں موت اور روح وغیرہ لفظوں کو مؤنث ماننے میں اس لئے شک کیا کہ اصل سنسکرت میں وہ مؤنث نہیں، اسی طرح میں نے ایک دفعہ جب عربی "اثر" کی ہندوستانی جمع اثرات استعمال کی، تو الہ آباد کے میرے ایک لائق اور پرانے اہلِ قلم دوست نے مجھ سے کہا کہ عربی میں اُس کی جمع اثرات نہیں بلکہ آثار ہے، حالانکہ ہماری زبان میں لفظ اثر کی یہ دونوں جمعیں دو معنوں میں آتی ہیں، عربی میں آثار کے کچھ ہی معنی ہوں مگر ہندوستانی میں اس کے معنی قرینے کے ہیں، آثار یہ ہیں، آثار معلوم ہوتے ہیں، اور اثرات کا لفظ نتیجے کے معنی رکھتا ہے، اس لئے ہمیں ہندوستانی زبان کو مستقل زبان مان کر اس کی خودمختاری کا اعلان کر دینا چاہیئے۔

اسی طرح لفظ "اصل" کو دیکھیے جس کے معنی عربی میں جڑ کے ہیں، اس کی جمع عربی میں اصول ہے، مگر اردو میں اصول ایک مفرد لفظ کی طرح قاعدے کے معنی میں بولا جاتا ہے اور اس کی جمع اصولوں بنائی جاتی ہے، خود "قاعدہ" کے عربی معنی بنیاد کے ہیں، اس کی جمع قواعد ہماری زبان میں دو معنوں میں آتی ہے جب اس کو جمع بولیں تو اصول کے معنی میں مذکر اور جب مفرد بولیں تو نحو کی قواعد کے معنی میں وہ مفرد ہے اور مؤنث۔

"مواد" کا لفظ "مادّہ" کی جمع ہے، مادّے کے لغوی معنی ہیں پھیلنے والی چیز اور اصطلاحی معنی پیپ کے لیکن اب مواد کا لفظ ہماری زبان میں مفرد ہے، اور زخم کی آلائش کے معنوں میں ہے اور پیپ کے معنوں میں، اور کسی مضمون کے ضروری معلومات اور مسالے کے لئے بھی وہ بولا جاتا ہے۔

خود "مسالے" کی اصلیت عربی میں مصالح ہے اور وہ مصلح کی جمع ہے یعنی وہ چیزیں جو کسی کھانے کی اصلاح کے لئے اس میں ملائی جائیں، مگر اب وہ ہماری زبان میں مسالا

لکھا جاتا ہے (م س ال ا) اور لکھا جانا چاہیئے، اور اب وہ کھانے کے مسالے کے ساتھ ہر مضمون کا مسالا بن گیا ہے، عربی کا "مشعل" ہماری زبان میں مشال بن گیا ہے۔

ایسی ہی مثالیں ہندی سے بھی دی جا سکتی ہیں۔

۳۔ آخری مثالوں میں یہ بات بھی ہمارے بزرگ کچھ کچھ قبول کر چکے ہیں کہ عربی میں کسی لفظ کی اصلیت کچھ ہو اور اس کا املا بھی کچھ ہو مگر ہماری زبان کے استعمال میں اگر اس کا تلفظ اور املا بدل گیا ہے تو وہی غلط تلفظ ہماری زبان میں صحیح ہوگا، اب جیسے ہم مصالح کو مسالا اور مشعل کو مشال لکھنے اور بولنے لگے ہیں، بلکہ صحیح کو بھی ہم نے سہی کر لیا ہے، ذرہ زرہ اور طیار تیار اور خراط خراد ہو گیا ہے، تو کیا اسی قسم کی کمی بیشی ہم دوسرے لفظوں میں نہیں کر سکتے، فارسی والوں نے عربی کے مصدروں کے آخر میں سے ۃ کو نکال دیا ہے مثلاً مداراۃ سے مدارا، محاباۃ سے محابہ، یا تماشی کو تماشا، تجلی کو تجلا، یا اسم فاعل کے آخر سے ی کو گرا دیا، مثلاً محاذی کو محاذ کر دیا، اور اب ہم بھی محاذ بولتے ہیں، اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندوستانی ان میں تصرفات نہ کریں، جیسے جن مصدروں یا لفظوں کے آخر میں ع ہو ہم ہندوستانی لہجے میں اُن کو نہیں بولتے، تو اگر ان کو لکھنے میں بھی گرا دیا جائے تو برا کیا ہے جیسے اطلاع کو اطلا، اجتماع کو اجتما، اتباع کو اتبا، نزاع کو نزا، انتزاع کو انتزا مطلع کو مطلے اور منبع کو منبے وغیرہ۔

۴۔ دلّی اور لکھنؤ کے استادوں نے ہمارے لئے ایک اور مثال متروکات کی چھوڑی۔

انھیں نے لکھنے کو تجویز کیا تھا اردو والوں نے اس خیال سے اس تجویز کو پسند نہیں کیا کہ اس سے لفظوں کی اصلی حقیقت مٹ جائیگی، مگر ہندوستانی تحریک والوں نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا ہے۔ اب زمانہ آگے بتائے گا کہ یہ تجویز کہاں تک حسن قبول حاصل کرتی ہے۔

ہے۔ یعنی بہت سے لفظوں کو ثقیل یا نامانوس سمجھ کر چھوڑ دیا یا ٹکسال باہر کر دیا ہے جیسے تک تنبن، دکھلانا اور جتلانا وغیرہ، کوئی وجہ نہیں کہ آج بھی ہم اس اصول سے کام نہ لیں "نمط" کا لفظ مانند اور طرح کے معنوں میں پہلے بولتے تھے، مگر اب نہیں بولتے، اس لئے عربی، فارسی اور سنسکرت کے ان موٹے موٹے لفظوں کو جن کے کام میں لانے کی ضرورت سرے سے نہیں اور وہ اسی لئے بولے یا لکھے گئے، کہ اُن سے اُن کے لکھنے اور بولنے والے کی لیاقت ظاہر ہو، ان کو اپنی ڈکشنری سے الگ کر دیں اور ان کو ٹکسال باہر سمجھیں۔

۵۔ ان موٹے موٹے نامانوس لفظوں کے استعمال کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی ہے کہ بڑے بڑے اہل علم اور خصوصاً یورپ کے فاضل بہت سے معنوں اور چیزوں کے ٹھیٹ ہندوستانی لفظوں سے واقف نہ تھے، یا نہیں ہیں، وہ اُنکی جگہ پر عربی و فارسی کے لفظ جیسے تقاطر، اسطار اوائل، رلیعان، ید، شعور، بول کر اپنی ناواقفیت پر پردہ ڈالتے تھے، اور اب بھی ڈالتے ہیں، اسی لئے یہ ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ایک ایسا لغت لکھا جائے جس میں عربی و فارسی کے مشکل لفظوں کے مرادف ٹھیٹ ہندوستانی لفظ ہوں، اس کام کو لکھنؤ اور دہلی کے اہل زبان بہتر کر سکتے ہیں، اور پھر وہ لفظ پورے ملک میں پھیل سکتے ہیں۔

۶۔ اس قسم کا لغت نئی اصطلاحوں کے بنانے میں بھی کام آ سکتا ہے، آپ دیکھیں کہ چھاپے کا فن بالکل نیا ہے، اس کے سارے پرزے اور کام کی چیزیں سب نئی ہیں، مگر چونکہ یہ فن پڑھے لکھے ارباب لغت کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ ان پڑھ جاہلوں کے ہاتھوں میں رہا ہے اس لئے انھوں نے اس کے لئے کسی اکیڈیمی کی طرف رجوع کئے بغیر سارے لفظ اور اصطلاحیں بنا لیں جو سب کی سب ہندوستانی ہیں، یا ہندوستانی کر لی گئیں ہیں جیسے جس کاغذ پر لکھا گیا وہ کاپی، اسکی غلطیاں دیکھی گئیں تو تصحیح۔ ان غلطیوں کو کاتب نے

درست کیا تو ترمیم، اس کی نقل پتھر پہ سے اتاری گئی تو پروف، دوسری دفعہ اتارا گیا تو مطابق تیسری دفعہ دکھایا تو مطابق، چوتھی دفعہ دکھایا گیا تو مطابق، پتھر سے حروف، اڑ گئے تو چھپن گئے، کاپی کو گرم پتھر پر رکھ دیا۔ تو کاپی کو جمایا، کاپی کے حروف بگڑ گئے تو کچل گئے۔ غرض اسی طرح ان اَن پڑھوں نے اپنی ساری ضرورتیں پوری کر لیں اور اصطلاح بنانے والوں کی راہ نہیں دیکھتے رہے۔

۷ ہمارے ہندی کے دوستوں کو شکایت ہے کہ ہم ہندی کے لفظ قصداً چھوڑتے ہیں، حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ زبان کا سارا دارومدار لفظوں کے چلن پہ ہے، ہندو مسلمان آپس میں جتنا ملیں گے اُتنے ہی فارسی اور ہندی کے لفظ گھلیں ملیں گے، چنانچہ جب ہمارے بزرگ آپس میں خوب گھلے ملے تھے، دیکھئے کہ سینکڑوں ہندی کے لفظ مسلمانوں کی زبان اور سینکڑوں عربی و فارسی کے لفظ ہندؤں کے قلم پر چڑھ گئے، ولی کے زمانہ کی زبان دیکھیے، اس میں آج سے کتنے زیادہ ہندی لفظ ہماری زبان میں تھے، آج تو ہندوستانی میں فارسی عربی لفظوں کی ملاوٹ کے گنہگار مسلمان ہیں مگر ہندو مسلمان دونوں سے الگ سات سمندر پار کے ایک بے لاگ کی گواہی سنئے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ۱۹۲۹ء کے اڈیشن میں ہے۔

"اردو کا یوں شدید طور پر فارسیت آمیز ہو جانا ایرانی اثر سے زیادہ ہندی اثر سے تھا، اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے اسلامی تھا تاہم اس میں فارسی عنصر کو کثرت سے داخل کرنے والے اُن ایرانیوں یا ایرانی نژاد لوگوں سے زیادہ وہ ہندو عمال تھے جو حکومت مغلیہ میں ملازم اور فارسی داں تھے، کیونکہ وہ (ایرانی اور مغل) صدیوں سے اپنے علم و ادب کے لئے صرف اپنی ہی فارسی زبان استعمال کرتے آئے تھے"۔ (ص ۷۰۵ جلد ۱۱)

لیکن یہ بھی اسی لئے ہوا کہ فارسی تعلیم یافتہ ہندو عمال بکثرت مسلمان افسروں سے ملتے جلتے تھے، تو ان کے لفظ ان کی زبانوں پر چڑھ جاتے تھے، اسی طرح جو مسلمان صوفی، درویش اور عام لوگ بلکہ بادشاہ تک جو کثرت سے ہندوؤں سے ملتے تھے اُن کی زبانوں پر ہندی الفاظ بڑی آسانی سے چڑھ گئے تھے، آئین اکبری اور فارسی کی دوسری مغل تاریخوں اور صوفیوں کے ابتدائی دکھنی اور گجراتی ہندوستانی کلام میں اس کی جھلک معلوم ہوتی ہے آج سے صدیوں پہلے خواجہ صدرالدین کن مہنگ میں کہتے ہیں۔

اک روپ تھے انگیوں ہوئے بہُروپ ہر روپ میں دیکھا تو پکے رُوپ

جگ ہے تو یہ جگ دستا ہے سارا جگ بن تو سکل جگت اندھارا

جس جگ میں گیان کی ابھی جوت اس جگ کو سمجھے کہ سہوو لا یموت

میں مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک ہندو مسلمان مل کر ایک سیاسی تحریک میں شریک تھے ہر جگہ ملک وہ ہر مجمع میں جہاں ہندو مسلمان دونوں ہوتے تھے تقریریں کرتے تھے اس موقع پر اپنی تقریر کا اثر بڑھانے اور مجمع کو اچھی طرح سمجھانے کے لئے دونوں قوموں کے بانوفی اپنی چوٹی کا زور لگاتے تھے کہ اُن کی ہر بات دونوں سمجھ جائیں اب ہندو مجبور ہوتے تھے کہ ترک موالات بولیں اور مسلمان مجبور ہوتے تھے کہ اسہیوگ کہیں، چنانچہ اس زمانے میں سوراج، ہنراج، ساماج، اندولن، پرستاؤ، چناؤ، راج نیتک، سبھا پتی، کرپا، شانتی، سماج اور پریم کے لفظ بے تکلف بڑے بڑے جبہ و دستار والے بولنے لگے تھے ایسے ہی ہندو دوست عربی اور فارسی کے سیاسی لفظ بے اختیار استعمال کرنے لگے تھے۔

۸۔ اسی لئے میری یہ تجویز ہے کہ ایسے آسان ہندی لفظوں کا ایک لغت فارسی خط میں لکھا جائے اور ان کے ہم معنی ہندوستانی لفظ بتلائے جائیں تاکہ وہ آسانی سے ہندوستانی

میں شامل ہو سکیں۔

۹۔ ہم کو ہندو دوستوں سے بھی یہ کہنا ہے کہ وہ بھی ہندی کے بڑے بڑے لفظ بولنے سے بچیں، مجھ کو ہندو دوستوں کے ساتھ کبھی کبھی اُن کے جلسوں میں جانا پڑتا ہے، اور بعض بعض ایسے اناڑیوں کی تقریریں سنی ہیں کہ جن کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا ہے، اور اُس پر مزہ یہ کہ اس تجویز کی تائید بھی میرے ذمہ تھی۔

ہندو یونیورسٹی کے ایک ریسرچ اسکالر اپنے مضمون کی ضرورت سے میرے پاس اکثر آتے رہے، لیکن انگریزی کا سہارا نہ ہوتا تو میں نہ اُن کی سمجھ سکتا تھا اور نہ وہ میری! کیا مجھ کو اور اُن کو کوئی ایک دیس کا رہنے والا سمجھ سکتا ہے؟ ہندی جس طرح سنسکرت سے کٹ چھنٹ کر بنی ہے، اسی طرح ہندی سے کٹ چھنٹ کر ہندوستانی بنی ہے، اب ہمارے ہندو دوستوں کی یہ کوشش کہ پھر ہر ہندی لفظ کو اسی رُوپ میں بولیں جس میں وہ ٹھیٹ ہندی میں بولا گیا ہے، ایک طرح کا بڑا ظلم ہے، میں ایک مثال دیتا ہوں، لیکن کے معنی میں "پرنتو" ایک ہندی لفظ ہے، وہ اردو میں کٹ چھنٹ کر "پر" ہو گیا، اب اس جگہ پرنتو بول کر بنیے پن کی اڑائی کہاں تک درست ہے؟ ہر کلام میں "و" اور "اور" کی ضرورت کتنی دفعہ ہوتی ہے یہ "اور" ہندی کا لفظ ہے جس کو اردو نے قبول کر لیا ہے، مگر اس لئے کہ یہ اردو میں چل گیا ہے، اس کو چھوڑ کر "تتھا" بولنا کہاں تک اچھا ہے؟ "پانی" ہندی ہی کا لفظ ہے اور فارسی والے اتنے پرانے زمانے سے اس سے مانوس ہیں کہ سنائیؔ (۵۲۵ھ) اور سعدیؔ تک نے اپنی زبانیں اسی پانی سے سیراب کی ہیں، اگر اب لفظی چھوت کے ڈر سے پانی کا لفظ بھی آپ چھوڑ دیں اور "جل" پینے لگیں تو یہ کتنی بے گانگی ہے؟

۱۰۔ ہماری پرانی اردو میں جب وہ دکھنی یا گوجری یا ہندی کہلاتی تھی، ہندی کے

سیکڑوں پیارے اور میٹھے لفظ تھے جنکو اردو کے چلن سے بعض نفاست پسندوں نے نکال دیا، جیسے موہن، موہ، سجن، نچن، پریم، داس، ریت، بس، روگ، پریت، درپن، جگت، برہ، ٹک، نکھ، پی، چھب، پیا، لٹک، ادا، سنسار، دیا، چین، بیتم، ادھک (بہت)، ندھڑک (بے دھڑک)، نگر، آپاس، میا، (مروت)، نپٹ، درس (دیدار)، پربت وغیرہ، ان لفظوں کو دوبارہ کام میں لانا چاہیئے۔

۱۱- اس سلسلے میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ لفظوں کے لینے اور نکالنے میں عربی و فارسی و سنسکرت و ہندی کی ڈکشنریوں کو کسوٹی بنانا اور ان میں سے دیکھ دیکھ کر لفظوں کو چُننا اور کام میں لانا ہماری مشترکہ ہندوستانی زبان کے حق میں زہر ہے، اس کی سچی کسوٹی رواج اور چلن ہے! آج جو لفظ عربی، فارسی، ترکی، ہندی، مرہٹی، گجراتی، پرتگالی، اور انگریزی کے عام طور سے برتے جا رہے ہیں، وہ ٹھیٹ ہندوستانی لفظ ہیں، اُن کو اسی تلفظ کے ساتھ بولنا چاہیئے جس کے ساتھ وہ بولے جاتے ہیں، ہمارے نامور شاعر غالب نے نمبر کو لمبر باندھا۔

مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر تیرا!

اس سے محاورہ بنا۔ لمبر لے جانا، لمبر چھیننا، لمبر لگانا۔

"رپورٹ" انگریزی لفظ ہے، نقل نے والوں کی زبان میں یہ "رپٹ" ہو گیا، اور اُس کے خاص معنی ہو گئے۔ یہاں تک کہ لسان العصر اکبر نے کہا۔

رپٹ لکھوائی ہے یاروں نے جا جا کر یہ تھانے میں — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

دوسرے انگریزی لفظوں میں بھی اسی قسم کا تصرف کیا گیا ہے، اور وہی صحیح ہے، عربی اور فارسی لفظوں کا بھی یہی حال ہے، بلکہ خود عربی و فارسی زبانوں کا قاعدہ بھی یہی ہے۔

جس کو تعریب یا تفرس کہتے ہیں، اسی اصول پر سنسکرت اور ہندی کے لفظ بھی جس شکل میں ہندوستانی بولی میں آگئے ہیں اُن کو پھر سنسکرت اور ہندی کے اصلی روپ میں بولنے اور لکھنے کی کوشش بنی بنائی زبان کو بگاڑنا ہے، اور یہ کرنا ہے کہ دوسری قومیں اُن کی بات کو نہ سمجھ سکیں۔ آس کو آشا، برہمن کو براہمنڑ اور گن کو گنڑ کہنا ادبی پاپ ہے۔

عربی میں لفظ "شہوت" مطلق خواہش کے معنی میں ہے، جو کھانے پینے، مطالعہ کتاب ہر ایک کے ساتھ بولا جاتا ہے، مگر ہماری ہندوستانی میں ایک خاص معنی میں بولا جاتا ہے اور اس سے "اشتہا" بنایا گیا ہے جو کھانے کی رغبت کو کہتے ہیں، یہ بھی اس معنی میں عربی نہیں مگر یہ دونوں ہماری ہندوستانی کے لفظ ہیں اور صحیح ہیں۔

عربی میں "مشکور" اس کو کہتے ہیں جس کا شکریہ ادا کیا جائے، مگر ہماری زبان میں اس کو کہتے ہیں، جو کسی کا شکریہ ادا کرے، اسی لئے "مشکور" کی جگہ بعض عربی کی قابلیت جتانے والے اس کو غلط سمجھ کر صحیح لفظ "شاکر" یا "متشکر" بولنا چاہتے ہیں، مگر ان کی یہ اصلاح شکریہ کے ساتھ واپس کرنی چاہیئے۔

خود لفظ "شکریہ" کو دیکھئے اصل عربی ہے، مگر شکل عربی نہیں، اب اس سے ہم نے دو لفظ بنائے ہیں "شکر" اور "شکریہ"، خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، اور انسانوں کا شکریہ، وہ ناشکرا ہے جو زبان کی اس توسیع کی نعمت کی قدر نہیں کرنا چاہتا۔

۱۲: ہمارے علم و فن کے ماہروں کی ایک خو ہے کہ وہ اپنے لئے کسی لفظ کو اس وقت تک علمی اصطلاح بننے کے قابل نہیں سمجھتے جب تک اس میں بیگانہ پن اور موٹا پن نظر نہ آئے، مثلاً دو دریاؤں کا میل جہاں ہو اس کے لئے "ملتقی البحرین" یا دریا میں جہاں پانی بہنے کے سنگے جگہ ہو اس کو مورد کہیں گے، حالانکہ پہلے کو آسانی سے سنگم اور

دوسرے کو شگھٹ کہہ سکتے ہیں، ڈائل کو دھوپ گھڑی کی جگہ ساعت شمسیہ یا دائرہ شمسیہ کہنا ظلم ہے ہمارے عوام نے ریل، جہاز، ہوائی جہاز، گھڑی، گھڑی کی سوئی، سینکڑوں لفظ بنا لیے مگر ان کو قاموس دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوئی، ہم جانتے ہیں کہ علمی اصطلاحات میں دقتیں ہیں، مگر یہ آسانی سے ممکن ہے کہ اصطلاحات میں جہاں تک ہو غرابت سے بچا یا جائے۔

یہی حال ہندی کے بعض فاضلوں کا ہے کہ انھوں نے بھی بے ضرورتوں کے لیے سنسکرت اور ہندی کے شبد ساگر کا غوطہ لگایا، موتی اور پتھر جو اُن کے ہاتھ میں آ گیا اس سے ایک مصنوعی زبان بنالی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو دوست نے بتایا کہ ہندی کے شاعر ڈکشنری دیکھ دیکھ کر لفظ چنتے ہیں اور ان کو شعر میں باندھتے ہیں اور کہنے کے بعد خود بھی نہیں سمجھتے ہیں، کہ ہم نے کیا کہا۔ غرض کہنا یہ ہے کہ ہم ہندوستانی زبان کے لفظوں کے پرکھنے کی کسوٹی دوسری زبانوں کی ڈکشنریوں کی جگہ رواج اور چلن کو بنائیں، چلتے ہوئے سکوں کو قبول کریں اور کھوٹے کو پھینک دیں۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ اس ہندوستانی کو ہندو مسلمانوں کی ایک زبان بنانے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں مل کر اس کو اپنائیں اور جہاں تک ہو سکے اس کو آسان اور سب کی سمجھ میں آنے والی بنانے کی کوشش کریں، اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہندو مسلمانوں میں آپس میں بات کرنا بھی محال ہو جائے گا۔ انگریزی کے سہارے ریگا نگت کا خیالی پلاؤ پکانے والے کے بل پر دوقومی نظریے کی آرزو ہے۔

ہماری زبان کا نام

یہ تقریر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اُردو میں ۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء کی رات کو اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں کی گئی۔!

حضرات! قوموں اور زبانوں کی تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی، ان کا خمیر اٹھنے، مزاج بننے اور ایک صورت پکڑتے صدیاں لگتی ہیں۔

آج ہم جس ملک کو آسانی سے 'ہندوستان' کہہ دیتے ہیں، اور اس سے ہمالیہ کے دامن سے بحرِ شور کے ساحل تک کا علاقہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے مسلمانوں کی آمد سے پہلے نہ یہ نام تھا، اور نہ اس کی وسعت تھی، اور نہ مسلمانوں سے پہلے اس ملک کا کوئی ایک ایسا نام تھا جو اس پورے ملک کو بتا سکے جو پنجاب کی سرحد سے شروع ہو کر بنگال، مدراس اور بمبئی کے کناروں پر جا کر ختم ہوتا ہے، بلکہ انتہا یہ ہے کہ اس پوری قوم کے لیے بھی جس نے آج اپنے کو 'ہندو' کے نام سے ایک قوم بنا لیا ہے کوئی ایک نام نہ تھا، کہتے ہیں کہ اس ملک کے ایرانی ہمسایوں کی زبان میں اس ملک کا نام سندھو تھا، اور قدیم ایرانی اور سنسکرت زبانوں میں ہ اور س کا باہم مبادلہ ہو جاتا ہے، اس طرح سندھو ہندو ہو گیا، اس ملک کے دوسرے بحری ہمسایہ کی زبان میں دو لفظ تھے، السند اور الہند، کشمیر کی ترائی سے لے کر موجودہ سندھ کے کناروں تک کو وہ سندھ، اور گجرات اور راجستھان، باقی اندرونی ملک کو وہ "ہند" کہتے تھے، اس ہند نے یورپ جا کر انڈ کی اور انڈ نے انڈیا کی صورت اختیار کر لی

ہندوالوں کو عرب "ہندی" اور خراسانی "ہندو" کہتے تھے، اور عرب ہندی کی جمع "ہنود" اور خراسانی "ہندوان" بناتے تھے۔

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ان میں سے اہلِ عرب نے اس ملک کو ہند کا، اور اہلِ خراسان نے ہندوستان کا نام دیا، لفظ ستان جگہ یا زمین کے لیے فارسی اور سنسکرت دونوں میں بولتے ہیں، اس لیے ہندوستان ہندوستھان بھی ہو سکتا تھا۔

اس ملک میں جو بولی بولی جاتی تھی وہ بھی ایک نہ تھی، ہر صوبہ کی بولی الگ الگ تھی، لیکن مسلمانوں نے یہاں کی ہر بولی کا ایک ہی نام رکھا یعنی ہندی یا ہندیہ۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ اس سرزمین کا ایک نام ہند یا ہندستان اور یہاں کی رہنے والی قوموں کا ایک نام ہندو اور یہاں کی مختلف زبانوں کا ایک نام ہندی مسلمانوں نے رکھا، اور حقیقت میں یہ مسلمانوں ہی کی ذہنیت اور ذہانت تھی جس نے اس پوری سرزمین کو ایک ملک، اور یہاں کے رہنے والوں کو ایک قوم اور یہاں کی بولیوں کو ایک زبان سمجھنے کا تصور بخشا کیا۔

اس ملک میں عربی، ایرانی، فارسی اور ترک ترکی بولتے ہوئے آئے، مگر کچھ ہی دنوں کے بعد یہاں کے اصلی باشندوں سے گھل مل کر ملا جلا کر یہیں کی سی کوئی زبان بولنے لگے جس کا نام انھوں نے ہندی یا ہندوی رکھا، ورنہ ہندی نام کی کوئی زبان اس ملک میں ان کے آنے سے پہلے نہیں بولی جاتی تھی، اس زبان نے ترقی شروع کی تو گجرات میں اس کو گوجری، دکھن میں دکھنی اور اودھ میں اودھی کہنے لگے لیکن صوبائی ناموں کو چھوڑ کر پورے ملک کی اس ملی جلی بولی کا نام ہندستان کی نسبت سے ہندستانی بھی پکارا جانے لگا میں نے آج سے چند سال پہلے یہاں ہندوستان میں "ہندستانی" کے نام سے جو مقالہ پڑھا

تھا، اس میں ہندوستانی نام کے پرانے تاریخی حوالے پیش کیے ہیں۔

شاہجہان کے زمانہ میں جب دہلی شاہجہان آباد بنی تو شاہی قلعہ یا بازار کے لیے ترکی لفظ "اردو" اردوئے معلّیٰ کی توصیفی ترکیب سے رواج پایا۔ اور صوبوں کی دیسی بولیوں کے لیے اس اردوئے معلّیٰ کی شاہی بولی کا ڈھنگ اس زبان کی صحت اور صفائی کا معیار بنا، اور اس طرح اس نئی معیاری بولی کو اضافت کے ساتھ "زبانِ اردوئے معلّیٰ" کہنے لگے، اور آج سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے زبانِ اردوئے معلّیٰ کی لمبی ترکیب کے بجائے "زبانِ اردو" یعنی اُردو کی زبان بنی، اور پھر اس سے بھی مختصر ہو کر "اُردو" ہوئی۔

جب انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکا تو فورٹ ولیم میں سیاست کے کھلاڑیوں نے علم و دانش کے پانسے پھینکے، دور بینی سے ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جدوجہد کے بعد ایک قوم بنی تھیں جس کا تمدن جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی، اس کو پھر دو قوموں میں بانٹ کر علیحدہ علیحدہ کیے جانے کی کوششیں شروع کیں اور ہندی اور ہندوستانی یا اُردو زبانیں بنا کر ایک کے لیے پنڈت اور دوسری کے لیے منشی اور مولوی نوکر رکھ کر دو زبانوں کے لیے سامان درست کر لیا، ابھی اٹھارہویں صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگروں کے منتر سے اُردو اور ہندی کے دو خاکی پتلے فولادی سپاہی بن کر ملک کے طول و عرض میں کٹنے مرنے لگے۔

ہندو بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے وہ آزاد ہو چکے ہیں تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہیے، اس بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت کارآمد ثابت ہوئی، اور سب سے پہلے اس کا اثر زبان کے معاملہ میں ظاہر ہوا، اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہوئی، اور

بعض صوبوں میں یہ کیا گیا کہ اُردو خط تک عدالتوں سے خارج کر دیا گیا، اور اب یہ تحریک یہاں تک زور پکڑ رہی ہے کہ یہ کوشش کی جارہی ہے کہ اس صوبہ کے چند شاعروں نے جس بھاشا میں کچھ مذہبی نظمیں کبھی لکھی تھیں وہی ملک کی زبان بنادی جائے۔

لیکن اس کے برخلاف ملک کے بہت سے سمجھدار ہندو اور مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ایک ہزار سال کی محنت میں جس زبان کو پیدا کیا اور بڑھایا اور یہاں تک پہنچایا وہی ہمارے دیش کی زبان ہو اور ہندو مسلمان دونوں قوموں کے میل ملاپ کی پہچان ہو۔

بہرحال اب صورت یہ ہے کہ ملک کی اس زبان کی جگہ جس کو ہم بولتے ہیں اور جس کو ہمارے بزرگ ہندی یا ہندوی کہتے تھے ہندو بھائی زبردستی اپنی ایک خاص زبان اور خاص رسم الخط کو ہندی کہنے لگے اور اس نام کو اس زبان کے معنی میں اتنا انھوں نے برتا کہ وہ انھی کی چیز ہوگئی، اور مسلمانوں نے بھی غیرت کے مارے غیریت برتی، اور خوشی سے یہ نام ان کے حوالہ کر دیا، اور اپنی زبان کو پہچان کے لیے ہندی یا ہندوی کہنے کے بجائے اردو کہنے لگے اور اس طرح سارے ہندوستان کے میدان کو چھوڑ کر صرف اُردوئے معلی کی چہار دیواری میں سمٹ کر رہ گئے۔

یہ حالت دیکھ کر آج سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین ہال میں سب سے پہلے یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس زبان کا نام 'اردو' کے بجائے جو اٹھارھویں صدی کے خاتمہ کی ایجاد ہے جب واقعی ہندوستان کی شاہی سمٹ کر اردوئے معلی کے صحن ایوان میں محدود ہوگئی تھی، اس کو واقعی طور سے اس کے پرانے نام ہندوستانی سے یاد کیا جائے، جو اُس وقت کا نام ہے جب ہندوستان کی شہنشاہی سارے ملک ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی، تاکہ یہ زبان پورے ملک کی مملکت کا دعویٰ کر سکے۔

مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ یہ تجویز ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے ہے، یا ہندوؤں کا یہ سمجھنا کہ یہ اُن کو دھوکا دینے کے لیے سازش کی جالہ ہی ہے بدگمانی کی انتہا ہے۔

یہ تحریک خالص لسانی اصول و مبادی کی بنا پر اٹھائی گئی ہے، جس کے بہت سے سبب ہیں، میں ان میں سے ایک ایک کو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔

۱۔ اس زبان کے دو پرانے نام تاریخوں میں ملتے ہیں، زیادہ تر ہندی یا ہندوی، اور اس کے بعد ہندوستانی، اب چونکہ ہندی کا نام ایک خاص زبان اور رسم الخط کے لیے بولا جانے لگا ہے، اس لیے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو اس زبان کے لیے خاص کرنا چاہیے، جس کو اب غلطی سے "اردو" کہنے لگے ہیں۔

۲۔ دنیا کی ساری یا اکثر زبانوں کے نام قاعدہ یہ ہے کہ زبان اس قوم کی نسبت سے مشہور ہوتی ہے، جو اس کو بولتی ہے، یا اس ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہے، جس میں وہ بولی جاتی ہے، اسی اصول کی بنا پر عرب کی زبان عربی، فارس کی زبان فارسی، ترکستان کی زبان ترکی، انگلستان کی انگلش، فرانس کی فرنچ، جرمن قوم کی جرمن، ترکی قوم کی ترکی وغیرہ کہی جاتی ہے، اسی اصول کے مطابق اس زبان کو جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی جاتی ہے، ہندوستانی کا نام دینا چاہیے۔

۳۔ ایک شائستہ اور مہذب زبان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آجائے، جس کو اس زبان سے نسبت ہے، نہ یہ کہ زبان کا نام لینے کے بعد اس کے ساتھ ایک تاریخی یا تعریفی فقرہ اضافہ کیا جائے، جس سے اس کے جنم بھومی کی کہانی معلوم ہو، لفظ "اردو" سے اس قسم کی کوئی مدد ذہنِ انسانی کو نہیں ملتی۔ اس لیے اس کی جگہ اس کے اصلی نام ہندوستانی کو رواج دینا چاہیے۔

۴- ہم کو اپنی بولی کا ایک ایسا نام رکھنا چاہیئے جس کے سننے کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس پورے ملک کی بولی ہے، لفظ اردو کے ساتھ اس قسم کا کوئی تصور ذہن میں نہیں آتا، برخلاف اس کے ہندستانی نام بولنے کے ساتھ پورے ملک کا نقشہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے اور اس کے پورے ملک کی بولی ہونے کا یقین منطق کی آمیزش کے بغیر، صرف نفسیاتی اثر سے ہمارے اور ہر سننے والے کے دل کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

۵- اس زبان کو ایک غیر متعلق بدیسی لفظ سے موسوم کرنے سے ہر اجنبی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ جیسا بدیسی نام ہے، ویسی ہی بدیسی زبان بھی ہوگی، اور ہم کو اس کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ایک لمبی تقریر کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے یہ نقص ہندستانی نام قبول کرنے سے فوراً دور ہو جاتا ہے۔

۶- ہم کو اپنی زبان کے لیے ایک ایسا نام چاہیئے جس سے ملک کے ہر صوبہ کو برابر کی نسبت ہو، تاکہ ہر صوبہ اس کو اپنے وطن کی بولی سمجھے اور قرار دینے کا برابر کا دعویٰ کر سکے لفظ اردو میں یہ بات نہیں، یہ بات ہندستانی کو حاصل ہے جس کی بنا پر صرف لکھنؤ اور دہلی ہی نہیں بلکہ بمبئی، مدراس، لاہور، کلکتہ، پٹنہ، پشاور سب کو اس کی ملکیت کا حق پہنچتا ہے اور سب کو اس سے یکساں ملکی اور وطنی محبت معلوم ہوتی ہے اور کسی صوبہ میں وہ اجنبی اور بے گانہ نہیں قرار دی جا سکتی ہے۔

۷- لفظ اردو میں ایک فوجی تسلط اور شخصی شہنشاہی کی تاریخ چھپی ہوئی ہے جس سے مرعوبیت کے سوا کوئی محبت کا جذبہ نمایاں نہیں ہوتا اگر ہم اپنے پیارے ملک کی نسبت سے اس زبان کو پکاریں، تو اس نام سے ہر ہندستانی کے دل میں وطنی محبت کا جذبہ ابھر سکے گا۔

۸- اس ملک کا نام ہندوستان مسلمانوں کے آنے کے بعد پڑا اسی طرح یہ بولی بھی

مسلمانوں کے اس ملک میں آنے اور اس ملک کے لوگوں سے میل جول پیدا ہونے کے بعد نکلی، اس لیے اس بولی کا نام ہندوستانی رکھنا مناسب ہے تاکہ تاریخی مناسبت کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے برابر کے میل جول کی کہانی بھی ہم کو ہمیشہ یاد رہے۔

۹۔ لفظ اُردو سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مسلمان ترکستان و خراسان سے کوئی بولی لے کر یہاں آئے تھے، جس کو وہ ترکی میں اردو کہتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبانیں اور تھیں اور یہ وہ بولی ہے، جس کو انھوں نے ہندوستان آ کر اختیار کر لیا۔ یہ واقعہ اس بولی کو ہندوستانی کے اصلی اور صحیح نام سے پکارنے سے ساری دنیا کے سامنے روشن ہو جاتا ہے اور اس کے بدیسی پن کا بے جا شبہ دور ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ اس زبان کو اُردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ناواقف گرامرین اس کی صرف و نحو کو عربی و فارسی کی صرف و نحو سے جانچ کر اس کے اصول بنانے لگے اور انھوں نے اس غلط طریق و روش کی بنا پر بہت سی غلطیاں کیں اور اس کے جوڑوں کو عربی و فارسی قاعدوں سے جوڑنے لگے گو اب ہماری زبان کے نئے نحویوں نے اس غلطی کو ہر طرح سے دور کرنے کی کوشش کی، مگر ابھی تک بات حلق سے نیچے نہیں اترتی ہے۔ اب اس کو عام طور سے ہندوستانی کہہ کر پکارنے سے اس زبان کی صرفی و نحوی اور لغوی تحقیقات کا رُخ ایران و خراسان و ترکستان کی طرف سے مڑ کر ہندوستان کے صحیح قبلہ کی طرف ہو جائے گا اور اس سے زبان کی اصولی و نحوی تحقیقات کی بہت سی راہیں کھلیں گی۔

۱۱۔ اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ پورے ملک کی مشترکہ زبان ہے تو اس دعویٰ کی اس سے زیادہ مضبوط دلیل کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ اس کا نام ہندوستانی ہے اس کے اس پرانے نام کو رفتہ رفتہ بھلا دینے سے غلط طور کی ہمدردی کر کے ہم نادانستہ اس کے دعویٰ کی بنیاد

کھوکھلی کر رہے ہیں۔

۲۱۔ چونکہ شروع شروع میں جو پرتگالی یا اسپینی یا انگلے یورپین یہاں آئے بلکہ خود انگریزوں نے بھی اس زبان کو صحیح طور سے ہندوستانی کہا تو ہم میں سے اکثروں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، حالانکہ اس زبان کا یہ نام ہم اپنے ہندوستانی کے مقالہ میں بتا چکے ہیں کہ بادشاہ نامہ اور تاریخ فرشتہ تک میں موجود ہے فرشتہ میں عادل شاہ ثانی والیِ بیجاپور کے متعلق ہے کہ "تا بہ ہندوستانی متکلم نمی شد" شاہجہان کی درباری تاریخ بادشاہ نامہ میں ہے "نغمہ سرایانِ ہندوستانی زبان" تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں، اس لیے یہ شبہ دور ہو جانا چاہیے کہ اس زبان کا یہ نام فرنگیوں نے رکھا ہے، بلکہ یقین کرنا چاہیے کہ ہندی کے بعد ہماری زبان کا یہ وہ نام ہے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا، اور ہم کو بھی اس نام کو باقی رکھنا چاہیے۔

۲۲۔ اہل نظر سے چھپا نہیں کہ اس زبان کی صحیح تاریخ کے سمجھنے میں میر امن دہلوی سے لیکر سر سید، بلکہ آزاد مرحوم تک سے غلط فہمی ہوئی کہ یہ لشکری بولی ہے یا بازاری۔ جیسا کہ میر امن کا بیان ہے:

> "جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں جمع ہوئے، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان مقرر ہوئی۔"

> جب حضرت شاہجہان صاحب قرآن نے ..... شہر دہلی کو اپنا دارالخلافت بنایا ..... اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلّیٰ خطاب دیا۔

سر سید نے بھی حکایت شاہجہان کے عہد کی نسبت لکھی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اُردو کہا کرتے تھے، اس غلطی کا سبب صرف لفظ اُردو ہے، اس لیے اس نام کو باقی رکھنا اس غلط تاریخ کا باقی رکھنا ہے اور اس کی اصلی تاریخ کو جو اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، برباد کرنا ہے۔

۴۱۔ بعض دوست کہتے ہیں کہ چونکہ نہرو رپورٹ اور پنڈت جواہر لال نے اپنی آپ بیتی میں "ہندوستانی زبان" کی اکثریت کو تسلیم کیا ہے اور اپریل ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور میں "ہندی یعنی ہندوستانی" کی تجویز منظور ہو گئی ہے اور ان سب سے مراد "ہندی" ہے، اس لیے ہندی اور ہندوستانی ہم معنی لفظ ہو گئے ہیں، اس لیے ہم کو اس لفظ سے پرہیز کرنا چاہیے۔

میری عرض یہ ہے کہ یہ تو مسلمانوں کی بے احساسی سے ایسا ہوا، شاہ عبدالقادر صاحب کے زمانہ تک اردو کا نام ہندی مشہور تھا اور سر سید نے آثار الصنادید کے طبع اول میں اُردو کے لیے ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے، اور اسی کو ہندی کہتے تھے۔ ہندی والوں نے اس لفظ پر ایسا قبضہ کیا کہ آپ کو اس نام پر سے ملکیت کا دعویٰ اٹھا لینا پڑا، اب ایک لفظ "ہندوستانی" رہ گیا تھا جو خالص طور پر اردو کے معنوں میں ہمیشہ استعمال ہوا ہے، اگر آپ اس کو بھی چھوڑ دیں گے تو دوسروں کے قبضہ مخالفانہ سے وہ ہرگز نہیں بچ سکتا۔ یہی وقت ہے کہ آپ معاملہ کی سنجیدگی کو سمجھیں اور اپنے قبضہ سے خود ہاتھ اٹھا لینے کا گناہ نہ کریں، ہم اپنے ہمگمان دوستوں کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے اصرار سے اور مسلمانوں ہی کی طفل تسلی کے لیے رکھا گیا ہے۔ اور اس سے مراد ہماری وہی زبان ہے جو ہماری عام بول چال میں ہے، ہم کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے

کہ ہندی اور ہندوستانی کو ہم معنی اور مترادف کیوں ٹھہرایا گیا ہے، افسوس ہے کہ ایسے مسئلہ کو جو سراسر ادبی اور لسانی ہے، غلط طور سے سیاسی بنایا جارہا ہے، جذبات سے خالی ہو کر واقعات اور دلائل پہ غور کرنا چاہیئے اور وہ قدم اٹھانا چاہیئے جو ہماری زبان کی حفاظت اور ترقی کا باعث ہو۔

یہ تجویز کسی تحریک و تائید اور رائے شماری کی غرض سے نہیں پیش کی جارہی ہے، اور نہ اس طرح سے ادبی و لسانی مسئلوں کا فیصلہ ہوتا ہے، بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ اپنی زبان کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے۔ اس قسم کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ وہ رائے عام کو متاثر کر لیتی ہیں، اُردو کا نام اردو کسی ایک شخص یا کانفرنس نے رکھا، یہ تو پہلے کسی کسی کی زبان پہ آیا پھر بڑھتا اور پھیلتا گیا، یہاں تک کہ سب پہ چھا گیا، غور کیجیے کہ ابھی چند سال ہوئے کہ اس خیال کو کہ اردو کا موزوں نام ہندوستانی ہے آپ کے درمیان پیش کیا گیا اور کبھی کبھی مضمونوں میں ادھر اشارے کیے گئے، اتنے پہ یہ نام مدراس وغیرہ کے رسالوں میں چھپنے لگا، اور کہیں کہیں اس کا چرچا ہونے لگا، یہاں تک کہ آج اس کھلے اجلاس میں اس پر بحث تک نوبت پہنچ گئی ہے، غرض ضرورت مباحثہ اور مناظرہ کی نہیں ہے، بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اپنی زبان اور قلم سے اس کا استعمال شروع کر دیں، اس سلسلہ میں ہماری مدد سب سے زیادہ اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹر کر سکتے ہیں، امید ہے کہ وہ ادھر توجہ فرما کر اپنی زبان کے قدیم نام کو زندہ کر کے پچھلے سو برس کی غلطی کو دور کر دیں گے، اور ثابت کر دیں گے کہ ہندوستان کی عام زبان کا نام "ہندوستانی" ہی ہونا زیادہ موزوں ہے، اور یہ وہی زبان ہے جو عام طور سے ہم ہندوستانیوں کے

بول چال میں ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اُردو کا علمی نام ہندوستانی رکھنے کی تحریک آج کل کی زبانی کشمکش کا نتیجہ ہے بلکہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی ناگپور میں جس ساہتیہ پرشد نے اپنا فیصلہ سنایا، آج سے چھبیس ۲۶ برس پہلے ۱۹۱۰ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں مرزا عزیز مرزا مرحوم نے بعینہ یہی تحریک پیش کی تھی اور اس کے بعد ساہتیہ پرشد کے اجلاس سابق سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین میں یہ تجویز دوبارہ پیش کی گئی تھی۔

یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی زبان میں کوئی ایسی تبدیلی کر لیں جس سے وہ ہندی یا ہندی کے قریب بن جائے حاشا کلا، اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ بعینہ اسی اردو، اسی زبان، اسی بول چال کو جو ہم بولتے ہیں، ہم ہندوستانی کہتے ہیں۔

ہم کو اس سے بھی اختلاف نہیں کہ اس زبان کا گھریلو نام اردو باقی رہے لیکن علمی طور پر اس کے پرانے نام ہندوستانی ہی کو رواج دیا جائے ہمارے بزرگوں نے اس زبان کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا، ایک کا نام ریختہ جو غزل کی زبان تھی، اور دوسرے کا نام ہندی رکھا تھا، جو عام بول چال کی زبان تھی، ہندی کا لفظ چھن گیا، اب جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اس کے پرانے نام ہندی کی جگہ اس کے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو رواج دیجئے خواہ اپنی غزلوں کا نام ریختہ کی جگہ اُردو ہی رکھئے۔ اس میں کچھ حرج نہیں اگر اپنی علمی، تعلیمی، وطنی اور سیاسی تحریکات میں عام طور سے اس کو ہندوستانی کے صحیح نام سے یاد کر کے ثابت کیجئے کہ یہ پورے ملک ہندوستان کی زبان ہے اور اس کا یہی نام اس پورے ملک کی زبان ہونے کی دلیل ہے۔

ہم اس فریب میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس صحیح نام ہندوستانی کے رواج دے دینے سے ہماری زبان کی ساری مشکلیں ختم ہو جائیں گی گویا یہ نام کوئی جادو کی چھڑی ہے جس کے گھماتے ہی ساری بلائیں دور ہو جائیں گی، بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آج جب ہم اپنی زبان کی اصلی پوزیشن کو دنیا پر واضح کرنے اور اس کے ہمہ گیر تخیل کو ثابت کرنے، اور اس کو سارے ملک کی زبان بنانے کا تہیہ کر رہے ہیں، تو ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اس کو اس کے اس نام سے روشناس کرائیں جس سے اس کی اصلی حیثیت واضح ہوتی ہے اور پورے ملک کی اس کے اندر سمائی ہوتی ہے۔ اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعی اس پورے ملک کی زبان ہے، اور جو اس پورے ملک کی زبان بننے کی مدعی ہو اس کا یہی نام ہونا چاہیئے۔

ہم کو امید ہے کہ اس زبان کے بہی خواہ اس تحریک کی تائید کریں گے، اور بحث و مناظرہ کے بجائے جو افسوس ہے کہ ہر مفید تحریک میں ہماری عادت ہو گئی ہے، عملاً اس کے رواج دینے کی کوشش کریں گے، تاکہ اس کا جو نام صرف خواص کو معلوم ہے، وہ ہی عوام میں پھیل جائے۔

ابھی مولوی عبدالحق صاحب نے آپ کے سامنے جو صدارتی خطبہ پڑھا ہے اس میں انگریزوں کے پرانے اقتباسات انھوں نے پیش کیے ہیں، آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ان میں ہر جگہ اس زبان کا نام یورپ کے سیاحوں، تاجروں، کمپنی کے حاکموں، ... نے لکھے ہندوستانیوں کی زبان، ہندوستانی ہی آیا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کا اصلی نام پہلے یہی مشہور و معروف تھا، جو اب عام طور سے متروک ہو رہا ہے، ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اسی مرتے ہوئے نام کو دوبارہ جلانا ہے۔

ہماری زبان

بیسویں صدی میں

(یہ مضمون نومبر ۱۹۳۶ء میں ایک ادبی مجلس کی صدارتی تقریر کے طور پر لکھا گیا تھا۔)

ہمارے ادبی محققوں نے اپنی زبان کی پرانی تاریخ کی تحقیق اور ترتیب میں جو کاوشیں کی ہیں وہ شکریہ کے قابل ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ ہم ماضی اور مستقبل سے قطع نظر کر کے حال پر توجہ کریں۔

اس میں شک نہیں کہ اس صدی کے آغاز سے لے کر آج تک ہماری زبان نے جو ترقی کی ہے، وہ کئی پچھلی صدیوں کی ترقیوں سے زیادہ ہے۔ کسی زندہ زبان کے جو اجزا اور عناصر آج سمجھے جاتے ہیں (یعنی اخبار، رسالے، چھاپہ خانے، کتابیں، کتب خانے) ان میں سے ہر ایک چیز کی حیثیت سے اس زبان نے اس حد تک ترقی کی ہے، جو مایوسی سے بالاتر اور تسلی کے قریب قریب ہے۔

پچھلی صدی کے خاتمہ اور اس نئی صدی کے شروع میں، ملک والوں میں اور خاص کر مسلمانوں میں اس زبان کی ترقی کے وجوہ یہ نظر آتے ہیں۔

۱۔ سرسید کی تحریک۔

۲۔ تعلیم کی عام اشاعت۔

۳- مذہبی تحریکات

۴- اردو ہندی کے جھگڑے

۵- سیاسی تحریکات

۶- جامعۂ عثمانیہ کا قیام

۷- قومی زبان کا تخیل

۸- آمد و رفت کی سہولت

سرسید کی تحریک سرسید کی علمی و تعلیمی تحریکات کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری زبان لکھنؤ اور دہلی کی قید سے باہر نکلی، ملک کے گوشے گوشے میں ہر لکھے پڑھے شخص کو اس زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی اجازت ملی، اور ہر جگہ اس کا چرچا پھیلا، نئی نئی کتابیں جو صاف ستھری سادہ اردو میں لکھی جاتی تھیں، وہ لوگوں میں اس زبان میں لکھنے پڑھنے کا ولولہ پیدا کرنے لگیں، اور ہر جگہ ان کی نقالی ہونے لگی، کچھ دنوں کے بعد نقل نے اصل کی کیفیت پیدا کر لی۔

ابتدائی تعلیم کی عام اشاعت ابتدائی تعلیم کی زبان حکومت نے ملک کی زبان کو قرار دیا، اس لیے دیہات سے لے کر شہر وں تک ابتدائی تعلیم کے جو مکتب اور اسکول کے مدرسے کھولے گئے۔ ان کے لیے نصاب کی کتابیں اردو میں لکھی اور لکھوائی گئیں۔ اور وہ بچوں کے نصاب میں داخل ہوئیں، اس سے زبان کی ترقی اور اشاعت کو بہت بڑی مدد ملی۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کام پنجاب نے اور اس کے بعد صوبۂ متحدہ نے کیا۔

مذہبی تحریکات اردو زبان کی اشاعت میں مذہبی تحریکات کو بہت بڑا دخل ہے، ردِ بدعت کی جو تحریک شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے اٹھی تھی، اس نے رفتہ رفتہ پورے ملک کو چھا لیا، اسی کی خاطر قرآن و حدیث کے ترجمے ہوئے، عقائد

پر کتابیں لکھی گئیں، ردِ بدعات پر رسالے تالیف ہوئے، اور توحید خالص کی اشاعت پر مسلسل تحریریں چھپتی رہیں، اس سلسلہ کی پہلی کڑی شاہ عبد القادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ قرآن اور شاہ اسماعیل صاحب کی تقویۃ الایمان ہے، اور ان کے بعد ان کے ساتھیوں اور ہم خیالوں نے عوام کی درستی اور عوام تک پہنچنے کے لیے اسی زبان کو اپنی تحریکات کا ترجمان بنایا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہماری زبان میں ہر علم و فن سے زیادہ مذہبی علوم و مسائل کی کتابیں ہیں۔

اُردو ہندی کے جھگڑے اردو ہندی کی لڑائی بھی پچھلی صدی کے خاتمہ اور نئی صدی کے شروع میں شروع ہوئی۔ نئی صدی کا پہلا سال (۱۹۰۱ء) تھا، کہ لکھنؤ کے پُرانے گنگا پرشاد ورما لائبریری میں نواب محسن الملک کی صدارت میں اُردو زبان کی حمایت کا جلسہ ہوا، اس وقت مرحوم نے اُردو کی طرف اشارہ کرکے یہ مصرع پڑھا تھا۔ ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

قضا کا کرنا ہوا کہ اس دھوم دھام میں مردہ عاشق کفن پھاڑ تابوت سے نکل کر اُٹھ بیٹھا، اور آج وہ "عہدِ شباب" کی اس منزل میں ہے کہ ہم آپ اس وقت اس کی برات میں شامل ہیں۔

غرض اس اردو ہندی کے جھگڑے نے مسلمانوں کو اس زبان کی حفاظت اور ترقی کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا اور اس کے نتیجہ کے طور پر ۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، اور ان ٹھوس علمی کاموں کا سلسلہ بڑھا اور پھیلا، جو گذشتہ صدی میں صرف سرسید کی تحریک کے دائرہ میں محدود تھا۔

سیاسی تحریکات ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۳ء تک ملک میں جو مختلف سیاسی تحریکیں پھیلیں۔

انھوں نے اس زبان کی اشاعت میں بہت بڑی مدد دی، جنگ طرابلس، جنگ بلقان، جنگ عظیم، خلافت اور کانگریس کی یکے بعد دیگرے تحریکوں نے اخبارات کی اشاعت، روزانہ اخباروں کی پیداوار اور ملک کے صوبہ صوبہ میں جلسوں کی کثرت، اردو بولنے والے رہنماؤں کی تقریریں، اور ہر صوبہ کے ممبروں کے بار بار اجتماع اور جلسوں کے انعقاد نے اس زبان کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا، اور اردو کے بہتیرے مقرروں، محرروں اور قومی شاعروں کو پیدا کر دیا، اور ترک موالات نے یہ سمجھا دیا کہ بدیسی زبان کو چھوڑ کر اپنی زبان اختیار کرنا ترقی کا راز ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کا قیام ہمارے ملک میں جب نئی تعلیم کا آغاز ہوا تو پہلے پہلے اردو ہی تعلیم کا ذریعہ بنی تھی، چنانچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ڈاکٹری کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی، دلی کالج وغیرہ قدیم و جدید طرز کے جو نئے نئے مدرسے بنائے گئے تھے، ان میں ریاضیات اور طبیعیات کی تعلیم بھی دیسی زبان میں دی جاتی تھی، مگر دفعۃً انگریزوں نے تعلیم کا رُخ بدل دیا اور انگریزی کو تعلیم کا ذریعہ ٹھہرایا، اور انتہائی تعجب ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی والے سر سید احمد خاں نے بھی بالآخر یہی سمجھا کہ جدید علوم کا سمندر اردو کے کوزہ میں نہیں سما سکتا، یہ تخیل کچھ اس مضبوطی سے دلوں میں جم گیا کہ اسکول، کالج، یونیورسٹی اور جدید علوم وفنون کا تخیل انگریزی کے سوا کسی اور زبان میں آتا ہی نہ تھا، یہ حالت ۱۹۱۶ء تک قائم رہی، ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد میں ایک یونیورسٹی کے قیام کا خواب دیکھا گیا، جس میں تعلیم کا ذریعہ اردو ہو، اس تجویز کے بلند بانگ مدعیوں کو تو سب جانتے ہیں، مگر وہ خاموش رہنما جس کے دماغ میں یہ تجویز سب سے پہلے آئی، اور جس نے حیدرآباد کے ارباب بست وکشاد کو سمجھا کر اس کے ابتدائی مدارج طے کرائے، ان کی رہنمائی کی اس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، وہ وہ مولانا حمید الدین

صاحب مرحوم سابق صدر دار العلوم حیدرآباد دکن ہیں، اللہ کی رحمت اُن پر ہو، شروع شروع تو سب کو بڑا اچنبھا ہوا، مگر آہستہ آہستہ تعجب حیرت سے اور حیرت امکان سے، اور امکان عمل سے بدل گیا۔ دار الترجمہ قائم ہوا، اور جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا، ہزاروں اصطلاحات پیدا ہو گئے، سینکڑوں کتابیں ترجمہ ہو گئیں، اور اب اس کا وجود مادری زبان میں تعلیم کے امکان اور فائدہ کی مستقل اور مجسم دلیل ہو گئی، دوسرے صوبوں پر بھی اس کا اثر پڑا، جامعات میں اردو کو مناسب جگہ ملنے لگی، اور دوسری یونیورسٹیوں میں بھی مادری زبان میں تعلیم کا مسئلہ آگے بڑھنے لگا۔

قومی زبان کا تخیل جدید تعلیم اور قومی تحریکات کی ترقی نے یہ نکتہ بتا دیا ہے کہ ہندوستان کی مختلف قوموں اور صوبوں کو ایک کرنے کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے جو ہماری قومی زبان بن سکے، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اُردو جو دِلّی کی محدود زبان اب ہندوستانی بن کر ہندوستان کی عام زبان بن چکی ہے، ہندوستان کا سنجیدہ طبقہ بھی اس زبان کو کم از کم پنجاب، یوپی اور بہار میں عملاً اپنی قومی زبان سمجھتا ہے، خواہ وہ اس کو کسی خط میں لکھتا ہو، اس تخیل نے ہماری زبان کی ترقی میں اچھی خاصی مدد کی اور دور دست صوبوں میں جہاں مقامی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں، وہ قومی زبان کی حیثیت سے قبول کی جاتی ہے۔

آمد و رفت کی سہولت ہم نے اس زبان کی ترقی میں ایک اہم سبب کو ابتک بھلا دیا، جس کو پہلے بتانا چاہیے تھا، یعنی ملک کے دور دراز حصے آج ڈاک اور آمد و رفت کی سہولت کی بنا پر گھر آنگن بن گئے ہیں، پنجاب کے لوگ بنگال اور بنگال کے لوگ بہار اور یوپی میں سندھی گجرات، اور گجراتی مدراس میں آ جا رہے ہیں، ایک شخص پٹنہ اور سے کلکتہ اس طرح

پہنچتا ہے کہ اس کو سرحد، پنجاب، سندھ، بہار اور بنگال پانچ صوبے دو دن میں طے کرنے پڑتے ہیں، ہر اسٹیشن پر اس کو اترنا، چڑھنا، لینا دینا، ملنا جلنا، اور بولنا چالنا پڑتا ہے، اور اگر ہماری خوش قسمتی سے طرفین میں سے ایک یا دونوں انگریزی کا کوئی حرف نہیں جانتے تو یہی ہندوستانی اس سفر میں ان کی زندگی کا سہارا بنتی ہے اور لازمی طور سے مشترک ہندوستانی زبان کی ترقی کا ہر قدم اس آمد و رفت کی سہولت سے ہر روز آگے بڑھ رہا ہے۔

غرض یہ اسباب ہیں جنھوں نے ایک مشترک ہندوستانی زبان کے تخیل کو واقعہ بنا لیا ہے اور وہ بولی جو کبھی کی ضرورتا سے شروع ہوئی تھی، اب پورے ملک کی زبان ہوگئی ہے۔

زبان کی ترقی کے اصول اور معیار

بیسویں صدی میں ہندوستانی نے جو ترقی کی ہے اس کے جانچنے کا معیار ہمارے پاس یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ وہ تعلیمی، اخباری، کتابوں کی تعداد، کتب خانوں کی وسعت اور جغرافی پھیلاؤ کے لحاظ سے کہاں تک بڑھی ہے۔ ذیل کے صفحوں میں ہم اسی معیار پر اس زبان کی ترقی کو جانچتے ہیں، اگرچہ پورے اعداد و شمار کے موجود نہ ہونے کے سبب سے یہ روداد پوری مکمل نہیں، تاہم یہ دھندلا بیان بھی اس قابل ہے کہ ہم اس کوشش پر اپنی مسرت کا اظہار کریں۔

تعلیمی ترقی

اس مدت میں ہماری زبان دلی اور لکھنؤ کے حدود سے نکل کر ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گئی ہے۔ پشاور سے لے کر کلکتہ تک وہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں کے اسکولوں اور مکتبوں میں پڑھائی جاتی ہے، وہاں کی یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اکثر کالجوں میں اس کی ایک کرسی ہے اور ایم اے کے امتحانوں تک اس میں ڈگری کی سند دی جاتی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی، بمبئی یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اس کے پروفیسر مقرر ہیں، اور ان میں ایک مستقل زبان کی حیثیت سے اس کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ تعجب کی بات ہے کہ ابھی تک اس زبان کو انہی شہروں کی تعلیم گاہوں میں اس اعتبار اور استناد کی عزت نہیں ملی ہے جو اس زبان کے مولد و منشا ہیں یعنی لکھنؤ، دلی اور آگرہ کی یونیورسٹیوں میں اس کی یہ علمی حیثیت ابھی تک تسلیم نہیں ہوئی ہے، اور اس موقع پر حضرت عیسٰیؑ کے اس فقرہ کی سچائی پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ "نبی بے عزت نہیں مگر اپنے وطن میں۔"

کیا یہ سن کر حیرت نہ ہوگی کہ جاپان میں مشرقی زبانوں کی جو سرکاری درسگاہ ہے اس میں ہندوستانی کی تعلیم بھی باقاعدہ دی جاتی ہے، دلی کے نور الحسن برلاس صاحب اس کے پروفیسر ہیں، ابھی علی گڑھ کی گذشتہ اردو کانفرنس کے موقع پر اس درسگاہ کے ایک جاپانی استاد پروفیسر گامو پہلی دفعہ ہندوستان آئے تھے، اور علی گڑھ کی کانفرنس میں موجود تھے، اور اردو خاصی بولتے اور لکھتے تھے، روس میں بھی اس کی تعلیم کا اہتمام ہے، اور جان نکوف صاحب نے اردو کے سلسلے لکھے ہیں، لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں بھی اس کی تعلیم کا بندوبست ہے، اس وقت گراہم بیلی صاحب لندن یونیورسٹی میں اس کے پروفیسر ہیں، پیرس یونیورسٹی میں اس زبان کی پروفیسری بہت پرانے زمانے سے ہے، دتاسی صاحب کا نام ہماری زبان کی تاریخ میں نہایت ممتاز ہے۔

ابھی جامع ازہر کے مصری وفد کی زبانی یہ خوشخبری بھی آپ کو مل چکی ہے، کہ عنقریب جامع ازہر میں ہندوستانی زبان سکھانے کے لیے ایک درجہ کھولا جائے گا، لیکن ان سب سے زیادہ اس کی تعلیمی ترقی کی بلندی یہ ہے کہ دکن میں جو ایک مسلمان ریاست ہے اس کا

جنم بھوم ہے اس کی بڑی یونیورسٹی قائم ہے جہاں ہر علم و فن کی تعلیم کا وہ تنہا ذریعہ ہے

ہمارے عربی مدرسے جو خیبر کے دروں سے لے کر بحر ہند کے کناروں تک پھیلے ہیں

ان سب کی تعلیمی زبان ہندوستانی ہے جس کو ان کے ہر دیس کا طالب علم یکساں سمجھتا ہے۔

اردو کے مکتب اور ابتدائی مدرسے گاؤں اور دیہاتوں میں قائم ہیں، لیکن یہ افسوس کے

قابل ہے کہ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرف سے ان کو وہ امداد نہیں ملتی جس کے وہ

مستحق ہیں، تاہم وہ اس زبان کے بولنے والوں کی ذاتی کوششوں سے جیسے تیسے چل

رہے ہیں، مجھے مدراس کے بہت سے دور دراز قصبوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے جہاں

یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے خاصی اردو بولتے اور پڑھتے تھے، ملاتور، وانمباڑی

عمر آباد اور ترچناپلی میں اردو زبان کے مدرسوں اور مکتبوں کا معائنہ کیا ہے اور کامیاب

پایا ہے میسور میں بھی اردو اسکول اور اردو ٹریننگ کالج ہیں مسلم یونیورسٹی نے ان کیلئے

جن کی مادری زبان اردو نہیں، اردو کا کورس مقرر کیا ہے، اور وہ پڑھایا جاتا ہے۔

ہندوستانی کی جغرافیائی وسعت | اس بیان سے آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کی زبان پورے ملک

میں کس طرح چھائی ہوئی ہے مسلمان عالم اور واعظ جو عام طور سے یوپی، دلی اور اس کے

اطراف یا پنجاب کے ہوتے ہیں وہ بنگال، گجرات، کاٹھیاواڑ، بمبئی، سندھ اور مدراس تک

جاتے ہیں وہ ہندوستانی بولتے ہیں، ان کی تقریروں اور وعظوں میں ہزارہا لوگ شریک ہوتے

ہیں اور مقرر و واعظ کی زبان کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، وہاں کی عام اسلامی کانفرنسیں اور انجمنیں

اسی زبان میں تجویزیں لکھتی ہیں، تقریریں کرتی ہیں، اور رودادیں چھاپتی ہیں، سرحد کی پہاڑیوں

سے لے کر بحر ہند کے کناروں تک ہندوستانی کے اخبار اور رسالے چھاپے جاتے

ہیں اور پڑھے جاتے ہیں، ہندوستان کے ہر گوشہ میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے

اور کہیں بھی مجھے اپنی زبان کی بے زبانی کا اقرار کرنا نہیں پڑا ہے ۔

ملک سے باہر جہاں کہیں بھی نکلا، سیاح کو اس زبان کے نقشِ قدم ملتے گئے، کابل گیا تو وہاں کے بادشاہ سے وزراء اور درباریوں تک اس زبان میں بولتے یا سمجھتے ہوئے ملے، عراق، حجاز اور بیت المقدس (فلسطین) میں ہندی زائروں اور حاجیوں کی آمد و رفت کے سبب سے اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے ہیں، خصوصاً حجاز میں تمام دوسری اسلامی زبانوں سے زیادہ یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، عدن میں نہ صرف یہ بولی جاتی ہے بلکہ یہاں ہندیوں کے لئے ہندوستانی کے مکتب اور اسکول ہیں، یمن کی ریاست مکلا میں ملاحوں کی زبان سے اردو سنی، افریقہ کے اطالوی مقبوضہ مصوع میں اترا، تو گجراتی تاجروں سے ہندوستانی ہی میں بات چیت ہوئی، اسکندریہ کے بازار میں اس کے بولنے والے پائے، سویز کے ملاحوں کو کام چلاؤ اردو بڑی تیزی سے بولتے سنا، کیمبرج یا آکسفورڈ کی انڈین مجلس میں بھی جس میں ہندوستان کے ہر صوبہ کے ہندو، مسلمان، پارسی اور عیسائی طالب علم تھے انگریزی کے بعد ہندوستانی ہی زبان عام اور مشترک زبان پائی، اور اسی میں تقریر کی ۔

غرض ایشیائے وسطیٰ سے ایشیائے اقصیٰ تک اردو زبان کا سکہ چلتا ہے، ادھر بخارا، خیوا، قندھار، غزنی، کابل، سمرقند، بدخشاں سے کاشغر تک اور ادھر چین، جاوا، ملایا اور سنگاپور تک کے طالب علم ہمارے عربی مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں، ندوہ لکھنؤ، دار العلوم دیوبند، امینیہ دہلی، جامعہ ملیہ دہلی، مدرسہ عبد الرب دہلی، مدرسہ عالیہ رامپور اور جامعہ عربیہ ڈابھیل گجرات وغیرہ میں مختلف اسلامی ملکوں کے باشندے اسے پڑھتے ہیں، اور یہاں چند سال کے قیام میں ہندوستانی زبان اچھی طرح سیکھ لیتے ہیں، اور اس کو تحفہ کے طور پر اپنے ملکوں میں لے جاتے ہیں ۔

ترکستان و خراسان و کابل کے طالب علم پہلے بھی ہندوستان کے عربی مدرسوں میں پڑھنے آتے تھے، مگر چونکہ ان مدرسوں میں ہندوستانی زبان کی ادبی تعلیم کا شوق نہ تھا اس لیے وہاں کے طالب علم بول چال کی زبان تو سیکھ لیتے تھے، لیکن اس زبان میں لکھنے پڑھنے سے عاری رہتے تھے، لیکن دار العلوم ندوہ اور جامعہ ملیہ نے چونکہ تعلیمی مضامین میں اس کی اہمیت بھی رکھی ہے اس لیے اس کے نتیجے سامنے ہیں، ندوہ میں مولوی عبدالرحمن صاحب کاشغری نے اردو ضرب الامثال پر بہت سے مضامین لکھے ہیں اور مثل مادری زبان کے اس کو برتتے ہیں، جامعہ میں چین کے بدرالدین نے اردو زبان ایسی سیکھی کہ چین کے مسلمانوں پر خود اپنے قلم سے کتاب لکھی ہے اور جو دار المصنفین میں چھپی ہے ابھی میرے پاس ختن کے ایک ندوی طالب علم کا خط آیا جس کو پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی، ندوہ کے جاوی طالب علم ندیان نے اتنی اردو سیکھ لی ہے کہ میرے رسالہ رسولِ وحدت کا جاوی میں ترجمہ کیا، اور اب خطبات مدراس کا ترجمہ کر رہا ہے، محمد حسن مالدیپی، مالدیپ کے رہنے والے ہیں، ندوہ سے پچھلے سال فراغت پائی، اردو خوب سیکھ لی۔ ابھی چند روز ہوئے مالدیپ سے ان کا اردو خط آیا، تو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، سماترہ کا ایک نوجوان محمد صابر ندوہ میں ہے جو ایسی اردو جانتا ہے کہ اردو کتابوں اور رسالوں کا ترجمہ اپنی زبان میں کر لیتا ہے۔

ابھی ہمدرد جامعہ دہلی میں ایک مضمون کے سلسلہ میں یہ اطلاع نکلی ہے:۔

"جامعہ میں بہت سے غیر ملکیوں نے اردو خوب سیکھی، ابھی چند سال پہلے جزائر مالدیب کے ایک طالب علم محمد دیدی یہاں تھے، یا تو وہ اردو کا ایک حرف نہیں جانتے تھے، یا رنگین عبارتیں لکھنے لگے، کالج میں ایک جاوی ہیں محمد عثمان و سوید، وہ جماعت کا سارا کام اردو میں کرتے ہیں معاشیات، تاریخ، دینیات وغیرہ مضامین خالص اردو

میں لکھتے ہیں، احمد بدرالدین حبشی تو ان سب کے سردار ہیں ..... محمد بن عبدالقیوم افریقی بھی مدرسۂ ابتدائی کے بڑے ہوشیار ہونہار طالب علم ہیں، ان پر بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ افریقی ہیں " (دسمبر ۳۶ء ص ۳)

گذشتہ علی گڈھ اردو کانفرنس کی صدارتی تقریر میں نواب مہدی یار جنگ بہادر نے فرمایا تھا:-

"جنوبی افریقہ سے حال میں ایک ڈیلیگیشن آیا تھا، ان سے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ جو ہندوستانی لوگ اس ملک میں آباد ہیں، وہ ہندوستانی بولتے ہیں، مارشس میں بھی ہندوستانی بولتے ہیں "

مارشیس کا مجھے بھی تھوڑا سا ذاتی تجربہ ہے ۱۹۲۸ء کی جولائی میں میں فرانس کی صحت گاہ وشی میں تھا، میں فرانسیسی سے بالکل نابلد تھا، اتفاق دیکھئے کہ اس انجان شہر میں مجھے مارشیس کے دو ہندی طالب علم ملے، جو پیرس میں ڈاکٹری پڑھنے آئے تھے ان کے مورث غدر کے زمانہ میں ہندوستان سے بھاگ کر اس جزیرہ میں چلے گئے تھے، وہ اتنے دنوں اور نسلوں کے بعد بھی ہندوستانی زبان سمجھ لیتے تھے۔

مارشیس میں اردو کے اسکول بھی ہیں، اور علماء اور واعظ وہاں جا کر اسی زبان میں تقریر کرتے ہیں، یہی دوسرے جزائر ہند کا بھی حال ہے، رنگون ان اطراف میں اردو زبان کا مرکز بن رہا ہے۔ جہاں کے بازاروں میں ہندوستانی عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے اور وہاں ہندوستانی کے اسکول اور کتب خانے قائم ہیں۔ برہما کے ایک ہندوستانی مضمون نگار (سیکرٹری مسلم کمیٹی رنگون) کا یہ بیان دلچسپی سے سنا جائے گا۔

"یہاں کے اکثر شہروں اور خصوصاً رنگون کی شہری زبان اردو ہے، کسی ملک کا

بسنے والا ہو شہر میں داخل ہونے کے ساتھ اُس کو اردو کا جاننا ضروری ہے۔ وہ ہر بازاری چیز کے لیے اردو ہی میں گفتگو کر سکتا ہے، اکثر غیر ممالک کے لوگوں کا خصوصاً ہندوستان کی ہر زبان بولنے والی قوم کا خلط ملط جس قدر برہما میں ہے اس قدر ہندوستان کے کسی شہر میں آج تک نہ ہو سکا، اور یہی وجہ ہے کہ اسی ملک کی بدولت ہندوستان کے ان مقامات تک اردو پھیل گئی جہاں شاید ایک عرصہ دراز تک پھیلانا سخت مشکل تھا، مدراس، کوکناڈا، ترچناپلی، ناگورا وغیرہ جیسے مقامات کے لوگ برہما کی کثرت سے آمد و رفت کی وجہ سے اس قدر آسانی کے ساتھ اردو بولتے ہیں، کہ آج وہاں کے جس دیہات میں چلے جائیے عام طور پر اردو جاننے والے ملیں گے، چٹاگانگ کی بہت بڑی آبادی جس کا برہما سے تعلق ہے، اردو سے مانوس ہی نہیں بلکہ اردو کی معاون و مددگار رہی ہے، مالابار میں بھی اسی ملک کی بدولت اردو کی کافی اشاعت ہو چکی ہے ...... یہاں چینی قوم بھی کثرت سے آباد ہے۔ اس کا ایک ایک بچہ اردو جانتا ہے اور بولتا ہے۔ یورپین ممالک کے لوگ بھی کثرت سے موجود ہیں، اور ہندوستانی ہی زبان میں کاروبار کرتے ہیں۔" (اجمل بمبئی یکم دسمبر ۱۹۲۶ء)

ہندوستان کے تین احاطے، مدراس، بنگال اور بمبئی ایسے ہیں، جہاں ہندوستانی زبان کے علاوہ صوبائی بھاشاؤں کا بھی چلن ہے، مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان مقامی بولیوں کے ساتھ ساتھ ملک کی یہ مشترک زبان بھی ہر جگہ ترقی کرتی جاتی ہے، مجھے احاطہ مدراس کے مختلف شہروں، مدراس، بنگلور، ترچناپلی، آمبور، ویلور وغیرہ جانے کا اتفاق ہوا، اور ہر جگہ اردو میں تقریریں ہوئیں، اور عموماً ہوتی ہی رہتی ہیں، اور وہ اچھی طرح سمجھی جاتی ہیں، اور شمالی ہند کے اردو اخبار، رسالے اور تصنیفات وہاں پڑھی جاتی ہیں، بنگلور جیسے دور دراز علاقہ میں جو مدراس

اور بمبئی کی سرحد پر ہے، اُردو کا رواج کافی ہے اور اُردو کے مدرسے اور کتب خانے قائم ہیں۔

بمبئی جانے کا اتفاق ہر شخص کو ہوتا ہوگا وہاں دیکھا گیا ہوگا کہ صوبہ کی مختلف بولیوں مرہٹی، کنڑی اور گجراتی کے ساتھ بازاروں اور پبلک مقاموں پر ہندوستانی ہی کا قبضہ ہے یہاں کارپوریشن کی طرف سے اکثر محلوں میں اُردو کے میونسپل اسکول جاری ہیں، مہاراشٹر کے شہر پونا میں میرا دو سال قیام رہا ہر جگہ نظر آیا کہ بازاروں میں اور مشترک مقاموں پر سمجھنے بوجھنے کا واحد ذریعہ اُردو ہی ہے یہاں اُردو کا ایک ٹریننگ اسکول بھی ہے اور اُردو اسکولوں کے لیے الگ انسپکٹر بھی مقرر ہیں۔

یہاں پر اپنے قیام پونا کا ایک لطیفہ یاد آیا، دکن کالج میں میرے شریک کار ایک مرہٹہ برہمن پروفیسر تھے، دوپہر کی راحت کے گھنٹہ میں ہم لوگ ایک ہی میز پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے، ہمارے مرہٹہ پروفیسروں اور چپراسیوں کی مادری زبان مرہٹی تھی، مگر جب ان پروفیسر صاحب کو چپراسیوں پر غصہ آتا تھا تو اُردو میں آتا تھا، ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا مرہٹی پیاری زبان ہے اس میں غصہ کرتے نہیں بنتا، اور اُردو زبان "ملٹری لنگویج" ہے، اس میں غصہ کرتے خوب بنتا ہے۔

گجرات کے مسلمانوں میں گجراتی کے ساتھ اُردو زبان بھی بخوبی رواج پذیر ہے اور گجراتی ہندو بھی اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں، گجرات کے عام شہروں میں بلکہ دیہاتوں تک میں اُردو لکھنے پڑھنے کا رواج ہے شہر بڑودہ، جوناگڑھ، مانگرول، بھروچ، احمدآباد، سورت، پالن پور وغیرہ مقامات میں اور خصوصاً سورت اور اس کے آس پاس میں ہندوستانی مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے یعنی باقاعدہ سیکھے بغیر اُردو بولتے چالتے ہیں، اور گھروں میں بولی جاتی ہے

بنگال میں بنگالیوں کی واحد زبان بنگالی ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان مگر ہر شخص

جاکر دیکھ سکتا ہے کہ بنگال کے دارالحکومت کلکتہ پر ہندوستانی کا قبضہ ہے بنگال کے پرانے متمدن شہروں مرشد آباد اور ڈھاکہ میں اردو گویا مادری زبان ہے، چاٹگام میں ان سے کم مگر پھر بھی ہندوستانی زبان سمجھ لی جاتی ہے، بنگال میں عربی مدرسے بکثرت ہیں، اور خیال کیا جاتا ہے کہ کم سے کم ساٹھ ہزار مسلمان طالب علم وہاں عربی پڑھتے ہیں، اور ان سب کی تعلیمی زبان ہندوستانی ہی ہے، ہم کو اس کا علم ہے کہ بنگالی مسلمانوں کو بھی اپنی صوبائی زبان سے بہت محبت ہے، لیکن اس کے باوجود ہندوستانی بولنے پر مجبور رہے ہیں، ہندوستان کے اکثر عربی مدرسوں میں بنگالی طالب علموں کا بڑا حصہ آیا کرتا ہے، اور یہیں وہ چند سال رہ کر تعلیم پوری کرتا ہے، اس کا اثر ہے کہ وہ گھر جاکر بھی اس کو نہیں بھولتا، بنگال میں بہت سے اردو کے ایسے نامور شاعر اور ادیب ہیں جو کسی حیثیت سے اس صوبہ کے اردو شاعروں اور ادیبوں سے کم نہیں ۔

راجپوتانہ

راجپوتانہ میں اجمیر کا شہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ سارے کا سارا اردو بولتا ہے اس کی ریاستوں کی سرکاری زبان اردو ہے، وہاں کے رہنے والے یا ٹھیٹھ ہندوستانی بولتے ہیں، یا ایسی بولیاں جو ہندوستانی سے بالکل ملتی جلتی ہیں، اور دہلی کے اثر سے متاثر ہیں، ٹونک کی مادری زبان اردو ہے وہاں کے نواب اور امرا اس زبان کے شاعر ہوئے ہیں، وہاں کے عام شرفا میں بھی اس زبان کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب ہیں ۔

دوسری ریاستوں میں بھی ہماری زبان کا سکہ چلتا ہے، جے پور میں یہی بولی جاتی ہے، ریاست کے محکمۂ تعلیمات نے تمام سرکاری اور امدادی مدرسوں میں اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا ہے،[1] مارواڑ وغیرہ میں جو مقامی بولیاں ہیں وہ ہندوستانی ہی کی ایک قسم ہیں گو لہجہ میں

[1] (کانفرنس گزٹ علی گڑھ یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء)

اس سے کڑی۔

ہندستانی بولنے والوں کی تعداد

اُردو کی جغرافی وسعت کے سمندر میں بہتے ہوئے خدا جانے ہم کہاں سے کہاں چلے آئے کہنا تو یہ تھا کہ اُردو کی ترقی کا آغاز اس صدی کے ساتھ ہوا، اور سال کے ہر قدم کے ساتھ، اس کا قدم آگے کو بڑھتا جاتا ہے۔ اس کے جانچنے کا سب سے آسان ذریعہ ہندوستانی بولنے والوں اور سمجھنے والوں کی تعداد پر سرسری نظر ڈالنا ہے۔

نواب مہدی یار جنگ بہادر اُردو کانفرنس علی گڑھ (۲۴، ۲۵، اکتوبر ۱۹۳۶ء) کے صدارتی خطبہ میں فرماتے ہیں۔

"سائمن کمیشن رپورٹ کے دیباچہ میں ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستانی زبان بولتی ہے" (روداد مذکور ص ۵۳)

انڈین نیشنل کانگریس کے محترم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے:

"جہاں تک ہندوستانی کا تعلق ہے، مجھے صحیح اعداد تو یاد نہیں پڑتے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس زبان کی مختلف بولیوں کے بولنے والوں کی تعداد ۱۴ کروڑ سے کم نہیں اس کے علاوہ اس کے سمجھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اور ہے، جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی زبان کی ترقی کے لیے بڑے امکانات ہیں، یہ سنسکرت زبان کی مستحکم بنیاد پر قائم ہے اور فارسی زبان سے اس کا گہرا تعلق ہے چنانچہ دونوں زبانوں کے خزانوں سے یہ مالا مال ہو سکتی ہے"۔ (اُردو ترجمہ ۲ ص ۲۹۹، ۳۰۰)

مدارس بنگال اور بمبئی کی امید گاہیں

ہندستانی زبان کی رفتار ترقی کے لیے سب سے کٹھن منزلیں بمبئی، مدارس اور بنگال کی ہیں بنگال میں ڈھاکہ یونیورسٹی، مدرسہ عالیہ کلکتہ

اور عربی کے دوسرے مدرسوں کے ذریعہ سے یہ زبان اہلِ صوبہ کی مخالفت کے باوجود آگے بڑھ رہی ہے، بمبئی میں انجمن کا کالج ہندوستانی ادبیات کی ترقی کے لیے کوشاں ہے، اور رفتار کامیاب نظر آرہی ہے، مدراس میں جامعہ دارالسلام عمر آباد سے بہت کچھ امیدیں ہیں، میسور میں بنگلور اُردو کا خاص مرکز ہے۔

ابھی حال میں ملیبار میں ایک انجمن اصلاح اللسان کے قیام کی خبر ملی ہے جو چھ سال سے ملیبار کے گیارہ لاکھ مسلمانوں کی قومی زبان اُردو بنانے کے لیے کوشاں ہے اس انجمن کی کوششوں سے وہاں بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں میں اُردو کا ذوق پیدا ہو چلا ہے۔ اور اب وہاں سے نارجلستان نام ایک ادبی رسالہ کی اشاعت کی کوشش ہو رہی ہے[1]۔

صوبۂ بہار صوبۂ بہار، اطرافِ دہلی اور یوپی کے بعد اُردو کا تیسرا مرکز ہے، اور اُردو یہاں کی مادری زبان ہے، تاہم اکثر صاحبوں کو یہ معلوم ہوگا کہ گذشتہ صدی کے خاتمہ کے قریب اس زبان کا رسم الخط سرکاری عدالتوں سے خارج کر دیا گیا تھا، مدتوں کی کوششوں کے بعد آنریبل سر فخرالدین مرحوم کے عہدِ وزارت میں یہ حکم منسوخ ہوا، اور پٹنہ کمشنری میں اردو رسم الخط کی سرکاری اجازت حاصل ہوگئی، اس اجازت کا اس صوبہ میں اُردو زبان کی ترقی پر بہت اچھا اثر پڑا ہے کئی اخبار اور رسالے نکلے اور پبلک شوق بھی نمایاں ہوا، پچھلی عارضی وزارت میں بعض بنگال سے ملے ہوئے اضلاع کے علاوہ سارے صوبہ کو اردو خط کی اجازت مل گئی، کانگریس کی نئی وزارت نے بھی اس اجازت کو قائم رکھا ہے، اور اب یہ صوبہ بھی بدستور سابق اُردو کا گھر بن رہا ہے اور ہندوستانی زبان کو صوبہ کی قومی اور تعلیمی زبان بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

---

[1] اخبار قوم بنگلور ۲۶ فروری ۱۹۳۷ء

سرحد | صوبہ سرحد کی مادری زبان پشتو ہے تاہم ہندوستانی وہاں کا ہر شہری باشندہ بولتا اور دیہاتی باشندہ سمجھتا ہے پچھلے دنوں سر عبدالقیوم کی وزارت میں اُردو رسم الخط اس صوبہ کا سرکاری خط قرار دیا گیا، ایک ادبی انجمن اور اسلامیہ کالج کی فضا اس زبان کی ترقی کیلئے سازگار ہے۔

ابھی کوہاٹ میں ایک بزم اردو کا قیام عمل میں آیا ہے جس کا مقصد اس صوبہ میں ہندوستانی زبان کی ترقی اور اشاعت ہے[1]۔

زبان کی ترقی کے معیار اُس زبان کے مطبوعات اور ادارے ہیں مطبوعات میں اخبارات، رسالے اور تصنیفات ہیں۔

اخبارات | پچھلی صدی کے خاتمہ پر ہندوستانی زبان کے ایک دو روزانہ اور دو تین سہ روزہ اخبارات تھے، خیال آتا ہے کہ اس زمانہ میں لاہور میں ایک روزانہ اخبار اخبار عام چھپتا تھا، اور دوسرا لکھنؤ میں اودھ اخبار صدی کے خاتمہ پر غالباً سب سے پہلے پیسہ اخبار روزانہ ہوا اور ۱۹۱۰ء تک یہی حال رہا، بلقان کے سیاسی ہنگاموں میں زمیندار روزانہ نکلنے لگا اور اسی کے قریب مولانا محمد علیؒ نے روزانہ ہمدرد کا اجرا کیا اب آج میرے علم میں صرف لاہور سے اردو کے دس روزانہ اخبارات نکل رہے ہیں، زمیندار، انقلاب، احسان، ریاست، ملاپ، پرتاب، ویربھارت، ہندو وغیرہ، دہلی سے چار، تیج، وطن، وحدت اور تیج، لکھنؤ سے چار، حقیقت، حق، اودھ اخبار اور ہمدم، کلکتہ سے چار، عصر جدید، روزانہ ہند، مسلم گزٹ، اور الہلال، تیسرا بند ہو گیا، بمبئی سے پانچ خلافت، اجمل، ہلال، مشیر ہند اور اسلام، مدراس سے دو قومی رپورٹ اور آزاد، (آج کل شاید بند ہے) حیدرآباد سے چھ روزنامے پیام، صحیفہ،

---

[1] احسان لاہور ۶ مارچ سنہ ۱۹۲۷ء ص ۷۔

رہبر دکن، امشیر دکن، صبح دکن، منشور اور رنگون سے دو شیر رنگون، اور مجاہد برما اور پشاور سے آزاد اور سرحد اور بنگلور ملک میسور سے الکلام جو پہلے ہفتہ وار تھا، اب روزانہ ہو گیا ہے[1]، ایک روزانہ اخبار سندھ سے شائع ہوتا ہے۔

صدی کے خاتمہ پر سہ روزہ اخبار دو تھے، ایک مغرب میں، دوسرا مشرق میں، مغرب میں وکیل امرتسر جس نے انشاء اللہ خاں کی اڈیٹری میں روم و یونان کی جنگ میں کافی شہرت حاصل کی، مشرق میں ریاض الاخبار، گورکھپور مشہور شاعر ریاض کا اخبار، اسکی ادبی حیثیت زیادہ نمایاں تھی، اب اس وقت سہ روزہ اخبارات میں صداقت کشمیر، پیغام لاہور، وکیل امرتسر، مدینہ بجنور، الامان دہلی، انصاری دہلی، الجمیعتہ دہلی، اتحاد پٹنہ، مسلم پٹنہ، الھلال پٹنہ، آزاد پٹنہ ہیں۔

صدی کے خاتمہ پر ہفتہ وار اخباروں میں پیسہ اخبار لاہور، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈھ، کرزن گزٹ دہلی، البشیر اٹاوہ، اودھ پنچ لکھنؤ، ہندوستانی لکھنؤ، نیر اعظم مراد آباد، ذوالقرنین بدایون، رفیق کھنڈ گزٹ بریلی، مہرنیمروز یوپی کے کسی شہر سے نکلتا تھا۔ ایپنچ پٹنہ، اردو گائڈ کلکتہ، شمس الاخبار اور مخبر دکن مدراس۔

صدی کے آغاز میں سب سے پہلا پرزور ہفتہ وار ۱۹۰۱ء میں انشاء اللہ خاں کی اڈیٹری میں وطن نکلا جو ٹرکی اور تمام اسلامی دنیا کا نقیب اور سفیر تھا، ٹرکی کے دستوری انقلاب کے بعد اس کا وقار رفتہ رفتہ گھٹ گیا، اور آخر ہندوستان کے سیاسی انقلاب میں وہ مٹ گیا۔

اس کے بعد سیاسی ہفتہ وار اخبارات میں ۱۹۱۰ء میں مسلم گزٹ لکھنؤ اور الھلال کلکتہ

---

[1] یہ مضمون ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا تھا۔ اب اس عرصہ میں مختلف صوبوں میں روزانہ اخباروں کی تعداد بہت کچھ بڑھ گئی ہے۔

بڑے زور شور سے نکلے، بہر حال یہ ہفتہ وار اخبارات میں ترقی کی ابتدائی تاریخ ہے، اس وقت سے لے کر آج تک پشاور و کشمیر سے لے کر رنگون تک جگہ جگہ سے ہفتہ وار اخبار اتنے نکل رہے ہیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے ہفتہ وار اخباروں میں خلافت، احسان، انقلاب، زمیندار، ملاپ، تیج، اجمل اور ہند کے ہفتہ وار ایڈیشن خوبی سے نکل رہے ہیں، ہفتہ وار صحیفوں میں دیوان سنگھ مفتون کا ریاست عام لوگوں میں بہت مقبول ہے بھوپال سے ندیم، بمبئی سے صداقت اور مصور، کلکتہ سے ہفتہ وار ہند، مدراس سے سہیل اور ملت، بنگلور سے پہلے الکلام اور اب قوم، رنگون سے میونسپل گزٹ اور کراچی سے بلوچستان جدید اور الحبیب اور ان کے علاوہ چند ہفتہ وار اخبار نکل رہے ہیں۔

ابھی حال میں کشن گنج پورنیہ (بہار) سے ایک ہفتہ وار آئینہ نکلنے لگا ہے یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء کو اس کا بارہواں نمبر چھپا ہے، ایبٹ آباد سرحد سے عزیز الملک نکلا ہے، اور اکولہ صوبہ برار سے البرہان، ناگپور سے مسلم، کشمیر سے النور، بمبئی سے مختلف ناموں کے کئی ہفتہ وار۔[1]

گذشتہ صدی کے اواخر میں ہندوستانی زبان کے اخبارات کی تعداد جو ممالک مغربی و شمالی اور پنجاب میں لکھنؤ سے لاہور تک چھپتے تھے، سنہ کے قریب تھی (رسالہ حسن حیدرآباد جلد پنجم نمبر ۲ اص ۱۱۴) اگر اس تعداد سے آج کے اخبارات کی تعداد کا موازنہ کیا جائے، تو ہندوستانی زبان کی ترقی کا پورا حال معلوم ہو گا، چنانچہ اب سارے ہندوستان میں ۸۱۲ اخبار اور رسالے اس زبان میں نکلتے ہیں، جن میں سے ستاون روزانہ اور تین سو پچاس ہفتہ وار ہیں۔

رسالے | ہندوستانی زبان کا سب سے پہلا ادبی رسالہ تہذیب نگار لکھنؤ ہے جو سنہ ۱۸۸۴ء

---

[1] اخبار اجمل بمبئی ۶ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء

سے نکلنا شروع ہوا۔ اور سب سے پہلا مذہبی و اصلاحی رسالہ تہذیب الاخلاق سر سید احمد خاں
ہے جو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۶ء تک نکلا۔ سب سے پہلا علمی رسالہ مخزن الفوائد حیدرآباد دکن
ہے جس کے اڈیٹر نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے۔ یہ ۱۸۷۴ء میں نکلا تھا۔ اور
سب سے پہلا تحقیقی و تاریخی رسالہ حسن ہے۔ جو حیدرآباد میں ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۴ء تک جاری
رہا۔ نواب عماد نواز جنگ حسن بن عبداللہ اس کے اڈیٹر تھے۔ اور ہر قسم کے علمی، ادبی
تاریخی اور اخلاقی مضامین کا سب سے پہلا مجموعہ علی گڑھ کا معارف ہے جس کے ایڈیٹر
وحید الدین سلیم اور نواب محمد اسمٰعیل خاں تھے۔ یہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک نکلتا رہا۔

پچھلی صدی کے بھی مایہ ناز رسالے تھے۔ جو ملک کے مختلف گوشوں سے نکلے
لیکن نئی صدی اپنے ساتھ بہت سے نئے ساز و سامان لائی۔ نئی تعلیم کی پود اب
بڑھ کر جوان ہو چکی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے سنہ ۱۹۰۱ء میں سر شیخ عبدالقادر کی اڈیٹری میں
لاہور سے مخزن نکلا۔ آج کے ادیب اور بوڑھے اس زمانہ کے نوجوان تھے۔ سر اقبال،
میر نیرنگ، چودھری خوشی محمد ناظر، اعجاز حسین، ظلمہ احسین، سید حسرت، مولانا شروانی،
سید علی محمد شاد وغیرہ اس کے مضمون نگار تھے۔ مجھے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ میری عمر کا سب سے
پہلا مضمون "وقت" اسی میں شائع ہوا تھا۔ یہ پہلا رسالہ ہے جس نے نئی تعلیم کے نوجوانوں
کو ملکی ادب کے کام میں لگایا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۰۳ء میں سید حسرت موہانی نے علیگڈھ سے اردوئے معلی
نکالا جس میں ادبی اور سیاسی مضامین کی گنگا جمنی ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں علیگڈھ منتھلی پرین
کو میر ولایت حسین ایڈٹ کرتے تھے۔ اور وہ کالج کی بجائے ملک کا رسالہ تھا۔ نئے نوجوان
اس میں مشق سخن کرتے تھے۔ اس کے نو آموزوں میں میرا نام بھی داخل ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں
دکن کے افق سے مولوی ظفر علی خاں کا دکن ریویو اور افسانہ طلوع ہوا ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ سے

الندوہ نکلا جو روشن خیال علما کا آرگن تھا۔ مولانا شبلیؒ اور مولانا حبیب الرحمن شروانی اس کے اڈیٹر تھے۔ پھر ۱۹۰۳ء ہی میں زمانہ کا آغاز ہوا جو منشی دیا نرائن نگم کی اڈیٹری میں اب تک جاری ہے۔ منشی نوبت رائے نظر کا خدنگ نظر بھی ۱۹۰۴ء کی یادگار ہے۔

اس کے بعد انڈین پریس الہ آباد سے ادیب ۱۹۰۸ء میں، لکھنؤ سے الناظر ۱۹۰۹ء میں، لاہور سے ظفر علی خاں کا پنجاب ریویو ۱۹۱۰ء میں، لکھنؤ سے پیارے لال شاکر میرٹھی کا العصر ۱۹۱۱ء میں، آگرہ سے ولیم اکبر آبادی کا نقاد ۱۹۱۳ء میں، حیدرآباد سے ہوش بلگرامی کا ذخیرہ ۱۹۱۵ء میں، اعظم گڑھ سے معارف ۱۹۱۶ء میں، چکبست کا صبح امید لکھنؤ سے ۱۹۱۸ء میں نکلا، اور اس کے بعد ملک کے مختلف گوشوں سے اردو کے جس کثرت سے رسالے نکلے ہیں، وہ آپ کے سامنے ہیں اور جس کی وسعت پورے ملک کو محیط ہے۔ پنجاب میں ہمایوں، دہلی میں جامعہ اور شاید یو۔پی میں معارف بھی ہماری زبان کے معیاری ماہوار رسالے ہوں گے۔

اردو کا سب سے پہلا سہ ماہی رسالہ اردو جو انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کا آرگن ہے ۱۹۲۱ء میں نکلا، جو خالص ادبی رسالہ اور اپنی ادبی تنقید و تحقیق کے لیے مشہور ہے۔ دوسرا سہ ماہی اورینٹل کالج میگزین لاہور سے نکل رہا ہے، جو مشرقی علوم و فنون و تاریخ پر محققانہ مضامین چھاپتا ہے، اور تیسرا سہ ماہی رسالہ ہندوستانی اکیڈیمی کا ہندوستانی الہ آباد ہے جو ۱۹۳۱ء سے جاری ہے اور ہندوستانی زبان و ادبیات کی خدمت کر رہا ہے۔

ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے بھی ماہوار رسالے نکلتے رہتے اور بند ہوتے رہے۔ مثلاً کلکتہ سے لسان الصدق (۱۹۰۳ء) مولانا ابوالکلام کی اڈیٹری میں اور تنویر المشرق اور ڈھاکہ سے جادو، جونا گڑھ سے زبان اور شہاب، پونا سے رفیق الطلبہ (انگلو اردو ہائی اسکول پونا) مالیگاؤں ضلع ناسک صوبہ خاندیس سے بیداری اور

اور اب (۱۹۳۵ء) میں کشن گنج پورنیہ سے ہونہار نکلا ہے۔

مدراس میں صحیفہ اور بشریٰ، شہر مدراس سے، کوثر بنگلور سے اور مصحف عمر آباد شمالی ارکاٹ سے ابھی ان ہی سالوں میں نکلے اور اب بند ہو گئے۔ اب آمبور سے مینا نکلا ہے اور مصحف عمر آباد سے دوبارہ نکلنے لگا ہے۔

سفیر سخن پشاور سے، میزان الافکار نو بہ زبان ہند اور ارمغان کراچی سندھ سے، نخلستان، ملتان سے اور لالہ صحرا بہاولپور سے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک نکلے، اور اب بمبئی کے افق سے صبح امید طلوع ہوا ہے۔

ہندوستان سے باہر بھی کچھ رسالے اور اخبار اس زمانہ میں نکلے جن میں سے نوائے کیمبرج اور نوائے وطن امریکہ ذکر کے قابل ہیں۔

زنانے رسالے | یہ وہ رسالے ہیں جو علم و ادب کی شاخوں سے متعلق ہیں، لیکن صدی کے خاتمہ کے قریب ہی سے مخصوص رسالوں کی اشاعت شروع ہو گئی۔ ۱۸۹۸ء سے مولوی سید ممتاز علی صاحب مرحوم نے لاہور سے تہذیب نسواں جاری کیا، جو اب تک اسی شان سے نکل رہا ہے، یہ خاص لڑکیوں اور عورتوں کا ہفتہ وار اخبار ہے، اور مدیرہ کی آخری اشاعت ایک خاص نمبر کی شان سے نکلتا ہے۔ ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ سے خاتون نکلا جو ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ تعلیم نسواں کا آرگن تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مولینا راشد الخیری صاحب نے عصمت جاری کیا، جو اب تک کامیابی سے نکل رہا ہے۔ بھوپال سے ظل السلطان ہز ہائینس سلطان جہاں بیگم مرحومہ کی زندگی بھر نکلتا رہا، اور آپ کے بعد بھی کچھ دنوں نکلا کیا۔ منشی محمد امین صاحب زبیری اس کے ایڈیٹر تھے۔ ظل السلطان کے ایڈیٹر امہات کے نام سے زنانہ اخبار نکلنے لگا، مگر اب وہ بھی بند ہو چکا ہے۔

پھپرا (بہار) سے زیب النساء (چھپا) رسالہ ۱۹۲۲ء میں نکلا تھا، پھر بہار (گوڑگانواں) سے دوسرا رسالہ ۱۹۲۶ء میں عفت نکلا، دونوں بند ہو گئے، پنجاب سے سہیلی اور نورجہاں دو اچھے رسالے نکلے تھے، مگر شاید بند ہو گئے، اب جالندھر سے مسلمہ کے نام سے مسلمان عورتوں کا مذہبی رسالہ، اور جوہر نسواں کے نام سے دہلی سے ادبی اور اخلاقی رسالہ بھی نکل رہا ہے، کانپور سے مستورات، دہلی سے رہبر نسواں اور صدائے نسواں، لاہور سے لیلیٰ اور نسوانی دنیا وغیرہ بہت سے رسالے نکلے لیکن شاید اپنی زندگی پوری کر چکے۔

اب آج کل چار برس سے بمبئی سے خاتون نام کا زنانہ ہفتہ وار اخبار کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے، منشی محبوب عالم (پیسہ اخبار) کی صاحبزادی فاطمہ خانم اس کی نگراں ہیں ۱۹۳۲ء میں خاتون سرحد کے نام سے پشاور سے ایک زنانہ رسالہ نکلا ہے۔

بچوں کے رسالے | یاد آتا ہے کہ اس صدی کے شروع میں سب سے پہلے منشی محبوب عالم صاحب مرحوم نے پیسہ اخبار کے دفتر سے بچوں کا اخبار نکالا اور وہ کچھ دنوں چلا، پھر تہذیب نسواں کے دفتر سے پھول نکلا جو اب تک جاری ہے، بنات کے نام سے دفتر عصمت سے بچیوں کے لئے رسالہ نکل رہا ہے، ہونہار، نونہال وغیرہ پرچے ہیں، مگر ان سب میں کامیاب جامعہ ملیہ دہلی کا پیام تعلیم ہے۔

الہ آباد سے بچوں کی دنیا، بہار سے تربیت، دہلی سے بچہ نکلے، رنگون سے معصوم ۱۹۲۴ء میں نکلا "بچوں کی دنیا" آج بھی الہ آباد میں ہے۔

فنی رسالے | فنی رسالوں میں سب سے زیادہ طب پر رسالے نکلے، اور اب تک نکل رہے ہیں! حامی صحت (۱۹۲۶ء) دہلی، تبصرۃ الاطباء لاہور، حاذق (۱۹۱۲ء) دہلی، معین الشفا لاہور (۱۹۲۳ء) مسیحا رامپور (۱۹۲۶ء)، ہومیوپیتھک میگزین لاہور، ڈاکٹر لاہور، طبی میگزین

(۱۳۳۳ھ) پٹنہ، حکیم دکن حیدر آباد، ۱۹۲۶ء سے طلبہ کالج میگزین علیگڈھ سے اجمل میگزین بمبئی سے شمس الاطباء لاہور سے، اور ہمدرد صحت ۱۹۲۲ء سے دہلی سے اچھے نکل رہے ہیں اور اب دہلی ہی سے جنتری حیات نکلا ہے۔

فن اقتصادیات پر ایک مخصوص رسالہ مالیات پٹنہ سے ۱۹۲۵ء میں نکلا، جامعہ دہلی بھی کچھ دنوں تک اپنی اشاعتوں کے تین نمبر اقتصادیات پر نکالتا رہا، اور اب وہ خالص اقتصادی و سیاسی رسالہ ہو گیا ہے، اور لاہور سے ۱۹۲۹ء میں اقتصادی دنیا شائع ہوا۔

حیوانات پر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے شعبہ حیوانات کا رسالہ حیوانیات ۱۹۲۱ء میں نکلا تھا، مگر بہت کم زندہ رہا

سائنس کے تمام متعلقہ علوم پر انجمن ترقی اردو کا مشہور سہ ماہی رسالہ سائنس خوبی سے نکل رہا ہے۔

تعلیمی رسالے بھی بہت سے نکلے اور بند ہوئے، اور بعض ایسے مقامات سے نکلے جو اردو کے مرکز سے دور ہیں جیسے رفیق طلبہ (۱۹۱۲ء) پونہ سے، طلبہ (۱۹۳۵ء) پورنیہ (بہار) سے بہارستان (۱۹۲۶ء)، امراوتی برار سے، اور مشعل (۱۹۳۶ء) پشاور صوبہ سرحد سے اچھی چیند و دبار نکلی کا رہنمائے تعلیم لاہور اس سلسلہ کا پرانا رسالہ ہے، اس وقت تعلیمی رسالوں میں پنجاب ایجوکیشنل جرنل لاہور ممتاز ہے، یہ ۱۹۳۶ء سے نکل رہا ہے۔ اور شیخ نور الٰہی پروفیسر ظفر اقبال اور پروفیسر گوپال داس اس کے ایڈیٹر ہیں، حیدرآباد میں معلم اور اتالیق دو رسالے ہیں۔

ادارے | صدی کے خاتمہ پر ہندوستانی زبان کا کوئی ادارہ قائم نہ تھا، انگریزوں کے

بنائے ہوئے ادارے تو غدر کے طوفان میں بہہ گئے، سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی بھی سیاسیات کی الجھنوں میں پھنس کر رہ گئی، صدی کے آغاز میں سنہ ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی جس کے پہلے معتمد مولینا شبلی تھے اس نے کتابوں کے ترجمے اور بعض مستقل تصنیفیں شائع ہوئیں، سرکار آصفیہ نے اسی زمانے میں سررشتۂ علوم و فنون قائم کیا جس کے پہلے مددگار معتمد مولینا شبلی تھے، اس کی طرف سے الکلام، علم الکلام، موازنۂ انیس و دبیر، اور سوانح مولانا روم وغیرہ کتابیں لکھی گئیں۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں مولینا شبلی نے دار المصنفین کا خیال ظاہر کیا اور آخر نومبر سنہ ۱۹۱۴ء میں دار المصنفین کی بنیاد پڑی، سنہ ۱۹۱۷ء میں دار الترجمہ حیدرآباد قائم ہوا، سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریکات کے سلسلہ میں جامعہ ملیہ کی بنا پڑی، اور اس کے ایک شعبہ کی حیثیت سے اردو اکاڈیمی قائم ہوئی، سنہ ۱۹۲۷ء میں ہندوستانی اکاڈیمی کا قیام عمل میں آیا، اس کے بعد دائرۂ ادبیہ پشاور، انجمن ترقی اردو کراچی، انجمن ترقی اردو پٹنہ اور انجمن مذکور کی دوسری شاخیں ہیں جن کی تعداد سنہ ۱۹۳۴ء کی روداد میں ۹۵ بتائی گئی ہے۔

ستمبر سنہ ۱۹۳۴ء میں عمر آباد شمالی ارکاٹ (مدراس) میں ہندوستانی اکاڈیمی جنوبی ہند کی بنیاد پڑنے کی خبر آئی ہے، ملیبار میں بھی ایک انجمن یہ کام کر رہی ہے۔

ابھی ابھی (جنوری سنہ ۱۹۳۸ء) دہلی سے ندوۃ المصنفین کے نام سے ایک نئے علمی و ادبی ادارہ کی بنیاد پڑنے کی خبر آئی ہے۔

ان کے علاوہ ذاتی اور شخصی ادارے بھی قائم ہوئے جیسے دائرۂ ادبیہ لکھنؤ، ایوانِ اشاعت گورکھپور، اردو مرکز لاہور، قومی کتب خانہ لاہور، کتابستان الہ آباد وغیرہ ان سب نے مل کر ہندوستانی زبان کی ترقی و اشاعت کی اہم خدمت انجام دی ہے۔

دفتر عصمت دہلی اور دفتر تہذیب نسواں لاہور عورتوں کے لئے اور جامعہ ملیہ بچوں کے لئے مفید لٹریچر پیدا کر رہے ہیں۔

اُردو کتابوں کی تعداد | افسوس ہے کہ اردو کتابوں کا کوئی ایسا ذخیرہ ہمارے پاس موجود نہیں اور نہ کوئی ایسی مکمل فہرست ہے جس سے شروع سے آج تک کی اُردو کتابوں کی تعداد کا پُورا پورا تخمینہ معلوم ہو سکے۔ ۱۹۲۱ء میں پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی نے الفہرست کے نام سے اردو کتابوں کی جو فہرست حیدر آباد دکن سے شائع کی ہے اس میں چھ ہزار آٹھ سو چھیانوے مطبوعہ کتابوں کا اندراج ہے، اس کے بعد چودہ برسوں میں جو کچھ اضافہ ہوا ہے، وہ ظاہر ہے۔

۱۹۲۷ء میں ہندوستانی ایکاڈیمی کے ایما سے پروفیسر ضامن علی صاحب (الہ آباد) نے اُردو کتابوں کی پیمائش کی مختصر روداد شائع کی ہے، اس میں اجمالی بلا نام سترہ ہزار نو سو ننانوے کتابوں کا شمار ظاہر کیا ہے، اس شمار پر بھی نو ان برس گذر رہا ہے اور عجب نہیں کہ بیس ہزار تک نمبر پہنچا ہو۔

بہر حال پروفیسر سجاد مرزا بیگ مرحوم کی فہرست کے اندراجات کے رو سے آج سے چودہ برس پہلے ان کے علم میں ہر علم و فن کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد یہ تھی۔

۱۔ مذہبیات

قرآن پاک کے ترجمے	۷۳	فقہ اہلِ سنت	۹۹
تجوید و قرأت	۲۴	فقہ اہلِ تشیع	۱۰
حدیث	۵۹	دینیات اہلِ سنت	۶۶

دینیات، اہلِ تشیع	۹	مذہب ہنود	۹۸
فلسفہ مذہب و کلام	۱۳۶	علم اخلاق	۱۸۰
مذہب نصاریٰ	۴۶	اخلاق ہنود	۱۲۲
			۲۹۰

۲- علوم

حساب	۹۶	اجتماعیات	۵۹
جبر و مقابلہ	۲۹	جغرافیہ	۲۰۲
مساحت	۴۶	نقشہ جات	۳۰
علم مثلث	۱۵	علم طبعیات	۶۰
تراشہائے مخروطی، وجبر تفاضلی	۱۳	علم برق	۲۰
علم تعمیرات	۱۷	علم کیمیا	۷
علم ہندسہ	۴۳	علم ہیئت	۳۴
منطق	۲۵	طبقات الارض	۷
فلسفہ	۳۲	نباتات	۸۴
علم النفس	۲۵	حیوانات	۲۹
مناظر	۱۲	علم الابدان	۱۹
موسیقی	۴۹	طب	۵۶۶
معاشیات	۳۲	ڈاکٹری	۹۰

ہومیو پیتھک	۱۱	بیطاری	۴۴
علاج شمسی	۵	حفظان صحت	۳۲
بیدک	۵	قانون	۱۵۵
			۹۰۴

۳- تواریخ

انساب،	۲۱	جنگ یورپ،	۷
عام تاریخ،	۱۳	تاریخ مصر،	۱۲
تاریخ اسلام،	۶۴	ترکوں کی تاریخ،	۴۰
تاریخ عرب،	۲۰	تاریخ ایران،	۱۳
تاریخ اسپین،	۱۰	تاریخ افغانستان	۱۱
تاریخ انگلستان،	۲۴	تاریخ ہندوستان،	۵۶
تاریخ روس	۲	تاریخ ہندوستان و برما و لنکا،	۱۵۰
تاریخ جاپان و چین	۶	تاریخ کی متفرق کتابیں،	۳۶
یونان	۷	سفرنامے،	۱۱۵
حالات اقوام	۱۷		۶۶۵

۴- سوانح

سیر انبیاء	۳	میلاد و سیرت	۳۹

سوانح بزرگان دین	۳۰	عام سوانح عمریاں	۵۱۷
تذکرۃ الشہداء	۳۹	تذکرۂ نسواں	۴۹
حالات اولیاء اللہ	۱۶	تذکرۂ شعراء	۴۱
احوال شہادت	۹۶		۷۵۳

۵- ادبیات

قصے	۳۰۰	ترکیب بند	۴
ناول	۶۰۰	واسوخت	۱۶
ڈرامے	۳۷	مرثیے	۴۱
ادب	۴۴	علم زبان	۲۵
عروض و شاعری	۴۷	لغت	۴۳
دیوان غزلیات	۲۶۰	صرف و نحو اردو	۵۵
نعت	۶۸	صرف و نحو عربی	۲۰
مثنوی	۸۷	صرف و نحو فارسی	۳۳
نظم	۶۸	لغت زبانہائے غیر	۲۳
رباعیات	۷	انشاء	۲۷
مجموعہ ہائے نظم	۱۱۰		۲۴۴

۶۔ متفرقات

قواعد فقہ،	۱۰	رمل ونجوم،	۷۰
علم قیافہ،	۱۳	شعبدے،	۲۱
کھیل اور تماشے،	۳۰	خوش نویسی،	۲۷
			۴۲۵
مسمریزم،	۱۳	تعلیم نسواں،	۱۵۹
صنعت وحرفت،	۱۲۴	فن تعلیم،	۲۶
			۱۸۵
تمثیلات	۱۱۷	مجموعی میزان	۶۸۹۶

کتب خانے | یہ امر افسوس کے قابل ہے کہ اردو کتابوں کا کوئی خاص مرکزی کتب خانہ اب تک نہیں، عموماً مشرقی کتب خانوں کے ضمیمہ کی حیثیت سے اُن کا وجود ہے، میرے علم میں خاص اُردو زبان کا سب سے پرانا کتب خانہ میرے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ میں کتب خانہ الاصلاح کے نام سے قائم ہے یہ کتب خانہ ۱۸۹۹ء میں چند ناولوں سے شروع ہوا۔ اور اب چھتیس برس کی پیہم کوششوں سے اس میں اُردو زبان کی تین ہزار نوسو بارہ کتابیں جمع ہیں، جن کی فن وار تعداد حسب ذیل ہے۔

مذہب،	۵۲۶	تاریخ وجغرافیہ	۳۸
ادب نظم	۴۹۰	تذکرۃ الشعراء وتاریخ اردو	۱۴۰
ناول	۴۶۵	لغات وقواعد	۱۲
ادب نثر	۴۵۰	میلاد النبی نظم ونثر	۹۰
سوانح وسیر وتذکرہ	۴۰۰	سفرنامے اور روزنامے	۵۰

مطبوعات فورٹ ولیم کالج	۶۲	**متفرق**	
فلسفہ و منطق	۳۹	مجلدات رسائل	۴۸۵
سائنس	۲۷	کشکول	۱۵۰
معاشیات و سیاسیات	۲۱	میزان	۳۹۱۲

یہ ایک حقیر انجمن کا کام ہے، اگر باقاعدہ کوشش کی جائے، تو تعداد اس سے بدرجہا زیادہ ہو سکتی ہے۔

ہمارے ہاں دار المصنفین میں اردو کتابوں کی خریداری کا انتظام نہیں، تاہم اس کے باوجود جو سرمایہ جمع ہے، اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ تفسیر	۳۱	۱۲۔ طبقات	۸۳
۲۔ علوم القرآن	۵۲	۱۳۔ سوانح	۱۱۵
۳۔ حدیث	۱۱	۱۴۔ تاریخ	۲۵۱
۴۔ فقہ	۱۳۰	۱۵۔ تاریخ علوم و فنون	۶۲
۵۔ کلام و عقائد	۷۷	۱۶۔ سفرنامے	۳۷
۶۔ ردّ بدعت	۲۴	۱۷۔ جغرافیے	۱۲
۷۔ ترغیب و ترہیب	۴۲	۱۸۔ دواوین	۳۰۰
۸۔ مناظرہ	۲۲	۱۹۔ ادب	۹۱
۹۔ تصوّف	۴۴	۲۰۔ مکاتیب	۱۷
۱۰۔ سیرۃ نبوی	۷۴	۲۱۔ عروض و قوافی	۱۷
۱۱۔ سیرِ صحابہ	۲۳	۲۲۔ لغت	۱۳

۲۳-افسانے	۱۰۲	۳۱-ہیئت	۱۱
۲۴-تعلیمات	۳۲	۳۲-طبقات الارض	۵
۲۵-منطق	۱۰	۳۳-سیاسیات	۳۵
۲۶-فلسفہ	۴۸	۳۴-معاشیات	۱۹
۲۷-طبیعات	۳۶	۳۵-طب	۵۸
۲۸-کیمسٹری	۱۱	۳۶-مجلدات رسائل	۴۵۵
۲۹-علم سکون و حرکت	۹		
۳۰-ہندسہ و ریاضی	۲۷	میزان	۲۴۲۷

ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد بھی اردو کتابوں کا ذخیرہ فراہم کر رہی ہے، اس وقت تک اس کے کتب خانہ میں اردو کی ۱۲۵۲ کتابیں جمع ہوئی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے،

مذہب	۱۹۲	معاشرتی تاریخ	۷
تاریخ مذاہب	۵۶	گرامر	۷۳
لغت	۲۷	سائنس	۲۲
منطق و فلسفہ	۲۸	فلکیات	۷
معاشرت	۱۶	ریاضی	۷
سیاسیات	۲۷	طبقات ارض	۱
اقتصادیات	۶	نباتات	۷
سیر و سیاحت	۴	حیوانات	۴
تعلیم	۵	زراعت	۷

حفظانِ صحت	۲۰	تقریریں	۳۱
دواوین	۲۵۲	خطوط	۲۸
مرثیے	۳۶	ادب	۱۰۰
مثنویات	۵۷	تمدن	۹
رباعیات	۸	سفرنامے	۱۴
متفرقاتِ نظم	۶۶	سوانح	۱۶۵
انتخاباتِ نظم	۹۴	تاریخ اقوام	۳
نقد وغیرہ	۶	تاریخ ممالک	۶۷
ڈرامے	۱۶۵	تاریخ و طبقات	۲۲۶
ناول اور فسانے	۴۸۴		
مضامین	۱۰۴	میزان	۲۵۲۱

انجمن ترقی اردو کے سلسلہ میں انجمن مذکور سے اردو کے جو کتب خانے ملحق ہیں ان کی تعداد حسب ذیل ہے، حیدرآباد دکن، بنگال و آسام ۴، صوبہ متحدہ ۷، بہار و اڑیسہ ۸، راجپوتانہ ۸، گجرات و کاٹھیاواڑ ۳، سندھ ۲، بمبئی ۲، سی پی ۱۶، دلی کے لائبریری رام مصنف خمخانۂ جاوید کے پاس اردو شعر و ادب اور تذکروں کا اچھا ذخیرہ تھا، اب وہ ہندو یونیورسٹی بنارس کی ملکیت ہے۔

یورپ میں ہندوستانی زبان کی کتابوں اور کتب خانوں کا پتہ سب سے پہلے معارف نے پیش کیا۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں جب مجھے پہلے پہل انڈیا آفس لائبریری کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ یہاں ہندوستانی زبان کا اتنا بڑا خزانہ جمع ہے

جس کی فہرست تین صفحوں میں سمائی ہے اور اس میں ہندوستانی کی پرانی چھپی ہوئی کتابیں جن میں بڑا سرمایہ غدر سے پہلے کے مطبوعات کا تھا، موجود ہیں۔ ۱۹۲۰ء تک کی کُل کتابوں کی مجموعی تعداد تو معلوم نہیں ہو سکی، لیکن ان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ سارے مطبوعات چھ عنوانوں علوم و فنون، تاریخ و جغرافیہ، ادبیات، کتب تعلیمی، الٰہیات اور متفرقات پر تقسیم ہیں، اور ان میں سے ہر ایک عنوان بیسیوں ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے، مثلاً علوم و فنون کے عنوان کے نیچے زراعت، صنعت و حرفت، ہیئت و نجوم، نیرنگ و طلسم، سپہ گری، انگریزی قانون، ہندو قانون، اسلامی قانون، منطق و فلسفہ، طب و تشریح، موسیقی، طبعیات، معاشیات، اجتماعیات وغیرہ ۴۲ بابوں پر، تاریخ و جغرافیہ کا عنوان، علم الانساب، عام تاریخ، سوانح اور سفرنامے وغیرہ نو بابوں میں پھیلا ہے، اسی طرح ادبیات کا حصہ دواوین، افسانے، تذکرے، خطوط وغیرہ ۱۴ بابوں پر، تعلیمی و درسی کتابوں کا عنوان قواعد و ریاضیات و طبیعیات وغیرہ کے ۲۰ بابوں پر، الٰہیات و دینیات کا عنوان، برہمنی و لامذہبی، بودھی، عیسائی، ہندو و جینی، اسلام، سکھ مت وغیرہ ۲۰ عنوانوں پر بٹا ہوا ہے، متفرقات، تعلیمات، تعلیم نسواں، تعلیم صبیان، تقریروں کے مجموعوں، ماہوار رسالوں اور انجمنوں کی روداوں، چھ ذیلی عنوانوں پر منقسم ہے، ۱۹۲۶ء میں اس کتب خانے کی ہندوستانی قلمی کتابوں کی جو فہرست چھپی ہے اس میں ۲۶۹ قلمی نسخے درج ہیں۔

ہمارے دوست مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے یورپ کے اکثر کتب خانوں کی سیر کر کے وہاں کے قلمی نسخوں پر ایک جامع کتاب لکھی ہے، اس میں ان کتب خانوں کی فہرست دی ہے، جہاں ہندوستانی کتابوں کا ذخیرہ ان کو نظر آیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے۔

کتب خانہ انڈیا آفس، کتب خانہ برٹش میوزیم، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، اسکول

آف اورینٹل اسٹڈیز، بوڈلین لائبریری اوکسفورڈ، کتب خانہ کیمبرج یونیورسٹی، کتب خانہ ٹرنٹی کالج کیمبرج، کتب خانہ کابر کالج کیمبرج، کتب خانہ کرائسٹ کالج کیمبرج، ایڈن کالج، کتب خانہ اڈنبرا یونیورسٹی، قومی کتب خانہ پیرس۔

جاپان کے مشرقی زبانوں کے مدرسہ میں بھی ہندوستانی کتابوں کا نیا ذخیرہ ہے، کابل کی انجمن ادبی کے پاس بھی ان کا سرمایہ ہے ابھی جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں بدخشاں کے کتب خانہ کے لئے ۲۵۰ ہندوستانی کتابیں ہمارے ہاں سے بھیجی جارہی ہیں، جو انجمن ترقی اردو اور دار المصنفین کا عطیہ ہیں۔

ہندوستانی زبان کے مرکزوں سے بہت دور دریائے تنور کے کناروں پر بدگام احاطہ بمبئی میں کتب خانہ رزاقیہ کے نام سے جناب عبدالرزاق صاحب نے صرف اپنی ذاتی محنت سے اردو کا ایک کتب خانہ فراہم کیا ہے، جس کو ہم نے ۱۹۱۷ء میں دیکھا تھا اس وقت اس میں دو ہزار نو سو چھپیس کتابیں تھیں، قرآنی بستہ جلدوں کی کتابوں کو بھی ایک کتاب فرض کیا گیا ہے، جن کی فن وار فہرست یہ ہے۔

دینیات

قرآن مجید کے ترجمے	۱۳	احادیث	۲۰
تجوید	۴	فقہ حنفی	۵۸
اوراد و وظائف	۱۴	فتاویٰ	۱۰
علوم القرآن	۱۵	فرائض	۹
تفاسیر	۲۱	اصول فقہ	۱

ضابطہ وقانون	۸	تصوف	۳۰
ردّ فرق	۶۴	مواعظ وخطب	۱۴
عقائد	۱۵	کتب مذاہب عالم	۲۳
مناظرہ وکلام	۱۳۶		

۲- جغرافیہ

کتب جغرافیہ	۱۱	سفرنامے	۴۱
نقشے	۹		

۳- تاریخ

تاریخ قدیم	۴	تاریخ فرق اسلام	۴
تاریخ مصر	۲	مستقبل اسلام	۳
ایران	۷	اندلس	۷
یونان	۳	مراکش	۲
رومہ	۱	تونس وطرابلس	۲
چین وجاپان	۴	افغانستان	۴
تاریخ قبل اسلام	۱۵	تاریخ عام ہندوستان	۱۷
تاریخ خلفاء	۲۶	دکن ومہاراشٹر	۱۲
تاریخ تمدن اسلام	۹	لکھنؤ بھوپال وگجرات	۱۰

تاریخ تمدن	۹	سیاسیات ہند	۰۵

۴- سوانح

انبیاء	۵	شاہان اسلام	۳۷
سیرۃ نبوی	۱۷	مشاہیر عالم	۴۲
سیر رجال	۱۲۵	خواتین عالم	۶
خواتین اسلام	۲۰	تذکرۂ شعراء	۱۷

۵- نظم و ادب

منظومات	۲۰۱	مباحث شعر و ادب	۲
دواوین شعرائے قدیم	۶۰	قواعد و عروض	۲۸
شعرائے جدید	۵۰	خطوط	۱۸
نعتیہ	۱۱	متفرقات	۷۰
مثنویات	۱۵	لغات و محاورات	۵۲
مرثیے	۱۶		

۶- اخلاق و معاشرت

اخلاق قدیم و جدید	۶۲	معاشیات و اجتماعیات	۱۸

۷۔ نسائیات

عورتوں کی معاشرت	۴۵	خانہ داری	۱۴۲
زنانہ قصے	۵۲		

۸۔ علوم

فلسفہ و منطق	۴۲	ریاضیات	۸
سائنس اور فلکیات	۴۴		

۹۔ قصص

پرانے قصے	۱۹	ناول	۲۲۰
افسانے	۱۶	ڈرامے	۲۸

۱۰۔ متفرقات

تقریریں	۲۳	زراعت و باغبانی	۲۲
طب	۶۰	فہرست کتب	
صنعت و حرفت	۳۲	درسیات اردو	۶۳
تجارت وغیرہ	۸	تعلیمیات	۱۵
باورچی خانہ	۸	رسائل مختصرہ	۱۳۰

سالانہ روداد میں	۶۶	ماہانہ رسائل	۳۲۰

اسی احاطہ میں بھی اردو کی مطبوعہ کتابوں کا ایک دوسرا کتب خانہ ۱۹۰۹ء میں بڑودہ میں نواب سید صدر الدین خاں مرحوم کے پاس دیکھا، اب اُن کی وفات کے بعد جب ۱۹۳۱ء میں بڑودہ گیا، تو وہ جامع مسجد بڑودہ میں منتقل ہو گیا تھا، چنانچہ وہ اس وقت بھی وہیں ہے، اُن کے صاحبزادہ سید معز الدین خاں نے بتایا کہ اس میں کچھ ہزار کتابیں ہیں، تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

دکن کے ایک دوسرے سرے پر یعنی بنگلور میں مسلم لائبریری ۵۰ برس سے قائم ہے، مجھے اس کے دیکھنے کا اتفاق ۱۹۲۵ء میں ہوا تھا۔ کتابوں کی تعداد معلوم نہیں۔

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے پاس بھی اردو کا بڑا کتب خانہ ہے، لیکن اس کی فہرست دریافت نہ ہو سکی، تاہم یہ معلوم ہے کہ قدیم اردو کتابوں کا قلمی سرمایہ اس کے پاس سب سے زیادہ ہے، اور جن کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے، ہمارے دوست ڈاکٹر سید ضیاء صاحب (الہ آباد) کے پاس بھی قدیم اردو کی کچھ قلمی کتابیں ہیں۔

رنگون میں لائبریری رام آبجہانی کا کتب خانہ جس میں قلمی دیوان اور تذکرے تھے اب ہندو یونیورسٹی بنارس کی ملکیت ہے۔

اہم تصنیفات

ان اداروں کے ذریعے اور مختلف ذاتی کوششوں سے ہندوستانی زبان میں ہر سال لغت و تصنیفات کا سلسلہ اتنا آگے کو بڑھ رہا ہے، جو اگر تشکر کے لائق نہیں تو شکوہ کے لائق بھی نہیں، معارف کے چند سال کی تنقیدات سے ان کی سالانہ فہرست یہ اندازہ آئی ہے، جو ظاہر ہے کہ اصل تعداد سے بہت کم ہے۔

سنہ	کتابیں	رسالے	میزان
سنہ ۱۹۳۱ء	۷۳	۳۲	۱۰۵
سنہ ۱۹۳۲ء	۱۱۱	۱۸	۱۲۹
سنہ ۱۹۳۳ء	۶۰	۳۰	۹۰
سنہ ۱۹۳۴ء	۱۳۹	۴۵	۱۸۴
سنہ ۱۹۳۵ء	۱۴۷	۳۵	۱۸۲
سنہ ۱۹۳۶ء	۹۵	۳۸	۱۳۳

یہ ایک رسالہ کی تنقیدات کی تعداد ہے

بہرحال اس وقت ہندوستانی زبان کا سب سے بڑا تصنیفی ادارہ سررشتۂ تالیف وترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ہے، یہ ادارہ سنہ ۱۹۱۷ء سے کام میں مشغول ہے، اس وقت تک مختلف علوم وفنون کی ۲۳۶ کتابیں اس نے شائع کی ہیں، ۲۰ کتابیں زیر طبع ہیں۔ اور ۱۰۵ کتابیں زیر ترجمہ وتالیف ہیں، اور ۱۱۹ کتابیں زیر تجویز ہیں، ان کی فن وار فہرست درج ذیل ہے۔

فہرست کتب دارالترجمہ حیدرآباد دکن

تا نومبر سنہ ۱۹۳۶ء

شمار	علوم	شائع شدہ	زیر طبع	زیر ترجمہ یا تالیف
۱	مصطلحات	۰	۰	۱
۲	تاریخ ہند	۳۲	۶	۱۵

شمار	علوم	شائع شدہ	زیر طبع	زیر ترجمہ یا تالیف
۳	تاریخ یورپ	۱	۱	۰
۴	تاریخ انگلستان	٦	۱	۱
۵	تاریخ یونان	۸	۰	۰
٦	تاریخ روما	۸	۰	۰
۷	تاریخ اسلام	۱۸	۰	۲۵
۸	جغرافیہ	۵	۰	۰
۹	سیاسیات	۷	۱	۷
۱۰	دستورِ انگلستان	۳	۱	۰
۱۱	معاشیات	۹	۴	۵
۱۲	عمرانیات	۲	۰	۰
۱۳	منطق	۴	۰	۰
۱۴	نفسیات	۱۰	۲	۰
۱۵	فلسفہ	۱۲	۴	٦
۱٦	مابعد الطبعیات	۲	۱	۰
۱۷	اخلاقیات	۹	۰	۱
۱۸	قانون	۱۰		۳
۱۹	ریاضیات	۲۲	۵	۵
۲۰	طبعیات	۲۱	۰	۲

شمار	علوم	شائع شدہ	زیر طبع	زیر ترجمہ یا تالیف
۲۱	کیمیا		۱	۰
۲۲	نباتیات	۰	۳	۰
۲۳	حیوانیات	۰	۲	۰
۲۴	طب	۹	۱۰	۱۹
۲۵	انجینئری	۱۷	۱۸	۸
۲۶	فن تعلیم	۰	۰	۳۰
۲۷	میزان	۲۳۶	۶۲	۱۰۵

انجمن ترقی اردو کے مطبوعات کی تعداد ۹۵ ہے، جس میں تذکرے، قواعد، ریاضیات، معاشیات، تعلیمات، طبیعیات، نفسیات، ارتقاء، نباتیات اور تاریخ کی کتابیں داخل ہیں، ان کی فن وار تقسیم یہ ہے۔

۱	ادب	۳۵	ان میں ۵ شعرائے قدیم کے تذکرے اور ۶ اردو کی قدیم کتابیں ہیں۔	
۲	تاریخ و سیر	۱۵	۷ درسی	۱۵
۳	سائنس	۱۲	۸ مذہب	۲
۴	تعلیم	۲	۹ لغت	۱
۵	فلسفہ	۳	۱۰ معاشیات	۱
۶	قواعد زبان و لسانیات وغیرہ	۷	حفظان صحت	۱۰
				۹۵

ہندوستانی اکیڈیمی نے اپنی دس برس کی زندگی میں اردو کی چھبیس (۲۶) کتابیں شائع کی

ہیں جس کی تفصیل یہ ہے۔

تمدنی تاریخ	۴	تعلیم و تربیت	۱
اقتصادیات	۲	سیاسیات	۱
حیاتیات	۱	ترجمے	۳
فلسفہ	۲	انتخابات و دواوین	۲
ادبیات	۵	ادب اردو کی پیمائش	۱
سیاسی تاریخ	۲	متن کتب	۲
		میزان	۲۶

ذکر کے قابل پنجاب یونیورسٹی کے مطبوعات بھی ہیں، یہاں سے تذکرہ اور تاریخ اردو کی کتابیں شائع ہوئی ہیں، اسی طرح اسلامیہ کالج پشاور بھی شکریہ کا مستحق ہے، جہاں کے پروفیسروں نے نظریۂ اضافیت اور ہیئت اور فلکیات پر کتابیں شائع کی ہیں۔ انکے علاوہ اردو اکاڈیمی (جامعہ) دہلی ہے جو ہر سال کچھ کتابیں شائع کرتی ہے، جن میں نفسیات، فلسفہ، اقتصادیات، اور سیاسیات کا حصہ زیادہ ہوتا ہے، کتابستان الہ آباد نے تاریخ فلسفہ اور ادب پر متعدد کتابیں چھاپی ہیں، قومی کتب خانہ لاہور نے فلسفہ، ترکوں کی موجودہ تاریخ اور ادبیات لطیفہ کی بعض کتابوں کی اشاعت کی ہے، نظامی پریس بدایوں نے شعر و سخن، مرثیے، دیوان، اور تاریخیں چھپوائی ہیں، انوار بک ڈپو نے بھی تاریخ، سفرنامے اور ادب کی بہت سی کتابیں اضافہ کی ہیں، ایوان اشاعت گورکھپور نے فلسفہ ادب اور افسانوں کے مجموعے شائع کئے ہیں، اردو مرکز لاہور نے منتخبات نظم و نثر کی ۲۰ جلدیں شائع کی ہیں، طبیہ کالج دہلی نے طب کی اہم کتابوں کا اتنا اچھا ذخیرہ ہندوستانی میں جمع کر دیا ہے کہ طبیہ کالج دہلی طبیہ کالج

علی گڑھ، طبیہ اسکول لکھنؤ، اور طبیہ اسکول پٹنہ کی تعلیم کے لئے وہ بہت کچھ کافی ہو رہی ہیں

حیدرآباد میں کئی تجارتی ادارے ہیں جن سے ادب، ادب کی تاریخ تنقید اور افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں، مدراس یونیورسٹی نے بھی اپنے فرض کو محسوس کیا ہے، اور مولوی محوی صاحب لکچرار سو مدراس کی کوشش سے دیوان بیدار، واقعات اظفری کا ترجمہ وغیرہ بعض کتابیں چھاپی ہیں، اب دلی میں حالی پبلشنگ ہاؤس کے نام سے ایک نیا اشاعت خانہ قائم ہوا ہے۔

دار المصنفین کے اشاعت خانہ نے اپنی بائیس سال کی زندگی میں ۴۳ کتابیں شائع کی ہیں جن کی فن وار فہرست یہ ہے۔

۱	سیرت و سوانح	۲۱	۶۔	تصوف	۴
۲	تاریخ	۱۸	۷۔	فقہ	۲
۳	فلسفہ	۱۲	۸۔	مذہب	۳
۴	ادب	۱۱	۹۔	فلسفۂ تاریخ	۱
۵	تعلیم	۳			

سلسلۂ دار المصنفین کا آخری نمبر ۸۰ ہے۔

علوم و فنون

کتابوں کی کثرت اور تعداد کو چھوڑ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی دینیات میں قرآن پاک، حدیث اور فقہ کے بہت سے ترجمے ہو چکے۔ جدید اور قدیم علم کلام کا ذخیرہ بھی اچھا ہے اسلامی قوموں اور ملکوں کی تاریخیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی تاریخیں بھی موجود ہیں، طب، ہومیوپیتھی اور ڈاکٹری کی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں، سائنس اور اقتصادیات کی کتابیں اتنی ترجمہ ہو چکی ہیں کہ ان کے بل پر ایک یونیورسٹی کا پورا شعبہ چل رہا ہے۔

فلسفہ میں افلاطون، برکلے، کانٹ، ہیوم، سوپنہار، برگسان کے فلسفے، ہند و یونانی ہیں

آ چکے ہیں، اسی طرح روسو، نطشے اور ٹالسٹائی کے خیالات بھی اس زبان کا جامہ پہن ہو چکے ہیں، اخلاقیات، نفسیات اور معاشیات کا ذخیرہ بھی قابل قدر ہے، علمی اصطلاحات کی کئی ڈکشنریاں بن چکی ہیں، ترقی اردو نے انگریزی، اردو اور اردو انگریزی ڈکشنری پیشہ وروں کا لغت اور اردو کا عام لغت تیار کیا ہے، دارالمصنفین نے عربی اردو کا لغت لکھوایا ہے، عام لغات میں فرہنگ آصفیہ کے بعد اس عہد میں نیر کاکوروی مرحوم کی نور اللغات اور لاہور میں استعمال کے لئے جامع اللغات کئی جلدوں میں لکھی جا چکی ہے، ان میں گو غلطیاں بھی ہیں، مگر ایک طرح سے انسائیکلوپیڈیا کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے۔

اردو ادب کی تاریخ کے سلسلہ میں پنجاب، صوبہ متحدہ اور دکن کے اہل قلم نے اس صدی میں بہت کچھ کام کیا ہے، اور شک نہیں کہ اس زبان کی پیدائش کی کہانی اب مسلّم تاریخ بن رہی ہے، اس تحقیق کا آغاز ہمارے صوبہ میں مولینا سید عبدالحی صاحب مرحوم کی گل رعنا سے ہوا، اور اس کی تکمیل دکن اور پنجاب کے اہل تحقیق نے کی، ترقی اردو نے شعراء کے پرانے تذکروں اور پرانی زبان کی ابتدائی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے رکھدیا ہے

ہندو مذہب اور تاریخ و تمدن کا سرمایہ بھی اس زبان میں موجود ہے، وید، مہابھارت رامائن، منوشاستر، گیتا، ہندو تہذیب، راجہ یان ہند، قدیم ہند کے ترجمے ہو چکے ہیں، ہندی ادب، ہندی شاعر کبیر داس، ہندی تیوہاروں پر کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر ابھی ذخیرہ ناکافی ہے اور مزید ترقی کا محتاج ہے۔

خاتمہ یہ ہندوستانی زبان کی نصف صدی کی رفتار کا دھندلا خاکہ ہے، معلومات ملک کے گوشہ گوشہ سے اکٹھے نہیں کئے، بلکہ جو کچھ یاد تھے، اُن کو کاغذ پر کھینچ دیا ہے۔

(معارف۔ دسمبر ۱۹۳۷ء)

خطبۂ صدارت شعبۂ اُردو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ

منعقدہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء

اختلاف و اتفاق ہم زبانو! ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی محفل کی صدارت کی عزت دے کر اپنی زبان کی خدمت کا ایک موقع عنایت فرمایا۔ آج کل نہ صرف دنیا ایک نازک دور سے گذر رہی ہے، بلکہ خود ہمارا ملک بھی ایک پُرخطر زمانہ سے گذر رہا ہے، کہ اگر مسلمانوں نے تھوڑی سی غفلت برتی تو پھر اُس نقصان کی تلافی صدیوں میں بھی نہیں ہو سکتی، ہم سیاسیات میں کتنے ہی مختلف ہوں، مگر اس بارہ میں ہم میں سے ایک کو بھی اختلاف نہیں کہ ہم کو اس ہندوستان میں مسلمان ہی ہو کر جینا اور مسلمان ہی ہو کر مرنا ہے، البتہ یہ خیال ہمارے ساتھ ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان ہیں، اس لئے ہم پر جس طرح بحیثیت مسلمان ہونے کے فرائض ہیں بحیثیت ہندوستانی ہونے کے بھی ہم پر کچھ حقوق ہیں، اور جہاں تک ہو سکے، ان فرائض اور حقوق کے دوہرے بوجھ کو اٹھا کر ہی آگے کو چلنا ہے، اور ایسی کوشش کرنا ہے، کہ ان دونوں میں ایسی ٹکر نہ ہو جو دونوں کو پاش پاش کر دے، اور اگر ایسا موقع آ ہی جائے تو ظاہر ہے کہ دین و دنیا کا فائدہ تنہا دنیا کے فائدے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

مسلمانوں کا مصالحانہ رویہ ہم نے اس مشکل کو اسی دن سمجھ لیا تھا، جس دن اس سرزمین پر پہلے دن پاؤں رکھا تھا، یہ اُسی رواداری اور صلح جوئی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان اس

ملک میں خواہ عرب سے آئے، ترکستان اور خراسان سے آئے، ایران سے آئے افغانستان سے آئے، مگر یہاں آ کر نہ وہ عرب رہے، نہ ترک رہے، نہ ایرانی رہے، نہ افغانی، خالص ہندوستانی ہو گئے، عربوں نے عربی، ترکوں نے ترکی، ایرانیوں نے فارسی اور افغانوں نے پشتو چھوڑ کر اسی دیس کی بولی اپنی بولی بنائی اور ایسی بنائی کہ وہ اس زبان میں شاعری اور انشاپردازی کرنے لگے، اُردو تذکرہ کی کتابوں میں بیسیوں ایسے شاعر ملیں گے جن کے حال میں لکھا ہوگا، کہ ان کے باپ دادا عرب، ایران اور ترکستان سے آئے، مگر وہ خود اسی ملک کی زبان بولنے اور اس میں دادِ سخن دینے لگے۔

اُردو اور ہندی کا فرق

آج ہمارے دیس کی جو بولی ہے، اور جس کو آج سب ہندو مسلمان بول رہے ہیں، وہ اسی دیس کی پیداوار ہے، وہ عرب، ایران، ترکستان سے نہیں آئی، فرق اتنا ہے، کہ مسلمانوں نے اپنی زبانوں کے کچھ لفظ بھی اس میں ملا دیئے اور ایسا ہونا ضروری تھا، زبان بولنے والوں کی ضرورتوں کی بنا پر اختلاف ہونا ضروری ہے ایسے اختلاف سے ایک زبان دو نہیں بن جاتی، مسلمانوں کا ایمان، ایمان ہی رہے گا، اور ہندوؤں کا دھرم دھرم ہی رہے گا، ہمارا مذہبی فاقہ روزہ کہلائے گا اور ان کا برت ہم حج اور زیارات کرتے ہیں، اور وہ تیرتھ، ہمارا مردہ جنازہ ہوتا ہے اور ان کا ارتھی، ہم مرکر دفنائے جاتے ہیں اور وہ جلائے جاتے ہیں، لیکن اس اختلاف کو اتنا بڑھانا کہ ہم پانی پئیں اور وہ جل، ہم اور کہیں اور وہ تھا، اور ایسے ہی اختلافوں کو اور بڑھا بڑھا کر ایک بولی کو دو بنانے کی کوشش کرنا ہمارے نزدیک مسلمانوں کا جرم عظیم اور ہندوؤں کا مہا پاپ ہے

ہندو مسلمانوں کے ہزار سالہ سمجھوتہ کی یادگار

یہ زبان جس کو ہم ہندو مسلمان آج بول رہے ہیں، یہ آج نہیں ایک ہزار برس میں بنی ہے، اس کے بنانے میں

ہندو مسلمان بزرگوں کی ایک ہزار برس کی عمریں بیتی ہیں، یہ ہندوستان میں مسلم ہندو سمجھوتہ کی سب سے بڑی یادگار ہے، جو لوگ اس زبان کو مٹانا چاہتے ہیں۔ وہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات کو نئے سرے سے بگاڑنا چاہتے ہیں، اور ایک ہی ملک، ایک ہی صوبہ بلکہ ایک ہی شہر بلکہ ایک ہی گاؤں میں دو ایسی برابر کی قومیں پیدا کرنا چاہتی ہیں جو ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھ سکیں، اور جب ایک دوسرے کی زبان نہ ملے گی تو دل کیا ملے گا۔

کیا یہ زبان بدیسی ہے

ہندو بھائیوں کے ایک طبقہ میں اس زبان کے خلاف جو جذبہ کام کر رہا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ بولی بدیسی ہے، اور قومیت پروری کا اقتضا یہ ہے کہ ہم اپنے دیس کی بولی بولیں، اور بدیسی بولی کو چھوڑیں، حالانکہ کوئی زبان چند بدیسی عربی اور فارسی لفظوں کے مل جانے سے عربی اور فارسی نہیں بن جائے گی، جیسے چند انگریزی لفظوں کے ملنے سے انگریزی نہیں بن جاتی، اگر ہم کو بدیسی سے ایسی ہی چڑھ ہے تو پہلے یہاں سے مسلمانوں کو نکالنا چاہیے، عیسائیوں کو نکالنا چاہیے، پارسیوں کو نکالنا چاہیے، انگریزی علوم کو نکالنا چاہیے، بلکہ تمام یورپین تجارات اور وہاں کی مصنوعات سے ملک کو خالی کر دینا چاہیے، بلکہ خود سنسکرت کو یہاں سے خارج کیجیے، کہ وہ بھی سنٹرل ایشیا سے آئی ہے، اور برہمنوں کو بھی نکالیے کہ وہ بھی باہر سے آئے ہیں۔

دو راہیں

صاحبو! راہیں دو ہیں ایک یہ کہ ہم یہ سمجھیں کہ ہندوستان خالص ہندوؤں کا ملک ہے اس میں جو کچھ ہو وہ خالص ہندوانی ہو، زبان وہی ہو، لباس وہی ہو، تعمیر وہی ہو، مذاق وہی ہو، علم و فن وہی ہوں۔ اور جو کوئی اس ملک کی چہار دیواری کے اندر رہے، وہ اسی کا محکوم ہو کر رہے، یہ راہ بیحد خطرناک اور مشکلوں سے

بھری ہوئی ہے۔ اور اس راہ کی کامیابی میں بہت کچھ شک کیا جا سکتا ہے، دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ ہندوستان ایک گلدستہ ہے جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہیں۔ ؎

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ہیں رنگ و بو کے اس اختلاف کے باوجود وطن خواہی کے دھاگہ نے ان سب کو ایک جگہ باندھ کر ایک بنا دیا ہے، یہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی قوم زندہ رہ سکتی ہے اور کُل کا جز بن کر کُل کی طاقت کا باعث ہو سکتی ہے۔

تنگ نظری کا برا نتیجہ | میرے نزدیک کسی ہندو طبقہ کا قومیت و وطنیت کے مفہوم کو اتنا تنگ سمجھنا کہ خود اس ملک کے مختلف بسنے والے بھی یہاں کے اصلی رہنے والے ثابت نہ ہو سکیں، ان کی وہی موروثی اور پرانی تنگ خیالی ہے جس نے تاریخ میں ان کو ہمالہ اور سمندر کی چہار دیواری میں بند، اور ان میں چھوت اور اچھوت کی پرانی لڑائی ہزاروں برس سے کھڑی کر رکھی ہے اور جس نے تاریخ کے ہر دور میں ان کے اندر نفاق پیدا کیا ہے، اور ان ہی کے اندر کے مظلوم فرقوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ غیر کا سہارا ڈھونڈیں اور باہر والوں کو اپنی مدد کے لئے اپنے گھر بلائیں اور نتیجہ میں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی غلامی کی زنجیروں میں اسیر کرائیں، یہ ایک تاریخی نکتہ ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، لیکن جس کو کسی موقع پر بھولنا نہیں چاہیئے۔

یہ زبان خالص اسلامی نہیں | اس زبان کو جو اس وقت ملک کے بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اسلامی بولی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے، یہ ہندو مسلمانوں دونوں کی مخلوط

اور کوششوں سے بنی اور پروان چڑھی ہے، یہ حقیقت ہے لیکن اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش برابر جاری ہے، لیکن حقیقت کی سچائی چھپائے نہیں چھپ سکتی، ہم خود بھی اس غلطی میں تھے، کہ شاید تیس چالیس برس کی لگاتار کوششیں اس حقیقت پر پردہ ڈال چکی ہیں، مگر پچھلے سال "اردو دن" منانے کی جو تحریک ہوئی اور اس میں پنجاب سے لے کر بہار تک کے مسلمانوں کے ساتھ ہندو دوستوں نے بھی جو دلچسپی لی اور جو تقریریں کیں ان سے یہ پتہ چلا کہ یہ زبان ملک کی زبان ہی پر نہیں، بلکہ دل میں بھی اتر چکی ہے، اور حقیقت کے پہچاننے والے ہندو دوست بھی اس کی سچائی کو دل سے مانتے ہیں، اور اسی کو اپنی مادری زبان جانتے ہیں خصوصیت سے سر تیج بہادر کی وہ فاضلانہ تقریریں جو الہ آباد، لکھنؤ، پٹنہ، حیدر آباد، اور ابھی کشمیر میں ہوئیں ان سے ہم کو پوری طرح یقین ہوتا ہے کہ ملک میں بہت سے ایسے سمجھدار ہندو ہیں جو سچائی کے ساتھ اس حقیقت کو مانتے ہیں، اور ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ سنسکرتی ہندی کے خواہش مند دراصل ملک کے باشندوں کے درمیان تفریق اور عناد کا بیج بو رہے ہیں۔

سنسکرت کی ہندی اس ملک کی بولی نہیں

الہ آباد یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر پروفیسر جھا نے بھی چند مہینے ہوئے گوالیار میں ایک تقریر فرمائی ہے جس میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سنسکرتی ہی ہندی ہندوستان کی زبان عالمگیر بن سکتی ہے" یہ خیال واقعات اور عملی سیاسیات سے قطع نظر کرکے اور یہ سمجھ کر ظاہر کیا گیا ہے کہ گویا ہندوستان میں آریہ برہمنوں کے سوا اور کوئی قوم نہیں بس رہی ہے۔ یہ خیال مدراس اور دکن میں ظاہر کیا جاتا تو پروفیسر صاحب کو معلوم ہو جاتا کہ یہ واقعات کی منطق سے کس قدر دور ہے، وہاں

کی ڈراوڑی قومیں جو تامل، تلگو اور کنڑی بولتی ہیں، وہ ہندی پرچار کی اس لئے مخالف ہیں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ہمارے دشمن آریہ برہمن اس بہانہ سے ہماری زبانوں کو اور کلچر کو مٹانا چاہتے ہیں۔ جب یہ خیال ایک ایسے طبقہ کا ہے جو مذہب کی رُو سے گویا ہندو ہی ہے تو ملک کے اس طبقہ کا یہ خیال کیوں نہ ہو جو اتحادِ وطن کے علاوہ ہر حیثیت سے اُن سے الگ ہے

اقلیت کا بچاؤ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ زبان اسلامی زبان ہے، تب بھی یہ کوئی کہہ نہیں سکتا، کہ اقلیت والی زبان کے چل جانے سے اکثریت والی قوم کا رواج و تمدن و تہذیب مٹ جائے گی، وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ہمیشہ قائم رہے گی، جیسا کہ اب تک قائم رہی ہے، لیکن اکثریت کی اس زبان کو جس کے بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، مان کر اقلیت کے خاتمہ میں کوئی شک ہی نہیں رہتا، کیونکہ اس کی عمارت تو اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے ستونوں پر کھڑی رہ سکتی ہے

کیا یہ مسلمانوں کی زبان ہے پنجاب کے ایک ہندو پروفیسر نے یہ بات خوب کہی ہے۔ کہ اردو مادری زبان کی حیثیت سے تو اسی ملک میں بولی جاتی ہے، جہاں ہندو آبادی کی اکثریت ہے یعنی انبالہ سے لیکر بھاگلپور تک، اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، جیسے کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ، پنجاب، اور بنگال وہاں کے ہر ایک صوبہ میں اسی صوبہ کی زبان اُن کی مادری زبان ہے، کشمیر کے مسلمان کشمیری، سندھ کے سندھی سرحد کے پشتو، پنجاب کے پنجابی اور بنگال کے بنگالی بولتے ہیں، اس لئے اس زبان کو اسلامی کہنے کے بجائے ہم ہندو ہی کہہ سکتے ہیں، لیکن باوجود اس کے مسلمانوں نے اس زبان کو قومی اور ملکی یکرنگی کی خاطر اپنی قومی اور ملکی زبان بنایا ہے، اور چونکہ صدیوں سے اس کو اپنی عمومی زبان بنا چکے ہیں، اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب اس

کی جگہ کسی دوسری زبان کو دی جائے۔

کیا ہندو اور مسلمان بنگالی صوبہ دار بولیاں یکساں بولتے ہیں؟

یہاں پر اس غلطی کو بھی دور کر دینا چاہیے، جو اکثر لوگوں کی زبانوں سے نکل جاتی ہے، کہ ان صوبوں میں جہاں صوبہ کی الگ الگ بولیاں ہیں، مسلمان اور ہندو ایک ہی بولی بولتے ہیں، جیسے بنگال میں بنگالی مسلمان اور بنگالی ہندو ایک ہی زبان بولتے ہیں، ایسے ہی گجرات میں گجراتی ہندو اور گجراتی مسلمان، اور مرہٹہ میں مرہٹی ہندو اور مرہٹی مسلمان، اور مدراس میں کنڑی اور تلگو وغیرہ بولنے والے ہندو اور مسلمان ایک ہی بولی بولتے ہیں، مگر یہ سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی، سچ تو یہ ہے کہ بے شبہ ان زبانوں کے فعل اور حرف تو وہاں کے ہندو اور مسلمان ایک ہی بولتے ہیں، مگر اسماء میں ان دونوں قوموں میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا ان کے تمدنوں اور ضرورتوں یا پچھلی روایتوں میں۔ ایک مسلمان بنگالی پروفیسر نے مجھے بتایا کہ مسلمان بنگالی "پانی" بولے گا، اور ہندو بنگالی "جل"، مسلمان بنگالی "خالہ" کو "کھالا" کہے گا اور ہندو بنگالی "موسی" وغیرہ اور گجرات اور مرہٹی کا تو مجھے ذاتی تجربہ ہے، کہ مسلمانی گجراتی، پارسی گجراتی اور ہندو گجراتی میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا ان کی قوموں میں، یہی حال مرہٹی کا ہے کہ مسلمانی مرہٹی ہندو مرہٹی سے امتیاز رکھتی ہے، یہی بات مدراس کی ہندو مسلمان بولیوں میں ہے، اور ایسا ہی ہونا قدرتی بات ہے، ہمارے نزدیک اردو اور ہندی میں بھی اتنا ہی فرق ہونا چاہیے اس سے زیادہ نہیں، لیکن اس کے آگے بڑھ کر یہ کہنا اور یہ سمجھنا کہ سنسکرتی ہندی ہی ہماری اصلی بولی ہونی چاہیے، دیس کے اتحاد

---

[1] اس موقع پر بنگال کے بعض مسلمان مقرروں نے اسلامی بنگالی کی جو عبارتیں پڑھ کر سنائیں، وہ عین اسی دعوے کے مطابق تھیں۔ "س"۔

اور یکتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے۔

سنسکرتی ہندی کے لئے کوشش

ابھی پہلی اکتوبر ۳۹ء کے پائنیر میں الہ آباد یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر سکسینہ کا جو مضمون ہندوستانی زبان پر نکلا ہے، وہ ان کے طبقے کے خیال کا پورا آئینہ ہے۔

صوبہ یو۔پی کے سابق وزیر تعلیم نے اسمبلی کی ایک تقریر میں بہت خوب کہا کہ "نہ ہندو تمدن نہ مسلمان تمدن بلکہ ہندوستانی تمدن" میری عرض ہے کہ اس فلسفہ کو اور آگے بڑھنا چاہیے اور کہیئے کہ نہ ہندو بولی، نہ مسلمان بولی، بلکہ ہندوستانی بولی، لیکن کیا وفاداری کے ساتھ ہم سب اس کے ساتھ ہیں۔

ہمارے سابق وزیر تعلیم نے بنارس میں ہندی کے ایک جلسہ میں فرمایا تھا کہ "اردو ہندی جھگڑے کا فیصلہ قدرت نے خود کر دیا یعنی یہ کہ اب نوّے فیصدی لڑکے ہندی لے رہے ہیں" جہاں تک کاغذ اور امتحان کے پرچوں کا تعلق ہے، یہ بیان ابھی صداقت سے بہت دور ہے، گو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے ہم وطنوں میں جھوٹی قومیت پرستی کا یہی جذبہ رہا تو یہ بیان آگے چل کر واقعی صداقت نہ بن جائے گا۔

بہار میں ہندوستانی کی کوشش

صوبہ بہار میں جو ہندوستانی کمیٹی دو سال سے بنی ہے، اس میں اسی کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اونچی اردو اور کڑی ہندی سے اتر کر بیچ کی ہندوستانی کو ادب اور تعلیم کی زبان بنا کر پھیلایا جائے، چنانچہ اسی اصول پر ڈاکٹر تارا چند اور مولوی عبدالحق صاحب ہندوستانی لغت اور ہندوستانی اصطلاحوں کا کام کر رہے ہیں، اور ہم لوگ ہندوستانی ریڈروں کی زبان درست کرنے کا کام اپنے ذمہ لے رہے ہیں، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ اس تحریک کے دبانے کیلئے کیا کچھ نہیں کیا

جارہا ہے، اور اس کی کھلی مثال پروفیسر سکسینہ کی مذکورہ تحریر میں ہے، جو انھوں نے بہار کی ہندوستانی کمیٹی سے استعفا دیتے ہوئے لکھی۔

یو۔پی کا سرکاری خیال | یو۔پی کی کانگریسی حکومت کے صیغۂ تعلیم کا غالباً یہ منشا تھا کہ اردو اور ہندی کو ابھی ایک ساتھ چلنے دیا جائے، لیکن قومی کوششوں کے علاوہ سرکاری امدادی ذریعوں سے بھی ایسی کوشش کی جائے کہ سنسکرتی ہندی کا پلہ دن پر دن بھاری ہوتا جائے، یہاں تک کہ اردو کس مپرسی سے اپنی موت آپ مرجائے اور سنسکرتی ہندی ہر جگہ چھا جائے، پھر اس وقت کا وزیر تعلیم بے جھجک یہ کہہ سکے گا کہ اردو ہندی کا فیصلہ خود بخود ہوگیا، کیونکہ اب سو فیصدی لڑکے ہندی پڑھ رہے ہیں۔

پہلے تو اکیلے میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں میں لڑکوں کو ہندی پڑھانے پر زور دیا جاتا تھا، اور اردو کے استاد نہ ہونے یا نہ رکھنے کے سبب دیہاتی لڑکوں کو ہندی سیکھنے پر مجبور کیا جاتا تھا، یا وہ مجبور ہوتے تھے، اب آج کل کی روشنی میں یہ اندھیر ہو رہا ہے کہ ہندی کی کوششوں میں اوپر سے نیچے تک سرکاری عہدہ دار اس کام میں لگے ہوئے ہیں، جگہ جگہ دورے کرتے ہیں جلسوں میں اپنی جج کی حیثیت سے جاتے ہیں اور ہندی کی ترقی کے لئے پورا زور دکھاتے ہیں، حالانکہ ان کو یا دونوں کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرنا یا دونوں سے ناطرفدار ہو جانا چاہیئے تھا، میرے خیال میں یہ کانگریس کے ساتھ ہمدردی نہیں، بلکہ کھلی دشمنی ہے، اور مسلمانوں کے ذہن میں یہ غلطی بٹھانی ہے کہ جب ہم آدھا اختیار پاکر یہ کر رہے ہیں، تو پورا اختیار پاکر کیا کچھ نہ کریں گے ملک کی پالیٹکس پر اس غلطی کا جو برا اثر اب پڑ رہا ہے، اور جو آگے پڑے گا۔ وہ چھپا نہیں ہے میں نے اس وقت صفائی سے جو کچھ کہا ہے، امید ہے کہ ہمارے دوست اس کو نیک نیتی

سے سنیں گے اور کہنے والے کی بھی نیک نیتی سمجھیں گے۔

زبان کی کسوٹی | زبان کے مسئلہ میں ہماری پالیسی کھلی ہوئی یہ ہونی چاہیئے، کہ زبان وہ ہے جو بازاروں میں بولی اور عدالتوں اور اسٹیشنوں میں سمجھی جاتی ہو، اور جو ہندو مسلمان دونوں کے بیچ میں سمجھنے اور سمجھانے کے کام میں آتی ہے، وہ نہیں جو شستہ شستہ ساگروں اور قاموسوں میں لکھی ہوئی ہے، اس بولی کے لفظ بازار کے چلتے ہوئے سکّے ہیں، نہ کہ کونوں اور گوشوں میں پڑے ہوئے زنگ کھائے ہوئے غزنوی اور بکرماجیت کے زمانوں کے سکّے، جن سے پرانی یادگاروں کے اور پرانی تاریخ کے شائق تو فائدہ اٹھا سکتے ہیں مگر ان سے بازاروں کے چلن کا کام نہیں لیا جا سکتا۔

اردو کے حامیوں کی سست کاری | مسلمان اس مسئلہ میں بھی کوتاہی کر رہے ہیں، جو ان کے ہر قومی کام میں ہے، یعنی یہ زبان اور قلم کے تیر بنے ہوئے صرف بول رہے اور لکھ رہے ہیں، کچھ کر نہیں رہے ہیں، ان کو یہ یقین کرنا چاہیئے کہ زبان اور قلم کے یہ بند اس سیلاب کے دھارے کو نہیں روک سکتے، جو پورے زور سے بہہ رہا ہے، ضرورت ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلائیں، اپنی گاڑھی کمائی کے کچھ ٹکڑے، مانگنے والوں کی جھولی میں ڈالیں ان پڑھوں کو پڑھانے کی جو تحریک دو برسوں سے چل رہی ہے، ہمارے نوجوان اس کے لئے ابھی تک کچھ نہیں کر سکے ہیں، کچھ برسوں کے بعد معلوم ہو جائے گا، کہ اردو اور ہندی پڑھے لکھوں میں تعداد کا کتنا بڑا فرق ہو گیا، اور اس فرق کی وجہ سے اگر کوئی نتیجہ ہماری توقع کے خلاف نکلے تو اس کی ذمہ داری ہمارے ہی سر ہوگی۔

کچھ کام کی باتیں | پورے ملک میں انجمن ترقی اردو کے علاوہ اردو کی دیکھ بھال اور ترقی کے لئے کوئی دوسری انجمن نہیں ہے، اور اس کی شاخیں بھی صرف بڑے بڑے

صوبوں تک ہیں، شہر شہر اس کی شاخیں اور ان شاخوں میں کام کرنے والے لوگ نہیں، جب تک ہم پوری سرگرمی اور جوش و خروش سے کام کو نہیں کریں گے، اس کا ہونا معلوم۔

بڑی بڑی کتابوں اور تصنیفوں کو چھوڑ کر جن کے پڑھنے والے کم ہیں، ہم کو عوام کی خاطر چھوٹی چھوٹی عام پسند کتابیں اور رسالے سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر پھیلانا چاہیئے، بلکہ اگر ہو سکے تو ہندی خط میں صاف ستھری بولی کی کتابیں بھی لکھوائی اور چلائی جائیں۔ اور بتایا جائے، کہ ہم اس ہندی کے خلاف نہیں جو ہندو مسلمان دونوں کی زبان ہے۔

زبان کا صحیح درجہ

ملک کی زبان کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے صحیح راستہ یہ ہے، کہ ہندوستانی اردو یا اس کو آسان ہندی کہہ لیجئے، ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے، اور خالص ہندی کی حیثیت وہ ہے جو مسلمانوں کی فارسی کی ہے، اور سنسکرت کا درجہ عربی کا ہے، اگر ہم سب اس تصفیہ پر ایک ہو جائیں تو ہماری سب مشکلیں دور ہو جائیں، مگر افسوس ہے کہ ملک میں ایک طبقہ ایسا ہے، جو نہ صرف ہندی بلکہ سنسکرتی ہندی کو ہندوستان کی زبان بنانے پر تلا ہے، اور وہ ایک ایسی غلطی کر رہا ہے، جس سے قومی تنگ دلی کے سوا کوئی دوسرا فائدہ نہیں پہونچ سکتا، اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ملک دو حصوں میں بٹ جائے۔

اس زبان میں ہندوؤں کا حصہ اب بھی ہے

ابھی تک، گو کہ چالیس برس سے یہ طبقہ یہ سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا ہے کہ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے۔ پھر بھی واقعہ یہ ہے کہ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان باقی ہے ہندو اخبار اور رسالے

اس زبان میں نکل رہے ہیں، ہندو مصنف اس زبان میں کتابیں لکھ رہے ہیں، ابھی ستمبر کے اخیر میں یوپی سرکار کے صیغۂ توسیع تعلیم میں دیہاتی لائبریریوں کے لئے کتابیں مانگی گئی تھیں، اس سلسلہ میں ۱۸ سو اردو کتابیں اور ۷۱ اردو کے مسودے اس صیغہ کو موصول ہوئے، ان چھپی ہوئی کتابوں میں آدھی سے کچھ کم کتابیں ہندو مصنفوں کی تھیں، اور مسودوں میں ۷۱ میں سے ۴۶ مسودے ہندو مصنفوں نے بھیجے تھے، ہم اس واقعہ سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سمجھدار ہندو طبقہ جس نے تنگ خیالی سے اپنے کو اونچا رکھا ہے، ابھی تک ہمارے بزرگوں کے اس فیصلہ کو کہ یہ زبان دونوں قوموں کی مشترکہ میراث ہے، مان رہا ہے، اور اس پر پختگی کے ساتھ یقین رکھتا ہے۔

اردو کے بعض ادبی مورخوں کی غلطی

بعض مسلمان مصنفوں نے جنہوں نے اردو زبان کی تاریخ لکھی ہے، یہ بڑی غلطی کی ہے، کہ اس زبان کی تاریخ لکھتے وقت مسلمانوں کی کوششوں کا ذکر تو پورا کیا ہے لیکن ہندو شعراء اور اہل زبان و اہل قلم کی کوششوں کو نظر انداز کر دیا ہے، ضرورت ہے کہ اب اس زبان کی ایک ایسی تاریخ لکھی جائے، جس میں دونوں کی محنتوں اور کوششوں کی پوری تفصیل ہو، آج یہ واقعہ کس کو معلوم ہے، کہ لکھنؤ میں اردو شاعری کا سب سے بڑا استاد رائے سرب سنگھ دیوانہ تھا، جس کی تربیت کی گود میں لکھنؤ کے اچھے اچھے شاعر مرزا جعفر علی حسرت اور میر حیدر علی حیران پلے تھے، لالہ کانجی لال حیا، بندرابن راقم، پنڈت دیا شنکر نسیم، شگفتہ پنڈت رتن ناتھ سرشار، چکبست، برق، سرور، شاد، نوبت رائے نظر، ساحر دہلوی، دیا نرائن نگم، پریم چند، کشن پرشاد کول، پنڈت برجموہن دتاتریہ وغیرہ کی کوششوں کا پایہ کم نہیں ہے، یہ چند نام یوں ہی زبان پر آگئے ہیں، ورنہ ان کے ناموں اور کاموں

کو جمع کیا جائے، تو ایک دفتر ہو جائے۔

غرض یہ کہ جس راستہ پر ہمارے بزرگ اب تک چلتے رہے ہیں بس وہی راستہ ہمارے اتحاد اور آگے کے کام کی ضمانت ہے، اس کو چھوڑ کر جو دوسرا راستہ اختیار کیا جا رہا ہے، وہ ہم سب کو گمراہ کر دے گا۔

سنسکرتی ہندی کی ایک دلیل کی کمزوری

یہ کہنا بھی درست نہیں کہ چونکہ ہم کو بنگال، مہاراشٹر، مدراس کے لوگوں کو ملا کر چلنا ہے، جن کی صوبہ وار زبانیں سنسکرت ماخذ سے ملتی ہیں، اس لئے سنسکرتی ہندی ہی ان سب کو ایک کر سکتی ہے، یہ دلیل ایک آنکھ بند کر کے پیش کی جاتی ہے، اگر ہم دونوں آنکھیں کھول کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہم نے یہ دلیل دیتے وقت واقعی ایک آنکھ بند کر لی تھی، اس لئے ہم نے آدھے ہندوستان کو دیکھا، اور آدھے کو نہیں دیکھا، کیا ہندوستان میں کشمیر، سرحد، سندھ، بلوچستان اور پنجاب نہیں، پھر ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے ان لوگوں کی زبانوں کے اصلی ماخذوں سے کیوں آنکھیں بند کر لی جائیں، اس کے علاوہ دراویڈی زبانوں سے کیوں غفلت برتی جائے، جن کو نہ اردو سے لگاؤ ہے، نہ ٹھیٹھ ہندی سے، اس پر بھی اسلامی عہد اس کے حصہ میں اردو بولی اور اس سے زیادہ سمجھی جاتی ہے، اور ملیبار تک اس کا نشان پایا جاتا ہے۔

ایک اعتراض کا جواب

الہ آباد یونیورسٹی کے لائق پروفیسر جھا نے اپنی ستمبر ١٩٣٩ء کی گوالیار والی تقریر میں فرمایا ہے:

اردو ڈیڑھ سو برس سے اتر ہندوستان کے ان شہروں کی زبان ہے جو اسلامی تہذیب کے مرکز تھے، اور مسلمانی درباروں کی اور ان کی جو ان درباروں سے

لگاؤ رکھتے تھے، مشترک زبان تھی، اور جس کی شاعری کا وزن و محاورہ اور مثلیں کوئی چیز ہندوستانی نہیں۔

"اُردو" کا لفظ گو بہت پیچھے کا ہے، اس لئے میں اس نام کو صحیح نہیں سمجھتا، لیکن اس سے مقصود تو وہ زبان ہے، جو مسلمانوں کے یہاں آنے سے پہلے سندھ یا پنجاب یا ہریانہ اور دہلی کے آس پاس بولی جاتی تھی، اور جس میں مسلمانوں کے آنے سے کچھ ان کی ضرورت کے عربی فارسی یا ترکی لفظ ایسے گھل مل گئے کہ وہ اصلی معنوں میں بہت کم رہ گئے، کیا اس زبان کی تاریخ ڈیڑھ سو برس کی ہے، اور کیا وہ مسلمان درباروں میں بنی ہے، اور کیا اس کے خیالات، محاوروں اور مثلوں میں کوئی چیز ہندوستانی نہیں، رسالہ ہندوستانی کے کسی پچھلے نمبر میں شاہ معین الدین ندوی کا وہ مفصل مضمون چھپ چکا ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ اس زبان میں ہندی تمدن اور تہذیب کا کتنا بڑا حصہ ہے۔

اردو میں جو تاریخی اور فرضی نام اس کے ادب کا جزو ہیں، ان میں اسلامی اور غیر اسلامی سب ہی قسم کے نام ہیں، رستم، سہراب، حاتم، سکندر، دارا، افلاطون، ارسطو، جمشید، فرعون، نمرود، ان میں کوئی بھی مسلمان نہیں، یہ اسلام سے پہلے کے عربی یا اسلام سے پہلے کے ایرانی، مصری اور یونانی نام ہیں، یہ نام پچھلی دنیا میں وہی حیثیت رکھتے تھے، جو آج نپولین، قیصر، ساسبری، بسمارک، جارج، واشنگٹن، ہٹلر، مسولینی وغیرہ رکھتے ہیں، جن کا تعلق قوموں سے نہیں، بلکہ دنیا سے ہے انھیں میں وہ نام بھی ہیں جن کو ہمارے ہندوستان نے پیدا کیا ہے، جیسے بھیم، ارجن، کرشن، رام، سیتا، گوتم بدھ، بھگت وغیرہ، یا جو الطالب قصے ہیں۔ جیسے مہابھارت

رامائن، مہابھارت، ملاپ، گرپائن یا تہوار ہیں، جیسے ہولی، بسنت وغیرہ یہ سب ہمارے زبان کی مثلوں اور مثالوں میں وقت پہ کام آتے ہیں، اور زبان میں بڑا مزہ دیتے ہیں، جو قوم رستم اور سہراب، سکندر اور دارا کے ناموں اور کاموں سے خوش ہو وہ بکرماجیت اور رام چندر کے ناموں اور کاموں سے کیوں خوش نہ ہوگی، جو مذہبی حیثیت اُن کی ہے وہی ان کی ہے، پھر ایک سے محبت اور دوسرے سے نفرت کی کوئی وجہ نہیں۔

اصل ہندی سے مسلمانوں کا لگاؤ

ہندوستان کی وہ میٹھی اور پیاری بولی جس کا نام اصل میں ہندی ہے، وہ ہمارے بزرگوں میں پہلے بھی مقبول تھی، اور اب بھی ہے، اچھے بڑے صوفی بزرگوں کی محفلوں میں حضرت سید حسینی گیسو دراز اور سعد اللہ فرانہ لکھنوی کے نام سے وہ گائی جاتی تھی اور اب بھی گائی جاتی ہے، اور اس میں کبت اور گیت کہے جاتے تھے، اور وہ مسلمان جو پریم اور محبت کی اس پیاری بولی میں شاعری کرتے تھے، سینکڑوں سے زیادہ ہیں، لیکن جو ہندی آج پھیلائی جا رہی ہے، فورٹ ولیم کالج سے پہلے وہ موجود نہ تھی، اس کا پتلا انگریزوں کی سیاسی جادوگری سے بنا ہے، اور اسی سے اس میں جان پڑی ہے، اور اسی جادو کا کھیل ہے کہ جو آج ہندی اُردو جھگڑے کی شکل میں دونوں قوموں کو اب تک لڑا رہا ہے، یہ حقیقت ہے، اور اس حقیقت کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔

صوبوں کی مقامی بولیاں بھی اسلامی درباروں میں رہی ہیں

اگر کسی زبان کا کسی اسلامی دربار سے لگاؤ رکھنا کوئی پاپ ہے، جو معاف نہیں ہو سکتا، تو میں کہتا ہوں کہ آج صوبہ کی اکثر بولیاں جو زبان کے درجہ کو پہنچی ہیں، اکثر اسلامی دربار کی سرپرستی میں پھلی اور پھولی ہیں، جیسے بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ، کیوں کہ سنسکرت کے سوا ایسی چھوٹی

چھوٹی زبانیں مسلمانوں سے پہلے پڑھنے لکھنے میں کام نہیں آتی تھیں، ان مقامی بولیوں میں لکھنا پڑھنا اور ان کو ادب کا درجہ دینا اسلامی درباروں کی سرپرستی کا نتیجہ ہے، تو پھر کیا یہ زبانیں اس لئے آج بھارت ورش سے نکال دی جائیں گی کہ وہ اسلامی درباروں سے لگاؤ رکھنے والوں نے پھیلائی ہیں، اور ان ہی درباروں کے سایہ میں وہ پھولی پھلی ہیں، ان ساری زبانوں میں بڑی بہتات سے عربی فارسی کے ضروری لفظ بھی ملتے ہیں، لیکن اس پر بھی وہ ناپاک نہیں ہوئیں۔

تیسری دلیل کی کمزوری | یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ہندی دیہاتوں کی زبان ہے، اور اردو شہر کی، دیہات اور شہر دونوں کی بولی ایک ہی ہے فرق ان میں وہی ہے جو دیہات اور شہر کی زندگی میں ہے، جو ہندی اخباروں اور رسالوں میں لکھی جاتی ہے، وہ دیہات تو دیہات شہروں میں بھی نہ بولی جاتی ہے، اور نہ سمجھی جاتی ہے، اور اس کا تجربہ ہر روز اور ہر وقت کیا جا سکتا ہے، اور اسی وقت اس دعوی کی سچائی کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

ہندو مسلمانوں سے مخلصانہ اپیل | میں پھر ہندو مسلمانوں دونوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ تنگدلی اور جھوٹی قومیت کی غلط پاسداری کر کے اپنے ملک کو تباہ نہ کریں، اور اس کشتی میں وہ سوراخ نہ کریں جس سے وہ پھر کبھی نہ بن سکے گی، اور جس کا نتیجہ سب کے لئے ایک ہے، میں اپنے اس بیان کو سرتیج بہادر کے اس مخلصانہ اور بہادرانہ بیان پر ختم کرتا ہوں جو انہوں نے ۲۶ اگست ۱۹۴۹ء کو کشمیر میں ایک مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا۔

سرتیج بہادر کا بہادرانہ بیان | آج کل ہندوستان میں زبان کے سوال پر بڑی قیل و قال ہو رہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی زبان

ایسی ہے، جو پشاور سے سی پی تک اور سی پی سے آگے صوبہ بمبئی کے بعض مقامات تک بولی اور سمجھی جاتی ہے، تو وہ اردو اور صرف اردو ہے، وہ لوگ صریح غلط بیانی سے کام لیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں، کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، میں اس دعوے کو تسلیم کرنے سے صاف طور پر انکار کرتا ہوں، اگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اردو ان کی زبان ہے، تو میں اس قول کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اس لئے کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس کے بنانے میں ہندو اور مسلمان دونوں نے برابر کی خدمت انجام دی ہے، اس لئے اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ہندو اُردو کو اپنی زبان نہ سمجھیں، اور اس سے نفرت کریں یا مسلمان اُسے صرف اپنی زبان سمجھیں۔

چند دنوں سے "ہندوستانی" کی ایک نرالی اصطلاح وضع ہوئی ہے، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس اصطلاح سے زبان کی موجودہ نزاع ختم ہو جائے گی، لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے، اس کے برعکس اس اصطلاح نے زبان کے قضیہ کو حل کرنے میں اور زیادہ پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی کوئی ایک زبان ہے ہی نہیں، ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان سب کو ہندوستانی کہا جا سکتا ہے، تامل یا تلگو بھی اسی طرح ہندوستانی زبان ہے، جس طرح کسی اور صوبہ کی زبان ہو سکتی ہے، ہاں اگر ہندوستانی کے لفظ سے وہ زبان مراد لی جاتی ہے جو دہلی میں آج سے پچاس سال پہلے بولی جاتی تھی، یا جو آج زبان لکھنؤ میں رائج ہے تب البتہ میں اس اصطلاح کو ماننے کے لئے تیار ہو سکتا ہوں۔

اُردو ایک ایسی زبان ہے جس میں عربی فارسی اور سنسکرت کے بہت سے

الفاظ شامل ہیں، اس لئے ان زبانوں کے جو الفاظ اردو میں رائج ہو گئے ہیں، ان کو اردو سے خارج کرنا صحیح نہیں ہو سکتا، کوئی وجہ نہیں کہ ہم عربی، فارسی اور سنسکرت کے رائج الوقت الفاظ سے اپنی زبان کو محروم کریں، درآنحالیکہ وہ ہماری زبان کا جزو بن گئے ہیں، اگر کوئی لفظ عربی، فارسی، یا سنسکرت زبان سے لیا گیا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ محض اس بنا پر اردو سے خارج کر دیا جائے البتہ یہ بات بھی غیر ضروری ہے، کہ ہم اردو میں عربی فارسی کے مزید الفاظ شامل کریں اور اس طرح اسے مشکل بنا دیں۔

میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ اردو ایک ایسا مقدس ترکہ ہے، جو ہندوستان کو اپنے بزرگوں سے وراثت میں ملا ہے، اگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اردو صرف ان کی زبان ہے، تو ہندوؤں کو یہ دعوٰی ہرگز نہ ماننا چاہیئے، میں ہندو ہوں، لیکن ہندو ہونے کے باوجود اس حقیقت کا اعلان کرنے میں مطلق کوئی تذبذب محسوس نہیں کرتا، کہ ہماری مادری زبان اردو ہے، ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اردو ایک ایسا رابطہ ہے، جو ہندو مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کر سکتا ہے، اگر ہم نے اس رابطہ کو توڑ دیا، تو ہم ایک بہت بڑے قومی جرم کا ارتکاب کریں گے۔"

اہل بنگال کی خدمت میں کچھ معروضات

آخر میں مجھے اس صوبہ کے اہل ملک کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بنگال میں بنگالی اہمیت صوبہ کی مقامی بولی کی حیثیت سے زیادہ ہے، پھر بھی یہ بھولنا نہ چاہیئے کہ اردو کی پرورش میں، اور ملک کو ایک مشترکہ زبان کے بخشنے میں بنگال کا حصہ کم نہیں ہے مرشد آباد ڈھاکہ اردو ادب کی آخری سرحدیں تھیں، جہاں اردو کے بڑے بڑے شاعروں

نے جنم لیا ہے، اور شہرت کے بال و پر پیدا کئے ہیں، اور شعرائے لکھنؤ کے مقابلہ میں میدان مارے ہیں، اور ان کے دیوانوں پہ نسخ کا قلم پھیرا ہے، محمد صادق اختر عبدالغفور نساخ اور نواب سید محمد آزاد کے نام اردو ادب میں یادگار ہیں، اور آج بھی وحشت کی شکل سے لکھنؤ اور دہلی کی ادبی محفلیں مانوس ہیں، موجودہ اردو ادب کا مافوق انشاء پرداز جس کے قلم میں سحر حلال ہے اسی احاطہ میں سکونت پذیر ہے۔

فورٹ ولیم کالج جس نے اردو کے الجھے ہوئے بالوں میں کنگھی کی، اسی سرزمین کے ایک گوشہ میں تھا، میر امن کا باغ یہیں پہ بہار ہوا، اور حاتم طائی کی محفل نے یہیں آرائش پائی اور اخوان الصفا نے انسانوں کو حیوانوں کا فلسفہ یہیں پڑھایا پھر کتنی عجیب بات ہے کہ جب انگریزوں کی تعلیمی رائے بدلی تو اس سرزمین کو اپنے اس بچہ سے جس کو اس نے گودوں میں پالا تھا، ایسی بیگانگی ہو گئی کہ اب بنگالی اور اردو دو متضاد چیزیں ہیں۔

بنگال کو اس زبان سے اتنی بیگانگی کسی طرح نہیں جتنی مدراس کو ہندی یا ہندوستانی سے ہے، اگر کس کو معلوم نہیں کہ مدراس کی سابق گورنمنٹ نے جب وہاں ہندی یا ہندوستانی کی اشاعت کی ضرورت سمجھی تو دراوڑی قوموں کی ہر قسم کی مخالفت کے باوجود اس کی تعلیم کو ضروری قرار دیا، اور احاطہ مدراس میں اس کی اشاعت پہ ہزاروں روپیہ خرچ کئے، اگر اسی نظیر کو بنگال میں سامنے رکھا جاتا، تو ملک کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو جاتی، اور ہندوستانی صوبوں کی برادری میں بنگال کی اس کوشش کی بڑی تعریف کیجاتی۔

کہا جاتا ہے کہ بنگال میں مسلمانوں کا سب سے بڑا حصہ آباد ہے، اگر یہ سچ ہے

تو بنگال کے کندھوں پر اسلامی ضرورتوں کا سب سے بڑا بوجھ ہے، ہندوستان کی ساری اسلامی برادری نے اردو کو اپنی مشترک زبان مانا ہے اور اس کے پھیلانے اور بڑھانے میں صدیاں گنوائی ہیں، بڑا افسوس ہوگا، اگر ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ اس زبان سے اپنی بے التفاتی کا ثبوت دے۔

آج سارے ہندوستان میں جو اسلامی تحریکیں پھیلی ہیں، اور اسلامی ہندوستان نے جو بڑے بڑے نامور مصنف اور اہل قلم پیدا کئے ہیں بنگال کا بڑا حصہ اس لئے ان سے ناآشنا ہے کہ وہ اس زبان سے جس میں وہ خیالات امانت ہیں بیگانہ ہے۔ اور اس طرح ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ اسلامی تحریکات اور خیالات سے برابر غیر متاثر ہے اور اس سے جو نقصان اسلام کو اس ملک میں پہنچ رہا ہے، وہ بیان کا محتاج نہیں۔

ہم کو معلوم ہے کہ بنگال کے اندرونی حصوں تک میں ہزاروں مسلمان اس زبان کو بولتے اور سمجھتے ہیں لیکن اردو قواعد کی بعض مشکلوں اور تذکیر و تانیث کے جھگڑوں کے سبب سے ان کو الجھن ہوتی ہے، لیکن اگر اہل بنگال جرأت کرتے تو اپنی ضرورت کے مطابق وہ لاہور اور پٹنہ کی طرح اپنی اردو آپ بنا لیتے، اور دلی اور لکھنؤ والوں کو اس کے ماننے پر مجبور کر دیتے۔

وقت ابھی نہیں گیا ہے، اور آج سے زیادہ اس کے لئے کوئی دوسرا مناسب وقت مشکل سے مل سکتا ہے سے

اے زفرصت بے خبر، در ہر چہ باشی زود باش

بنگال کی سرکار کو چاہئے کہ ہندوستانی اردو کو اس صوبہ کے اسکولوں کی تعلیم میں مناسب حصہ دے، اور شہروں میں اس زبان کی لائبریریاں قائم کرے اور سرکاری حیثیت

سے بہتر کہ خود بنگال والوں کی ایک طاقتور جمعیت بنگ کے طور پر یہ کام اپنے ہاتھ میں لے، اس کے ممبر شہروں سے گاؤں تک پھیل جائیں، اردو پرچار کی سبھائیں بنائیں، اور لوگوں کو یہ زبان سکھائیں، اگر اردو رسم خط کی مشکل ہو تو شروع میں اسی رسم خط کو بھی چھوڑ دیں اور بنگالی یا لاطینی خط میں[1] اس زبان کے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھیں اور پھیلائیں، بنگالی، ہندوستانی اردو ڈکشنری لکھیں، ادبی، اخلاقی اور مذہبی قصے لکھ لکھ کر لوگوں کے ہاتھوں میں دیں، آپ دیکھیں گے کہ چند سال کے اندر بنگالی ہندوستان کا حصہ ہو جائے گا، اور بنگال کی یہ قربانی ایک طاقتور ہندوستان کے بنانے میں بڑی مدد دے گی، آج پنجابی بولنے والے پنجاب کا اردو ہندوستانی پریس سارے ہندوستان پر راج کر رہا ہے، پھر کیوں بنگالی بولنے والے بنگال میں ایسا ہندوستانی پریس نہ ہو جو ان مقبوضات کو اسی طرح اپنے قبضہ میں لے آئے، ہمت شرط ہے، اور ایثار و قربانی کی تھوڑی ضرورت ہے۔ آج زبان کے مسئلہ کی کنجی صدر اس کے ہاتھ میں نہیں بنگال کے ہاتھ میں ہے، کیا اہلِ بنگال اس مشکل کے قفل کو کھولنے کو تیار ہیں؟ ۔

---

[1] اس جلسہ میں اس کے برخلاف خود بنگال کے مسلمانوں نے یہ تجویز پیش کی اور منظور ہوئی کہ بنگالی زبان کو وہ عربی خط میں ہی لکھیں گے۔ ”س“

مقالات

اکبر کا ظریفانہ کلام

ولی دکھنی سے لیکر میرؔ و داغؔ و جلالؔ کے زمانہ تک ہماری شاعری جس تنگ و محدود شاہراہ پر چل رہی تھی، اہلِ محفل کا دل اس سے اتنا اکتا گیا تھا کہ اگر نئے راستے پیدا نہ ہوتے تو اردو شاعری فنا ہو چکی ہوتی، مولانا شبلی کی تاریخی شاعری مولانا حالی کا پند و موعظت، مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی اخلاقی کہانیاں، ڈاکٹر اقبال کا فلسفہ، اکبر حسین صاحب کی پُر معنی اور لطیف ظرافت اردو شاعری کی جدید تاریخ کے شاندار ابواب ہیں۔

ارباب تجارت دو طرح کے ہیں، ایک وہ جو بازار کا چلن دیکھ کر اپنی دوکان میں ہر ضرورت کی چیزیں ادھر اُدھر چن دیتے ہیں، خریدار راستہ سے گذرتے ہیں، اور اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق دوکان سے مختلف چیزیں اُٹھا لیتے ہیں۔ ان دوکانداروں کو پھر جو سستی اور چلتی ہوئی چیزیں نظر آتی ہیں ان کو لے کر اپنی دوکان سجا لیتے ہیں، دوسرے وہ سوداگر ہیں جنھوں نے اپنے مذاق اور استعداد کے مطابق کوئی چیز پسند کر لی ہے اور وہی ایک جنس اُن کی دوکان میں ملتی ہے، اگر تم کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو اسی قسم کی کوئی اور دوکان تلاش کرو، جہاں صرف اُسی جنس کی تجارت ہوتی ہو، عموماً بڑے بڑے تاجر اسی دوسری قسم کے ہیں۔

شاعری کا بھی یہی حال ہے، فردوسی، شیخ سعدی، حافظ شیرازی، خیام نیشاپوری، عرفی شیرازی، جن کا کلام قبول عام حاصل کر چکا ہے، تھوک فروش سوداگر تھے، ان کے یہاں شاعر کے مذاق کے مطابق کلام ملے گا، اُن میں ناظرین کے مذاق وانتخاب سے بحث نہیں، ایک شاعر و خطیب میں سب سے بڑا نازک فرق یہی ہے، شاعر دنیا کو صرف دنیا دل دکھلاتا ہے، خطیب سامعین کے دل دیکھتا ہے، اور ان کے خیالات وجذبات کو متاثر کرنا چاہتا ہے، یہی سبب ہے کہ تمام بڑے بڑے شعراء کا ایک خاص رنگ مذاق ہے، جس کے مطابق وہ اپنے کلام کو فروغ دیتے ہیں۔

قدیم شعرائے اردو میں میر، غالب، انشا اور نظیر اکبرآبادی کے سوا کسی اور کا کوئی مخصوص موضوع سخن نہیں، جدید شاعری کے ہماری زبان پر دو بڑے احسانات ہیں ایک تو غزل وقصیدہ کے متفرق وپراگندہ خیالات کے بجائے عربی شاعری کی طرح مسلسل مضامین کی اس نے بنیاد ڈالی، دوم یہ کہ زلف وشانہ کے الجھاؤ اور رنگین شاعری سے اس نے نجات پائی، اور ہر قسم کے مسلسل خیالات شعر میں بند ہونے لگے، ہماری تعلیم اور عام فضل وکمال کے مشاہیر جس طرح اب تک وہی قدیم تعلیم یافتہ تھے، جنھوں نے بعد پیر نشیں ہو کر تعلیم پائی اور اب تک قومی اسٹیج کے وہ مالک تھے، اسی طرح جدید شاعری کے میدان میں بھی اب تک وہی بزرگ ایسے شیر دل ہیں، جنھوں نے قدیم شاعری سے اکتا کر اس نئے کوچہ میں قدم رکھا۔

مولانا حالی، اور میر اکبر حسین، دونوں قدیم شاعری کے استاد مسلم الثبوت ہیں، ان کے دیوانوں کا ایک حصہ ان ہی قدیم غزلوں کا مجموعہ ہے، جن کے شکست و ریخت میں عمر کا حصہ بڑا صرف کیا گیا ہے، میر صاحب غالباً وحید الہ آبادی کے شاگرد ہیں، جن کو تعشق

یا ناسخ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ اسی بنا پر میر صاحب کی شاعری میں لکھنؤ کا مذاق نہایت نمایاں ہے، اور وہی رنگ طبیعت نکھر کر ایک اور عالم بن گیا ہے۔ اب تک ان کے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں، کلام کی تقسیم مختلف مضامین پر ہے، لیکن درحقیقت ہم ان کو صرف تین جلی تقسیمات میں درج کرتے ہیں، غزلیں، سنجیدہ و متین کلام اور ظریفانہ نظمیں، اول اور دوم صنفِ سخن سے یہاں کوئی بحث نہیں، صرف تیسری صنف کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

لکھنؤ کے شعراء میں سید انشاء، لکھنؤ آکر، اور امانت لکھنوی کا جو رنگ ہے، میر صاحب کی ظریفانہ نظموں کا درحقیقت وہ اساسِ سخن ہے، آج سے تیس برس پہلے لکھنؤ سے اودھ پنچ نام سے ایک اخبار نکلا تھا، اور مدت تک زندہ رہا، میر صاحب کے فطری رنگ کی تختگی میں اس اخبار سے بڑی مدد ملی، اس کی ہفتہ وار اشاعتوں میں میر صاحب کا کلام خاص ذوق سے لوگ پڑھا کرتے تھے، اودھ پنچ کے گر جانے کے بعد اور ماہوار رسائل میں بھی میر صاحب کا کلام چھپ کر مطبوع ہونے لگا، اور اب ہماری زبان کا ہر ممتاز رسالہ اور اخبار، اُن کے اشعار کے لئے ہر مہینہ بیقرار رہتا ہے۔

میر صاحب کا اعلیٰ مذاق اور ان کی شاعری کا موضوع عام ہے، یعنی اور سنجیدہ ظرافت ہے ان کو مذہب، فلسفہ، سیاست، قومیات جس موضوع پر بھی جو کچھ کہنا ہوتا ہے اس کا مغزِ سخن خواہ جو کچھ ہو لیکن اس کا نشر بالائی صرف سنجیدہ ظرافت ہوتی ہے، ظرافت کا رنگ جو سید انشاء اور سعادت علی خان کی بدولت لکھنؤ کی شاعری میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا مقصد صرف تفریحِ طبع اور دل بہلانا تھا، ضلع جگت اور رعایت لفظی لکھنؤ کا خاص مذاق ہے، اس کا مقصد بھی محض تفنن طبع تھا، اور لکھنؤ میں امانت اس اقلیم کا بادشاہ ہوا ہے جان صا

کا ظریفانہ رنگ گو زمانہ لحجہ میں آکر بدنما ہو گیا تھا، تاہم اس کی بنیاد بھی محض تفریحِ طبع پر تھی،
میر صاحب کا احسان یہ ہے کہ انہوں نے سعدی، ابن یمین اور خیام کے مغزِ سخن کو امانت کے
الفاظ میں اور جدید انشا کی بولی میں اس طرح ادا کیا کہ وہ نہ صرف تفریحِ طبع اور واہ واہ کا سامان
رہا، بلکہ اس کی تہ میں پند و موعظت، اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل
اجتماعی مباحث بھی نظر آنے لگے، سید انشا کے زمانہ کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی
تھی وہ اسی شیرازہ اور قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان
ہے، میر صاحب اس بادۂ فرنگی کی آمیزش سے ذوقِ کلام کو لطف دیتے ہیں۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ میر صاحب کے اصنافِ کلام میں گو ہر جنس کی چیزیں ملتی
ہیں لیکن ان کے کلام میں لذت درحقیقت ظرافت کی ہوتی ہے، جس کے مزہ سے
دل اور زبان دونوں لطف اٹھاتے ہیں۔

میر صاحب اس شیر و شکر میں پند و موعظت اور نصیحت گری کی ان تلخ دواؤں کا
گھونٹ گلے سے اتار دیتے ہیں، جن کو پینا اس جدید دورِ لطافت و تنزہ پسندی
میں ناممکن تھا، میر صاحب بھری محفل میں علمائے کرام، مشائخِ عظام، امرا و حکام، مدعیانِ
رہبریِ عام، اور نوجوان تعلیم یافتوں کا خاکہ اڑاتے ہیں، اور ان کی جبیں پر میل تک نہیں آتا

میر صاحب کا اصل رنگ یہ ہے کہ جدید طرزِ معاشرت، یورپین اخلاق و عادات،
تعلیمِ جدید کے نقائص، مغربی تقلید کے معائب کو ظرافت کے پردہ میں اس طرح
نمایاں اور واضح کریں کہ مخاطب جھینپ کر خاموش ہو جائے، اور اپنے فعل پر تھوڑی
دیر کے لیے اس کے چہرہ پر ندامت سے پسینہ آجائے۔ کہتے ہیں

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے   بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے

لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے
آگاہ ہوں معنی خوش اقبالی سے واقف ہوں بنائے رتبۂ حالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اکبر چلتا نہیں کام صرف نقالی سے
تعلیم میں اُن علوم کے ہو مصروف نیچر کی جو طاقتوں کو کردے مکشوف
لیکن تم سے اُمید کیا ہو کہ تمھیں عہدہ مطلوب ہے وطن ہے مالوف
مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اُڑ جائے مطلب کی کہوں تو پالسی میں اُڑ جائے
باقی ہر قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اُڑ جائے

میر صاحب کی ظریفانہ شاعری پر اگر تنقید کی نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ظرافت کے مختلف سات عنصر ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل عنوانوں میں کی جا سکتی ہے

رعایت لفظی یا ضلع جگت دُنیا میں کوئی چیز بُری یا بھلی نہیں ہے، ہر چیز کا محل استعمال برا یا بھلا ہے، ضلع جگت درحقیقت ایک بازاری چیز ہے، اس لئے سنجیدہ کلام اس کو متحمل نہیں ہو سکتا، امیر خسرو نے اعجاز خسروی کے ذریعہ اس عالم میں اپنی پیغمبری کا لاکھ ثبوت دیا لیکن اہل ہوش و خرد کے نزدیک مقبول نہ ہوئی۔

رعایت لفظی اور ضلع جگت، متاخرین بلکہ متوسطین شعرائے لکھنؤ تک کا مذاق خاص رہا ہے، اکثر صرف اسی اساس پر اُن کی شاعری کی ساری بنیاد قائم ہوتی ہے، ان لوگوں نے بڑی غلطی یہ کی کہ اس کا کوئی خاص محل استعمال متعین نہیں کیا۔ بلکہ ہر قسم کے کلام کو اس زیور سے آراستہ کرنا چاہا، یہی وجہ ہے کہ وہ اونچے طبقوں میں مقبول نہیں ہوا، لیکن میر صاحب نے رعایت لفظی کو صرف ظریفانہ کلام کے ساتھ مخصوص کر دیا، جو اس کے لئے خاص طور پر موزوں بھی ہے امیر صاحب کے ظریفانہ کلام کے رنگ کو جا بجا اسی عنصر کی

آمیزش نے نہایت شوخ کر دیا ہے، مثلاً گدڑیاں ردا کی بھی ہوتی ہیں اور بندوقوں کی بھی اس تجنیس سے دیکھو میر صاحب کس طرح فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

گدڑیوں کے اندر رہے کرتے ہیں وہ دریا کو ہضم — اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں

رسالہ کی تجنیس سے دیکھئے کس طرح کام نکالتے ہیں۔

ملکی ترقیوں میں دو رسالے نکالئے — ملتن نہیں تو خیر رسالے نکالئے

مس کی تجنیس دیکھئے کیا رنگ دکھاتی ہے۔

سر پر نورِ تقویٰ سایہ پر قربان کر آئے — یہ کیا اچھا کیا تم نے اگر رکھ کے مس لائے

تثلیث اور زمین۔

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ — گھر میں بیٹھے ہوئے دالنین پڑھا کرتے ہیں

اس رعایت لفظی اور تجنیس کے شوق میں بعض اوقات وہ اردو انگریزی و فارسی الفاظ کو بھی باہم متجانس کر لیتے ہیں، اور اس میں بھی ایک لطف پیدا ہو جاتا ہے، "ہمبل" انگریزی میں خاکسار کو کہتے ہیں، وہ اس کو امام حنبل بناتے ہیں۔

ہر طرح سے اب عاجزی ہم میں — اب ہمارے امام حنبل ہیں

پاس کرنا اور پاس رہنا

لندن میں اگر جاؤ گے وسواس یہی ہے — تم پاس رہو میرے بڑا پاس یہی ہے

گڈ ڈے اور گدڑے

ضرورت کچھ نہ تھی اسکی کہ انگلش میں بھی ہو جائے — سلام و رحمۃ اللہ کی جگہ گڈ نائٹ اور گڈ ڈے

حجابات مذہبی سے بھاگتا تھا کھیل گدڑیوں کا — کہاں کی قوم، ہاں کچھ بن گئے ہیں نازنیں گدڑے

کم آلی اور کمال

ساری دنیا ہے اس کو پیاری اکبر / کہتا ہے "کم آل" جس کو حاصل ہے کمال

کم آل (تم سب آدم) اور کمال کی تجنیس صوتی اس ظرافت کی بنیاد ہے۔

جدت قافیہ میر صاحب کی ظرافت کا بڑا کھیل اکثر اوقات قافیہ کی جدت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر انگریزی الفاظ کو بطور قافیہ کے استعمال کرتے ہیں، مثلاً

ہوس ہے طوبیٰ کی اب نہ سر میں نہ موج کوثر ہے اب نظر میں
ہوس اگر ہے تو بس یہی ہے کہ ہم بھی چھپ جائیں پانیر میں

اک دن جو دیکھا کہ وہ ہیں گم سم تھے لوگ نے پوچھا / ایک صدا آئی یہ ہے کہ میں رہا ہوں مشین سے

خواہش ہو تجھے اگر غنی بننے کی / دولت کی ہوس ہے تو دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کے ہندی / کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

بلبل ہیں آج ہم چمنستان کمپ کے / پروانہ کل بنیں گے کلیسا کے لیمپ کے
فکر بہشت و کوثر و تسنیم ہو چکی / اب پائپ کا خیال ہے چرچے ہیں پمپ کے
رکھتے تھے جو بزرگ، قدم پھونک پھونک کر / خوگر ہوئے ہیں لیمپ کے اسٹیمپ کے ٹمپ کے

عینک آنکھوں میں، مصنوعی دانت / نیچر نے سکھا کے کر دیا جسم کو تانت
ابتک ہے وہی مگر ہوس حضرت کی / ہے طول امل ہنوز شیطان کی آنت

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے / تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو قافیہ نہیں بنتے، لیکن میر صاحب اس قسم کے لفظ کی ترکیب سے بعض موقعوں پہ قافیہ کا کام لیتے ہیں، اس لئے اس سے نہایت ندرت اور جدت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لے کر / بلیا بیٹھا ہے موٹھ موتھی لے کر

سودا اس کو ہے جو سدھار الندن — وہ دولت و جنس گھر میں جو تھی سو گئے

پوتھی، ہوتھی کا قافیہ جوتھی کتنا عجیب ہے۔

میر صاحب کو قافیہ نکالنے میں کمال حاصل تھا، مولانا شبلی فرماتے تھے کہ ایک روز میں نے ان سے کہا کہ میرے نام کا قافیہ نکال لیں تو جانیں، وہ اس وقت چپ رہے تھوڑی دیر کے بعد میر صاحب نے دعوت کا منظوم رقعہ بھیجا۔

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی — ہے بات یہ صاف بھائی شبلی

قبلہ قبلی اور شبلی کا قافیہ انہی کی تلاش سے مل سکتا تھا۔

مخاطب کے دعوی کی تشریح

میر صاحب کے کلام میں بعض وقت ظرافت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ مخاطب کے دعوی کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں لیکن اس کی تشریح اس طرح کر دیتے ہیں کہ مدعا اس کے بالکل مخالف ثابت ہوتا ہے، مثلاً موجودہ بیداری سید احمد خان کی کوششوں کا نتیجہ خیال کی جاتی ہے، میر صاحب اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر کہتے ہیں۔ اس میں اہمیت اتنی ہو کہ لوگ اٹھتے وقت اللہ کا نام لیں۔

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور — کہتا نہیں ہم سے کہ ہو اس سے نفور

سوتوں کو جگا دیا انہوں نے لیکن — اللہ کا نام لے کے اٹھنا ہے ضرور

جدید تعلیم یافتہ گروہ کالج کو تمام قومی کاموں کو تنہا اور واحد مرکز بتاتا ہے میر صاحب اس کے اس دعوی کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اسی طرح واحد اور ایک، جس طرح ایک بے مایہ کی ایک واحد جھونپڑی، یا اندھے کی ایک لکڑی۔

مسلمانوں نے کالج کی ہری کیا راہ پکڑی ہے — وہی تو اک ٹھکانہ ہے وہی اندھے کی لکڑی ہے

جدید تہذیب کے دلدادہ اب پردگی کے حامی، اور عورتوں کو پبلک مجمع میں دیکھنے کے

مشتاق ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ جو انگریزی نہ جانے گویا وہ تعلیم سے عاری ہے۔ میر صاحب ان کے دعویٰ کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی — اب وہ شمع بزم ہے پہلے چراغ خانہ تھی

"شمع بزم" اور "چراغ خانہ" کی تشریح سے کچھ عجب نہیں کہ عورتوں کی بے پردگی اور انگریزی تعلیم کے مدعی چراغ پا ہو جائیں۔

ایہام | یعنی کسی فقرے کے دو مطلب ہوں، قریب تر غیر مقصود اور بعید تر مقصود ہو۔

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں — جس کے سر پہ جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر — تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

تین ٹکڑے کرنے سے قطع و برید نہیں، تثلیث مراد ہے، لیکن ایہام قطع و برید کا ہوتا ہے اور یہی اس کا شعر کا لطف ہے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

بظاہر اس سوال کا جواب ہے کہ پردہ اس لئے نہیں ہے کہ وہ مردوں نے چھین لیا، لیکن اصل مقصود یہ ہے کہ مردوں کی عقل پہ پردہ پڑ گیا، اور اپنی عورتوں کا پردہ انہوں نے اٹھا دیا۔

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا — میرا مضمون رہ گیا ڈاسن کا جوتا چل گیا

جوتا چل گیا کے دو معنی ہیں، ایک مقصود دوسرا غیر مقصود۔

قدیم شعرا کے خیالات کو دوسرے پیرایہ میں ادا کرنا | میر صاحب بعض اوقات قدیم شعراء کے خیالات کو اس طرح الٹ پلٹ کر ادا کر دیتے ہیں کہ قدیم و جدید مضامین میں ایسی

دلآویز مناسبت پیدا ہوجاتی ہے جس سے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ سعدی کا شعر ہے

چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک

وہ اس کو یوں پلٹتے ہیں۔

چو مسٹر نباشد ترا میہماں — چہ بر میز خوردن چہ بر روئے خواں

مولوی روم کا شعر ہے

چیست دنیا از خدا غافل شدن — نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

اس کو یوں کہا۔

نیچریت چیست از دیں گم شدن — نے قمیص و کوٹ و پتلون و بٹن

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند — تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

اس شعر کو یوں کیا۔

کالج و نیچر و حکام ہمہ در کارند — تا تو نامے بکف آری و کنی نوکری

جدید محاورات | میر صاحب کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جدید محاورے جو انگریزی زبان کے اختلاط سے پیدا ہو گئے ہیں، ہمارے مشرقی شاعر تو ان کا استعمال عاشقانہ کلام میں معیوب سمجھنے لگے، لیکن میر صاحب انہی محاورات کو پیرایۂ اشعار میں اس طرح جلوہ دیتے ہیں کہ ہزاروں محتاط شاعروں کو ان پر قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔

بیٹھا رہا میں صبح سے اس در پہ شام تک — افسوس ہے ہوا نہ ملیشن سلام تک

ہر اک ریمارک آپ کا عقرب کا نیش ہے — مجھ کو بھی رنج غیر کا سینہ بھی ریش ہے

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

تشبیہ و استعارات کی جدت | کلام میں نئی نئی تشبیہیں پیدا کرنا شاعری کی جدت کا جزو متصور ہے،

عرب میں تشبیہات بالکل مادّی اور سادی ہوتی تھیں، ایران آکر عربی شاعری باغ و بہار بن گئی، فارسی شاعری جب ہندوستان آئی تو گو شیراز کا بلبل ہات سے نہ چھوٹا لیکن قمری اور فاختہ کی کوکو بھی اب سنائی دینے لگی، اس نئے دورِ مخترعات میں سینکڑوں چیزیں نئی پیدا ہو گئی ہیں، لیکن ہماری قدیم شاعری کا ذخیرۂ تشبیہات اب تک وہی سلف کا متروکہ اور اندوختہ چلا آتا ہے، میر صاحب کا احسان ہے کہ انہوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں کلام میں پیدا کر دیں، اور اُن سے عجیب و غریب تمثیلی استدلالات پیدا کئے۔

زندگی اور قیامت میں ریلیشن سمجھو
اس کو کالج اور اُسے کانووکیشن سمجھو

آہ و فریاد سے قابو میں نہ آئے گا دل
طپشِ قلب کو بنگال ایجیٹیشن سمجھو

بحرِ ہستی کا یہی دورہ چلا جاتا ہے
برف کی طرح جمے بہہ گئے پانی کی طرح

میدانِ عمل لیگ کا محدود ہے بیشک
ہاں رقبۂ مجلس کی کوئی انتہا نہیں ہے

"ہے" کو مانا "ہی" کو رہا "جو بڑھے وہ ہر کا" نامہ
جز موت کہیں اس میں فل اسٹاپ نہیں ہے

بعد مردن کچھ "نہیں" یہ فلسفہ مردود ہے
قوم ہی کو دیکھئے مردہ ہے اور موجود ہے

کل مستِ عیش و ناز تھے ہوٹل کے ہال میں
اب ہائے ہائے کر رہے ہیں اسپتال میں

دنیا اُسے قرار دو اور آخرت ہے یہ
سن لو کہ سازِ معنیِ اکبر کی گت ہے یہ

(معارف جلد ۱ نمبر ۲)

اگست ۱۹۱۶ء

اردو انسائیکلوپیڈیا

ہندوستان کی ترقی کا شور و غل اس وقت تک صدائے بے اثر ہے جب تک اس میں کوئی جامعیت پیدا نہیں ہوتی ۔ ہندوستان مختلف نسلوں، مختلف مذہبوں، اور مختلف زبانوں کا گھر ہے، ان مختلف نسلوں، مختلف مذہبوں اور مختلف زبانوں کے افراد کو جماعت، اور مختلف جماعتوں کو ایک قوم بنانا صرف اسی طریقہ سے ممکن ہے کہ ان میں نسلی، یا مذہبی، یا لسانی اتحاد پیدا کیا جائے، ہندوستان کی مختلف حیثیتوں کو ایک کرنے کا خیال ایک بے سود اور ناقابلِ عمل تخیل ہے، تمام ہندوستان کو صرف ایک مذہب کا پابند بنا دینا گو عقلاً ممکن ہے، اور دائرہ عمل کے اندر داخل ہے، لیکن بیرونی مشکلات کی بنا پر ایک وسیع مدت تک یہ تقریباً محال ہے، اس لئے تمام ہندوستان کو اگر ہم ایک متحد قوم بنانا چاہتے ہیں تو صرف زبان ہی کا اشتراک ایک ایسی چیز ہے، جو ان اختلافات کو مٹا کر تمام ہندوستانیوں کو ایک مشترک و متحد ہندوستانی قوم بنا سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی سیکڑوں زبانوں میں سے اس عمومیت و اشتراک کی صلاحیت کس کو حاصل ہے، اور اس صلاحیت و استحقاق کا معیار کیا ہے۔

(۱) فطرتاً اس میں عمومیت اور تمام ملک میں پھیل جانے کی صلاحیت موجود ہو۔

(۲) کسی صوبہ کی خاص زبان نہ ہو بلکہ عموماً وہ ملک کے ہر گوشہ اور ہر حصہ میں بولی

اور سمجھی جاتی ہو۔

(۳) اس میں علوم و فنون کا سرمایہ اور ہر قسم کے بلند خیالات کا ذخیرہ ایک حد تک موجود ہو۔

دو اوّل الذکر حیثیتوں سے اردو زبان کے ترجیحی تفوق کے پہلو کو کوئی دبا نہیں سکتا اُردو سے زیادہ ہندوستان کی کسی اور زبان میں ایک عمومی اور ملکی زبان بننے کی قابلیت نہیں، ملک کی دوسری زبانیں صرف بھاشا اور سنسکرت کی پیداوار ہیں، لیکن اُردو نہ صرف ہندوستان کی تمام زبانوں کا مجموعہ ہے، بلکہ غیر ملکی الفاظ کا بھی اس میں سیل ہے اس بنا پر ہندوستان کی مختلف الاجزا قومیت کے لئے اردو سے زیادہ اس قومیت کی ترجمان بننے کی کسی اور میں صلاحیت نہیں ہو سکتی، بنگالی زبان، ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں کے ہندو مسلمان اور ملک کے عام باشندوں کے لئے بالکل بیگانہ ہے، یہی حال مرہٹی اور گجراتی کا ہے کہ اپنے اپنے صوبوں کی حدود سے جب ان کا قدم باہر نکلے گا تو ہمیشہ ان کا خیر مقدم ملک کے باشندوں کی طرف سے بیگانہ وار ہوگا، برخلاف اردو زبان کے کہ ملک کی آبادی کا تیسرا اسلامی حصہ، ہر صوبہ و ہر گوشہ میں اس کو بطور مادری زبان کے بولتا اور سمجھتا ہے، ملک کی دوسری کثیر التعداد قوم یعنی ہندو بھائی ملک کے بڑے بڑے صوبوں میں مثلاً پنجاب، دہلی، صوبہائے متحدہ، بہار اور اسلامی ریاستوں میں مادری زبان کی طرح اس کو بولتے ہیں، بنگال، مدراس، بمبئی، ممالک متوسط اور راجپوتانہ و کشمیر و بڑودہ کی ریاستوں میں اس کو وہ نہایت آسانی سمجھتے ہیں اور ضرورت کے وقت اسی میں اظہار مطلب کرتے ہیں

وجوہ بالا کی بنا پر اُردو زبان کو اب بھی ملک کی عمومی زبان ہونے کا دعویٰ ہے

اور اس دعویٰ کی تردید عملاً ناممکن ہے اور ہندوستان کی مختلف قوموں کا میل جول جس حد تک ترقی کرتا جائے گا، اردو زبان کی ہمہ گیری اور عالمگیری اسی حد تک وسیع ہوتی جائے گی، اگر ہندوستان سے انگریزی زبان چھین لی جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ ملک کے تمام صوبوں اور گوشوں کے نائبوں اور قوم کے نمائندوں کی ایک عظیم الشان مجلس شوریٰ قائم ہے، ہمارا قومی اسپیکر اب ہمارے متحدہ پلیٹ فارم پر آتا ہے، سوال یہ ہے کہ وہ ہم کو کس زبان میں مخاطب کرے گا، وہ جوش اور جذبات سے لبریز ہے، لیکن پنجابی زبان اس کے خیالات کی ترجمانی کرے گی، کیا بنگالی اور مرہٹی زبان اس مختلف بولیوں والے مجمع کی گرہ کشائی کر سکے گی؟ وہ یقیناً صرف اردو ہی زبان ہوگی جو اس عظیم الشان قومی مجمع شوریٰ میں مبادلۂ خیالات کا ذریعہ بن سکے گی۔

اب ایک چیز رہ گئی یعنی یہ کہ ہماری آئندہ مشترک اور عمومی بننے والی زبان علوم و فنون کے لحاظ سے دوسری تمام زبانوں سے زیادہ دولتمند اور ذی ثروت ہو اور ہر قسم کے بلند اور عالی خیالات کی اداء و تعبیر کا سامان اس میں ہو، موجودہ حالات میں اردو زبان، بنگالی و مرہٹی وغیرہ ملک کی دوسری زبانوں سے علانیہ اس معرکہ میں بازی نہیں لیجا سکتی اس لئے ہم کو اردو زبان کی ملکی اور عمومی زبان تسلیم کرانے کے لئے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ہم علوم و فنون کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی زبان میں فراہم کر لیں، جو علمی، ادبی، قومی، تجارتی، سیاسی، تمدنی، اخلاقی ہر قسم کے علوم و خیالات کی اداء اور تعبیر کی کفالت کر سکے۔ ایسا مجموعہ جو ان گوناگوں علوم و خیالات کا کفیل ہو۔ ایک اردو کے دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کے سوا کچھ اور نہیں۔

لیکن یہ اس قدر عظیم الشان، اہم، اور مصارف طلب تجویز ہے کہ ہندو مسلمانوں میں سے

کوئی قوم بھی اُس کے لئے باسانی آمادہ نہیں ہو سکتی، اس کی تالیف و طبع و اشاعت کی ضروریات کے لئے ایک شاہی خزانہ اور شہنشاہانہ عزم اور حوصلہ مندیوں کی ضرورت ہے، دنیا میں اس قسم کے کام ہمیشہ امراء، اور سلاطین زمانہ کی زیر پاشیوں سے انجام پائے ہیں آج ہم گو بکرماجیت، سوائی سنگھ، مامون الرشید اور اکبر نہیں لیکن ۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید   دگیراں نیز کنند آنچہ مسیحا می کرد

ہم میں بہت سے ایسے ہمت والے موجود ہیں، جو اپنی وسیع قومی حوصلہ مندیوں، بے پایاں علمی فیاضیوں اور غیر محدود سیاسی انجام بلندیوں کے لحاظ سے ہمارے موجودہ دورِ تاریخ کے سب سے بڑے ہیرو ہیں، ان میں ہر شخص جو صرف مسلمانوں کے "جامعہ اسلامیہ" کے لئے ایک لاکھ دے سکتا ہے، وہ ہندوستانیوں کے متحدہ "جامعہ لسانیہ" کے لئے دو لاکھ نہیں دے سکتا؟ ہم کو کامل اطمینان ہے کہ ہماری قومی فیاضیوں کا دستِ کرم اس تجویز کی اعانت سے کوتاہ نہیں ۔

دوسری مشکل مؤلفین اور ارباب قلم کی ایک کثیر جماعت کے حصول کی ہے، لیکن سرمایہ کے امکان کے بعد ہم اس مشکل کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، ایک دو چیف ایڈیٹر بیشک نہایت لائق درکار ہیں، لیکن الحمد للہ کہ یہ دولت اس تجویز کو حاصل ہو چکی ہے، ان کے علاوہ ۲۰۰ متوسط لیاقت کے مترجم اور انگریزی داں، انشا پرداز ہم کو چاہئیں جن کے لئے گریجوایٹ ہونا ضروری نہیں، صاحب لیاقت ہونا ضروری ہے انگریزی کے ساتھ کسی قدر عربی کے واقف کاروں کو ترجیح دی جائے گی، کام بجائے ماہوار تنخواہ کے صفحات کے معاوضہ پر ہوگا ۔

کتابوں کی غیر معمولی مقدار کی بھی ہم کو حاجت نہیں، انگریزی میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا

چیمبرس انسائیکلو پیڈیا، پاپولر انسائیکلو پیڈیا، امریکن انسائیکلو پیڈیا، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، عربی میں دائرۃ المعارف، فارسی میں کشاف اصطلاحات الفنون جیسی جامع کتابیں موجود ہیں، اُردو کے مشہور علمی رسائل میں اکثر مباحث پر نہایت قابلیت کے مضامین شائع ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سے ممکن الحصول مواد اور ماخذ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کے سامنے ہیں، تحقیق و کاوش نہایت احتیاط کے ساتھ عمل میں آئے گی اور انشاء اللہ چیف اڈیٹروں کی قابلیت اور ان کا ذوقِ تحقیق اس کو پایۂ اعتبار و استناد سے گرنے نہ دے گا۔

تالیف و ترجمہ کی درخواست بھیجنے والوں کے لئے حسب ذیل امور تحریر ہیں۔

(۱) مؤلف و مترجم کے لئے مذہب و ملت کی تخصیص نہیں۔

(۲) انگریزی لیاقت مسلّم ہو، اُردو کا انشاپرداز ہو، فارسی بقدر ضرورت جانتا ہو، کوئی صاحب ان زبانوں کے ساتھ عربی بھی جانتے ہوں، یا علوم و فنونِ جدیدہ کی کسی شاخ سے واقف ہوں تو ان کو ترجیح دی جائے گی۔

(۳) ترجمہ کا نمونہ بھیجنا چاہئے۔

(۴) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے صفحہ کو پیش نظر رکھ کر اطلاع دینی چاہئے کہ فی صفحہ وہ کیا زرِ معاوضہ قبول فرمائیں گے۔

(معارف دسمبر ۱۹۱۶ء)

افسوس کہ یہ تجویز قبل از وقت مرگئی، ہمارے[1] دوست مولوی عبدالماجد صاحب اور مولوی

---

[1] ہم کو خوشی ہے کہ حیدرآباد دکن میں جہاں ہماری زبان کی ترقی اور نئی زندگی کے بہت سے سامان بہم پہنچے ہیں اس تجویز نے نئی زندگی پائی ہے، وہاں کے نوجوان اہل قلم کی کوشش سے اس کام کا آغاز ہو گیا ہے، عجب نہیں کہ ان کی کوششوں کا پہلا نمونہ جلد سامنے آجائے۔

عبدالباری صاحب اس کے قلمی اور مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد اس کے دست و بازو تھے مہاراجہ صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ عنقریب ہندوستان میں ایک آزاد حکومت قائم ہوگی اور اس وقت وہی زبان سرکاری حیثیت حاصل کرسکے گی جسکا علمی و ادبی سرمایہ سب سے زیادہ ہو اس لیے اردو کے علمی سرمائے کی ترقی کے لیے اردو انسائیکلوپیڈیا ترتیب دیا جائے اخباروں میں اس تجویز کا اعلان ہوا سب نے تائید کی، دفعتہً سیاسیات کا رُخ ایسا پلٹا کہ مہاراجہ صاحب اس کام میں شریک نہ ہو سکے اور تجویز کے دوسرے ارکان بھی تتر بتر ہو گئے مہاراجہ صاحب نے اس کے لیے ایک لاکھ روپے کا وعدہ کیا تھا۔

" س "

زبانِ اُردو کی ترقی کا مسئلہ

ڈیمانڈ اور سپلائی کا اصول

بخدمت جناب اڈیٹر صاحب "معارف"

جنابِ من! میں نے اُردو لٹریچر کے "نفس و البسین" کے عنوان سے حال میں ایک مضمون لکھا تھا جس سے بعض حلقوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ "پرستارانِ شبلی" کے مقابلہ میں درِ اصل اس سے انجمن ترقی اردو کی تنقیص مد نظر تھی، لیکن واقعی بات یہ نہیں ہے، میں نے انجمن کو اس کی اہم ذمہ داریوں کے لحاظ سے ٹوکا تھا، یعنی توقعات زیادہ ہوتی ہیں تو فروگذاشت کسی حیثیت سے ہو، مایوس کن ہوتی ہے۔

انجمن جو کچھ کر رہی ہے، میں اسے قوم کی عام بے اتفاقی کے لحاظ سے بہت قابل قدر سمجھتا ہوں، اسی طرح مجھکو دار الاشاعت لکھنؤ سے پوری ہمدردی ہے جو انجمن کے کارناموں کی مقدار کے ساتھ اس کی صفات کو بھی گراں وزن کر رہا ہے، اور گو ایک غیر ذمہ دار صنبس لطیف نے ظفر الملک سے ایک موقع پر کیفیت نہیں، بلکہ جواب طلب کیا تھا، لیکن یہ بڑی ناشکری ہوگی اگر ترقی اُردو کے اُن محرک دلوں سے ایک معتد کے لئے قطع نظر کی جائے، تاہم میں نہیں مانتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ قدرتی طور پر ہماری ضروریات کے مطابق ہے۔

ملک کی کسی تعلیم یافتہ جماعت نے کبھی اس پر خود غور نہیں کیا کہ ہر چیز ایک نظامِ طبعی رکھتی ہے اور اردو زبان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے، کانفرنس ہو یا انجمن ترقی اردو زبان کا مسئلہ کبھی اس حیثیت سے پیش نظر نہیں رہا، یہاں تک کہ ان لائق ادب افراد نے جن کے دل و دماغ کے نتائج آج اردو کا بہترین سرمایۂ ادب ہیں منفرداً یا متفقاً کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ لٹریچر کی فطری ضروریات کے لحاظ سے کون کون سے کام ہیں جن پر ترتیباً سب سے پہلے توجہ ہونی چاہیئے اور دراصل ترقی اردو کے نظام ترکیبی کا اقتضائے طبعی کیا ہے۔

یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ ملک میں جہاں تک مختلف اصنافِ سخن کا تعلق ہے، لٹریچر کا ذخیرہ بڑھ رہا ہے، لیکن کیا یہ انتشار عمل کسی قاعدہ کلیہ کی تحت میں ہے یا ہم اس سے کسی حقیقی فوائد کے متوقع ہو سکتے ہیں۔

میں نے اس خیال سے پروفیسر براؤن آف کیمبرج کو جو آج کل کے مستشرقین یورپ میں ایک زبردست شخصیت رکھتے ہیں، اور جن کو مشرقی لٹریچر سے خاص دلچسپی ہے، لکھ کر دریافت کیا، ممدوح کی رائے کے مطابق ہم کو ترقی زبان کیلئے سب سے پہلے تالیفاتِ ذیل مرتب کرنی ہوں گی:

(۱) جامع اللغات اردو

(۲) محاورات

(۳) لغات الاصطلاحات

(۴) لغاتِ فارسی (——— جہاں تک اردو کی تکمیل کا تعلق ہے)

(۵) لغاتِ عربی (——— بہ ترتیب جدید۔)

(۶) ادب الاساتذہ (۔۔۔۔۔ ۱۲ ضخیم جلدوں میں)

(۷) جامع اللغات اُردو

(۸) تعلیمات (۔۔۔۔۔ یعنی فلسفہ اور سائنس کی ہر شاخ پر ایک مستقل کتاب)

(۹) اُردو انسائیکلو پیڈیا۔ (۔۔۔۔۔ جو لگ بھگ ہر علوم عصریہ ہوگی۔)

کسی زبان کو سرمایہ دار اور با اصول کرنے کی یہ قدرتی ترتیب ہے، جس سے براؤن کی رائے کے مطابق قطع نظر نہیں ہو سکتی ہم کو محض بے غایتہ رسائل کی اشاعت سے خواہ وہ فی نفسہ مفید بھی ہوں، صرف مطبوعات کی تعداد بڑھانی نہیں ہے، بلکہ ان وسائل کی تکمیل کے ساتھ جو زبان کی ترقی کے لئے لازم ہے ہیں، یہ دیکھنا ہے کہ ناآشنایان سخن کو کس طرح زبان کا دلدادہ بنایا جائے۔

اس کے لئے فاضل پروفیسر کی رائے ہے کہ کثرت سے "صالح لٹریچر" کی اشاعت کی جائے، اسی طرح ضخیم لغات کی ترتیب سے بعض اُردو، فارسی اور عربی کی لاکھوں جلدیں "لغات المبتدی" کی حیثیت سے مرتب کی جائیں، اور اس کثرت سے شائع کی جائیں کہ بچے بچے کے ہاتھ میں ہوں۔

میرا خیال ہے کہ پروفیسر براؤن کی یہ اسکیم نسبتہً اس قدر ضروری ہے کہ اس کا ذکر آپ کے رفیع پرچہ میں نہ آئے تو لٹریچر کی حق تلفی ہوگی۔"

ایم، مہدی حسن،

کشیم نالہ خدا آسمان نگہدارد

پروفیسر براؤن نے انگلستان میں بیٹھ کر ہندوستان کی ملکی زبان کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اصولاً اس کی تسلیم میں کسی قدر عذر ہو سکتا ہے، لیکن ذرا ان کو بھی عملاً ایک

محکوم قوم کی زبان کے مشکلات سے واقفیت حاصل کرنی چاہیئے، اس زمانہ میں محکوم قوم کی زبان کی ترقی کا مسئلہ عملی حیثیت سے ایسا نہیں ہے کہ صرف ایک دو آدمی یا ایک مجلس کے طے کر دینے سے طے ہو جائے، وہ زمانہ گذر چکا جب ایک رستم تنہا ماژندران کے سارے دیوستان کو فتح کر سکتا تھا، اب اس کے لئے کلدار توپیں، لاتعداد گولے، بیشمار تربیت یافتہ فوجیں اور غیر محدود سامان چاہیئے، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ آسمان و زمین کے خزانوں کی کنجیاں ہاتھ میں ہوں۔

ہم کو تصنیفات کی ضرورت ہے، تصنیفات کے لئے سامان طبع کی حاجت، اور سامان طبع کے لئے سرمایہ کی ضرورت، ہم کو مصنفین چاہیئیں، لیکن مصنفین کو فراغ چاہیئے اور فراغ روپیہ سے ہو سکتا ہے، الغرض سب سے اوّل اور سب سے پہلے مصنفین اور تصنیفات کا سوال نہیں، بلکہ سرمایہ اور روپیہ کا سوال ہے، سرمایہ اور روپیہ کیونکر ہاتھ آسکتا ہے؟ حکومت یا قوم سے، موجودہ نظام حکومت کا طرز عمل ایسی امداد کے لئے آمادہ نہیں، اب صرف قومی خزانہ کی طرف ہمارا ہاتھ بڑھ سکتا ہے، لیکن حالت یہ ہے کہ قوم اپنے خزانہ کا منہ اسی وقت کھول سکتی ہے جب اس کو روزانہ کاروبار اور اپنی عام زندگی کے لئے ہماری ضرورت محسوس ہو۔

اردو کی ترقی اور تکمیل کے لئے متعدد تجویزیں اب تک پیش ہو چکی ہیں، لیکن ہمارے نزدیک یہ اس وقت تک ناقابل عمل ہیں جب تک ملک میں اس کی مانگ اور اس کی قدر دانی کا جذبہ نہ پیدا ہو، بہت سے دوستوں نے نیک نیتی سے اردو انسائیکلوپیڈیا کی تجویز کی مخالفت کی، اور سنجیدہ دلیلیں پیش کیں، چنانچہ سب سے پہلے روپیہ کا سوال پیش آیا، ہم نے کہا ایک سو صاحبان بہت سے نئے ہمارا ساتھ دیا تو بس ہے، لکھنے والوں کی نسبت سوال

آیا تو ہم نے ملک کے ارباب قلم کے نام گنا دیے، جن میں سے عملاً اکثر کام کرنے کیلئے تیار تھے لیکن جب یہ سوال آیا کہ اس کی کتنی جلدیں چھپیں گی اور کتنے لوگ اس کی خریداری کو آمادہ ہو سکیں گے، اس وقت ہم نے شائقین کی فہرست پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ مشکل سے سو دو سو نسخے فروخت ہو سکتے ہیں۔ سیرۃ نبوی کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا ہے، اور ہمارے احباب کا بیان ہے کہ ملک نہایت بے چینی سے اس کا منتظر ہے اس وقت تک اس کے دفتر میں خریداروں کے صرف ۳۰۰ نام رجسٹر ہوئے ہیں، پھر اردو کے لئے کوئی کس برتے پر کسی بڑے کام کی ہمت کرے۔

استاذ مرحوم نے شعر العجم جب لکھی تھی تو خیال تھا کہ ہندوستان کو شاعری سے ایک فطری لگاؤ ہے اور خصوصاً فارسی شاعری تو اب تک کانوں میں زندہ ہے، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کے ۵۰۰ نسخے پورے پانچ برس میں بکے، انجمن ترقی اردو اپنے مطبوعات کا اشتہار باندھے تمام ملک کا چکر لگا رہی ہے تاہم اس کی سالانہ روداد میں مطبوعات کی خریداری اور ملک کی نا اہلی افسوسناک تعداد نظر آتی ہے، دار المصنفین کا بھی یہی حال ہے۔

بیس پچیس برس میں کیا سے کیا ہو گیا۔ المامون ۱۸۸۷ء میں پہلی دفعہ چھپی تھی، مولانا مرحوم فرماتے تھے کہ صرف تین مہینے میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا، حالانکہ ان کی تصنیفات جو تمامتر عربی سے ماخوذ، عربی عبارتوں اور دقیق اور مشکل بحثوں سے بھری ہوتی تھیں۔ لوگ برابر پڑھتے تھے، بات یہ تھی کہ اس زمانہ تک ملک میں انگریزی کا پورا رواج نہ تھا، عربی اور فارسی زبانیں زندہ تھیں، جدید تعلیم نے دماغوں کو صرف تفریحی مشاغل کا آشیانہ جس طرح بنا رکھا ہے، اس وقت تک نہ تھا، اس لئے ایک حالت قائم تھی، انگریزی تعلیم جیسے جیسے پھیلتی گئی، اردو جس کا تانا بانا سارا عربی اور فارسی سے ہے ان کے لئے

ناقابلِ فہم ہو گئی، آج ان کے ہاتھ میں اگر تفسیر احمدی یا النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی دیدیجائیے تو شاید اس کی چند سطریں بھی وہ نہ صحیح پڑھ سکیں، حالانکہ سرسید کا طرز تحریر نہایت صاف، شستہ اور سہل ہے۔

جدید تعلیم نے ہماری زبان میں جو بایۂ ناز افراد پیدا کئے وہ وہی ہستیاں تھیں جن کو کم و بیش اپنے مشرقی علوم پر اطلاع تھی، اسید محمود، سید علی بلگرامی، سید حسین بلگرامی، یہ نام ہمارے ملک اور زبان کے لیے معیارِ فخر ہیں، لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اپنے مشرقی علوم میں متبحر ہیں، ان سے نیچے اُتر کر مولوی عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین مرحوم و امثالہم کے مغربی فضل و کمال کے چہرہ پر اصلی آب و رنگ مشرقی علوم و السنہ کی واقفیت کا تھا، اس وقت بھی جو لوگ موجود ہیں اور جن کو ہم جدید تعلیم کا بہترین نمونہ سمجھتے ہیں وہ مشرقیات سے بے بہرہ نہیں ہیں۔

یہ حالت کچھ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، ہندوؤں کا بھی یہی حال ہے دکھو کہ ہندوؤں میں جدید تعلیم نے جو قابلِ عظمت اشخاص پیدا کیے ہیں اُن میں کوئی ایسا نہیں ہے جو سنسکرت سے بے بہرہ ہو، جسٹس رانا ڈے، مسٹر گوکھلے، ڈاکٹر بھنڈارکر، مسٹر تلک، مشرق و مغرب کے پیوند نے ان کے نخل کمال کو بارآور کیا ہے، بنگالیوں کا بھی یہی حال ہے، اور یہی اُن کی ملکی زبان کی ترقی کا راز ہے۔ البتہ ہمارے صوبہ میں ہندو نوجوانوں کی حالت مسلمان نوجوانوں سے ممتاز نہیں ہے۔

ہمارے ہاں بد قسمتی سے یہ حالت ہے کہ ہمارے انگریزی خواں دوست، اردو اخبارات اور تصنیفات کو ہاتھ تک لگانا جرم سمجھتے ہیں، اور ترجمہ کے لیے انگریزی کی دو سطریں دیجئے تو یہ کہہ کر مغرورانہ انداز سے کاغذ میز پر رکھ دیں گے کہ "بڑی مشکل ہے کہ اس کیلئے

اُردو میں الفاظ نہیں"، یا آپ کی نظر میں وسعت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ کچھ تو اس تعلیم کا یہ اثر ہے، کہ غور و فکر، دقت بینی اور نکتہ رسی کی قوت نوجوانوں سے مفقود ہو جاتی ہے، اور اس علمی دلچسپی اور مذاق سلیم سے بے بہرہ رہتے ہیں، اور زیادہ تر یہ ہے کہ ایک مدت تک اجنبی زبان اور بیگانہ خیالات پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے اپنی مادری زبان سے قدرۃً اُن کو بُعد ہو جاتا ہے اور چار جملے بھی غیر ضروری انگریزی الفاظ کی آمیزش کے بغیر نہیں لکھ سکتے، بلکہ اپنی مادری زبان سے ان کو ایک گونہ نفرت سی ہے، اور اس میں لکھنا پڑھنا اپنے لئے عار سمجھتے ہیں۔ جب تک یہ حالت قائم ہے، زبان کی ترقی کی کوشش بیسود ہے۔

لکھنؤ کے تاریخی افسانے اور دلی کے نغمے بکیف ٹکلے ممکن ہے کہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے ہوں لیکن مستند ہستیں اور صالح لٹریچر، کی مانگ ملک میں نہیں ہے۔ اس لئے وہ پیدا بھی نہیں ہو سکتا۔ قدرت صرف اس چیز کو پیدا کرتی ہے جس کی طلب اور تلاش ہو، اگر مصنوعی طریقہ سے ایسی چیزیں پیدا بھی ہوں گی تو زندہ نہ رہیں گی، چنانچہ کلکتہ کے اُردو کالج (سنہ ۱۸۰۰ء)، سے جو کتابیں نکلیں، چند کہانیوں کو چھوڑ کر جن کا نام شاید آپ نے سنا ہو اس کی کسی علمی اور مفید تصنیف کا نام آپ نے سنا ہے! حالانکہ اردو زبان کی سب سے پہلی قواعد کی کتاب صرف اردو میں لکھی گئی، اردو سوسائٹی دہلی (سنہ ۱۸۴۸ء)، کی تصنیفات آپ کی نظر سے گذری ہیں! حالانکہ علم الاقتصاد (پولیٹیکل اکانمی) کی پہلی کتاب اسی سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، اُردو سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ کا نام سر سید کے تعلق سے زبانوں پر آتا ہو، لیکن اس کی چالیس مفید مطبوعات علمی کے نام آپ کو معلوم ہیں، اور آپ کے کتب خانہ میں اس کا سلسلہ موجود ہے؟

حالانکہ زراعت اور علم البرق اور دیگر علوم طبعی و تاریخی کے جدید المغرب سکے پہلے اسی ٹکسال میں ڈھلے، انجمن پنجاب تو آپ کے ہوش میں قائم ہوئی ہوگی، ۱۸۶۵ء میں جدید علم النفس پر اردو میں سب سے پہلے وہیں سے ایک مستقل تصنیف ترجمہ ہوکر شائع ہوئی، آپ جانتے ہیں۔

اس وقت ملک میں جو اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں، ان کے خریداروں کا جائزہ لیجیے، تو معلوم ہو جائے کہ ان میں انگریزی تعلیم یافتوں کا کتنا کم عنصر شامل ہے، اور پھر ہمارا معزز صوبہ تو اس دوڑ میں سب سے پیچھے ہے۔ تعجب ہوگا کہ تقریباً ہندوستان کے ہر اردو اخبار اور رسالہ کی خریداری وہاں زیادہ نہیں ہے جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے بلکہ وہاں ہے، جہاں باہر کے لوگ اس کو سمجھ رہے ہیں زیادہ تر خریدار کہاں سے ہاتھ آئیں گے، متوسط، مدراس، حیدرآباد، گجرات، سندھ، اور رنگون وغیرہ سے، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان ممالک کے مسلمانوں میں اب تک انگریزی تعلیم عام نہیں ہوئی ہے اور ابھی تک علم و اطلاع کا ذریعہ وہاں اردو ہی رہی ہے۔

مصر میں ہندوستان سے عام تعلیم نسبتاً کم ہے، لیکن چونکہ تعلیم کی زبان عربی ہے اس لئے وہاں جدید عربی لٹریچر ہمارے یہاں سے زیادہ وسیع اور بہتر پیدا ہوگیا، حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی قائم ہو رہی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہاں چند روز میں اردو زبان علمی تصنیفات سے مالامال ہو جائے گی، چنانچہ ابھی سے وہاں ایسے صیغے قائم ہو رہے ہیں جو انگریزی خیالات اور مغربی علوم کو اپنی زبان میں منتقل کر سکیں، اور اردو ذریعہ تعلیم ہونے کے باعث یہ کتاب تمام ملک میں پھیل جائیں گی، اس کا قیاس صرف ایک واقعہ سے کر سکتے ہیں، شعر العجم جس کی نسبت میں نے پہلے کہا ہے کہ اس کے

...۵ نسخے پانچ ہی برس میں نکلے، دو برس سے اس کی کچھ جلدیں لاہور کے مشرقی صیغہ نے اپنے نصاب میں داخل کرلی ہیں، نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شعر العجم کا ایک ایک نسخہ اشرفی کے مول بک رہا ہے، اور اس کے طبع ثانی کا جگہ جگہ انتظام ہو رہا ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان کی بیسیوں تاریخ اور مذہبی کتابیں گھر گھر پھیلی ہیں، اور ہمیشہ لوگ ان کو خریدتے اور پڑھتے ہیں، لیکن ہم عرض کریں گے یہ علم پرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ ہماری سلف پرستی اور مذہب پرستی کا نتیجہ ہے۔

نیست در دائرہ یک نقطہ خلاف از کم و بیش — کہ من ایں مسئلہ بے چون و چرا می بینم

پروفیسر براؤن نے ہماری زبان کی ترقی کے لئے جو خاکہ تیار کیا ہے اس میں لغات و محاورات اردو کی جگہ سب سے پہلے ہے، اولاً اسی پر غور کیجئے، ابتداءً جب اہل یورپ ہندوستان آئے تو ان کو اردو سیکھنے کی ضرورت پیش آئی، اس لئے اردو کے قواعد و محاورات پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، گورنمنٹ نے ابتدائی درجوں میں اردو کو داخل کیا، اس کی بدولت ہر سال قواعد اردو کے متعدد رسالے پیدا ہوتے رہتے ہیں، چنانچہ ان کثیر التعداد رسالوں کو چھوڑ کر جو اہل یورپ نے اپنی ضرورت سے مختلف زبانوں میں لکھے، نیز ان بیسیوں کتابوں سے قطع نظر کر کے جو اسکول کے بچوں کے لئے لکھی گئیں، قواعد کی حسب ذیل کتابیں ہماری زبان میں موجود ہیں:

(۱) صرف اردو، شیدا ۱۸۰۱ء
(۲) دریائے لطافت، سید انشاء ۱۸۰۸ء
(۳) رسالہ صرف و نحو، مولوی احمد علی دہلوی ۱۸۴۵ء
(۴) رسالہ صرف و نحو مولوی صہبائی دہلوی ۱۸۴۹ء
(۵) رسالہ صرف و نحو، مولوی احمد حسن الہ آبادی ۱۸۵۹ء
(۶) رسالہ صرف و نحو، سید احمد خاں دہلوی ۱۸...ء
(۷) قواعد اردو مرزا ناصر علی بیگ مدرس اول آگرہ کالج ۱۸۶۲ء

اس کے بعد اردو زبان کی طرف سے انگریزی کو بے اعتنائی ہوئی اور رفتہ اس کی ترقی رک گئی، پھر اس وقت تک اس کی طرف توجہ نہ ہوئی، جب تک انجمن ترقی اردو کا وجود نہ ہوا، انجمن کی کوشش سے قواعد اردو پہ نہایت عمدہ کتابیں تالیف پائیں۔

(۱) مصباح القواعد منشی فتح محمد صاحب، جالندھری،		سنہ ۱۹۰۰ء
(۲) قواعد اردو	مولوی عبدالحق صاحب	سنہ ۱۹۱۴ء

مصباح القواعد میں جزئیات کے استقصا کا خیال زیادہ کیا گیا ہے۔ اور قواعد اردو میں اصول کلیہ بنانے اور تحقیق و تلاش کا پہلو زیادہ مدنظر ہے۔

محاورات اور لغات کو لیجیے، ان کا بھی یہی حال ہے

شمس البیان فی مصطلحات ہندستان	مرزا جان تپش،	سنہ ۱۲۸۳ھ
دریائے لطافت،	سید انشاء	سنہ ۱۲۲۳ھ
کلید سخن،	سید محمد حسین،	سنہ ۱۸۰۲ء
خزائن الامثال،	شمس الدین فیض،	سنہ ۱۲۰۲ھ
فرہنگ آصفیہ،	مولوی سید احمد دہلوی	سنہ ۱۸۸۱ء
دستور الشعراء،	خواجہ محمد اشرف لکھنوی	سنہ ۱۸۸۹ء
مخزن الاسرار،	نیاز علی بیگ،	سنہ ۱۲۸۳ھ
رسالۂ زباندانی،	چمن جی لال،	سنہ ۱۸۸۴ء
مخزن المحاورات،	منشی رجب لال،	سنہ ۱۸۹۸ء

سلہ انجمن ترقی اردو نے اس کتاب کے طبع دوم میں اس کتاب کی تکمیل کا تاریخی قطعہ (سنہ ۹۵) چھاپا ہے جس سے ۱۲۷۲ھ کا سال نکلتا ہے۔

محاوراتِ اردو	مجھو بیگ عاشق لکھنوی،	۱۸۸۰ء
گنجینۂ زبانِ اُردو،	جلال لکھنوی،	۱۲۹۷ھ
سرمایہ زبانِ اُردو،	"	۱۳۰۴ھ
امیر اللغات،	امیر لکھنوی، (ناقص)	۱۸۹۱ء
مصطلحاتِ اُردو،	خواجہ محمد اشرف لکھنوی،	۱۸۹۰ء
لغاتِ ہندی، (قلمی، موجودہ ندوہ)		۱۲۲۳ھ
لغاتِ فیروزی، (طلبائے مدارس کیلئے)	فیروز الدین،	۱۹۰۴ء
فرہنگِ اُردو، (طلبائے مکاتب کیلئے)	حمایتِ اسلام لاہور	سنہ
ویبکیہ (تذکیر و تانیث)	ظہیر الدین خاں	۱۹۰۲ء
رسالہ تذکیر و تانیث	مولوی شہید الدین صاحب بنارسی	۱۹ء
تذکیر و تانیث،	حافظ جلیل حسن صاحب مانک پوری	۱۳۲۶ھ

فرہنگِ آصفیہ ہمارے زبان کا سب سے بڑا لغت ہے لیکن وہ ایک انگریز (فیلین صاحب) کی تحریک کا نتیجہ اور حیدرآباد کی علمی قدردانی کا پرتو ہے۔ امیر اللغات اس سے بہتر لکھی جانے والی تھی، لیکن وہ ناقدر دان رئیسوں کے ہاتھوں میں پھنسی ہے۔

اگر ترتیب بہ بدکا سوال چھوڑ دیجئے تو عربی و فارسی کے لغات بھی اردو میں موجود ہیں، کئی زبانوں کے مشترک ضخیم لغت بھی لکھے گئے ہیں، مثلاً نیل اور رقالونی ڈکشنری بھی اردو میں موجود ہے، جدید علوم و فنون پر اُردو میں اس کی بیچارگی اور کس مپرسی پر بھی کم کتابیں نہیں لکھی گئی ہیں، تقریباً ہر فن پر دو ایک کتابیں اُردو میں ہیں، لیکن وہ گمنامی کے پردہ میں چھپ کر رہ گئی ہیں، ہم نے ان میں سے کچھ کتابوں کی فہرست " اسلامی ہندوستان کے عہدِ آخر

میں دی تھی، بقیہ کتابیں جو غدر کے بعد لکھی گئی ہیں، ان کی فہرست بھی زیر نظر و تلاش ہے۔

اس تمام یادہ گوئی اور درازنفسی سے مقصود یہ ہے کہ اردو زبان کی حقیقی ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک حکومت اپنے نظام تعلیمی میں تغیر نہ کرے، یا ہم اپنی مادری زبان کی پرستش کی وہ مثال نہ پیش کریں جو سرزمین بنگالہ کے جادوگر اور مہاراشٹر کے سورما اپنی اپنی زبانوں کے متعلق پیش کر رہے ہیں۔

اگر یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں تو پروفیسر براؤن کے اس حکم کی ہم کیونکر تعمیل کر سکتے ہیں کہ اردو فارسی اور عربی کی لاکھوں جلدیں "لغات المبتدی" کی حیثیت سے مرتب کی جائیں اور اس کثرت سے شائع کی جائیں کہ بچہ بچہ کے ہاتھوں میں ہوں۔

(معارف ستمبر ۱۹۱۶ء)

ہوم رُول سے پہلے!

ہوم لنگویج (ملکی زبان)

ہندوستان میں آج کل سیاسی خیالات میں جو جزر و مد نمودار ہو رہا ہے، اس سے توقعات کے کشت زار میں نئی امنگیں پیدا ہو گئی ہیں، گو مسلمانوں کو ایک عرصۂ دراز تک برادرانِ وطن کے سیاسی خیالات سے ہمدردی نہیں رہی، لیکن اب واقعات کی رَو بالکل بدل گئی ہے، اب یہ خیال ہے کہ سیاسیات کی سطح میں جنبش پیدا ہو رہی ہے، جب دریا اپنی اصلی رَو پہ آئے گا تو اپنی رو کا رُخ ہر طرف پھیرے گا۔

انہی مباحث میں سب سے اول زبان کا مسئلہ ہے، اور ہمارے خیال میں یہ مسئلہ ہوم رول سے بہت پہلے حل کرنے کے لائق ہے، افسوس ہوتا ہے، جب یہ نظر آتا ہے کہ یہ سیاسی خیالات بیگانہ زبان کی محض ترجمانی ہے، یہ خلاقِ عالم کی مخلوق زبان کی آواز نہیں ہے، بلکہ امریکن اور ملین کی مصنوعی زبان کی آواز ہے، دسمبر ۱۹۱۶ء کے معارف میں اردو انسائیکلوپیڈیا کی تقریب سے جو مضمون ہم نے لکھا تھا، اس کی تمہید میں عرض کیا تھا۔

"اگر ہندوستان سے انگریزی زبان چھین لی جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ ملک کے تمام صوبوں اور گوشوں سے نمائندگانِ ملک اور نمائندگانِ اقوام کی ایک عظیم الشان

مجلس شوریٰ قائم ہے، ہمارا قومی اسپیکر اب ہمارے متحدہ پلیٹ فارم پر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کو کس زبان میں مخاطب کرے گا، وہ جوش اور جذبات سے لبریز ہے لیکن کیا پنجابی زبان اس کے خیالات کی ترجمانی کرے گی؟ کیا بنگالی اور مرہٹی زبان اس مختلف اللسان مجمع کی گرہ کشائی کر سکے گی؟۔

اس لئے ہوم رول کے تخیل سے پہلے ورنہ کم از کم ساتھ ساتھ ہوم لینگویج کا فیصلہ کر لینا چاہیئے، ہمارے برادرانِ وطن اس خیال سے غافل نہیں ہیں، اور اس مشکل پر ان کی نظر ہم سے پہلے پہنچ چکی ہے، جولائی ۱۹۱۷ء کے اخبارات میں مسٹر گاندھی کا وہ عاقلانہ مضمون شائع ہو چکا ہے، جس میں انھوں نے ہندی نام ایک غیر مصنف زبان کو ہندوستان کی عمومی زبان کا درجہ دینے کی تحریک کی ہے اور آخر دسمبر ۱۹۱۷ء میں لکھنؤ میں اس مجلس کا اجلاس ہو چکا ہے، جس کا مقصد سارے ہندوستان میں ایک زبان اور ایک خط جاری کرنا ہے، اور اس سے ان کی مراد ہندی ہے۔

۱۰ اگست ۱۹۱۷ء کی یوپی اسپیشل کانگریس کے پلیٹ فارم پر رفاہ عام کلب کے وسیع ہال میں الہ آباد کے مشہور لیڈر سے جب انگریزی میں تقریر کرنے کی فرمائش کی گئی تو اس نے کہا۔

آپ لوگ ہوم رول چاہتے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ انگریزی میں بولو کیا ہوم رول ملنے پر کوئی انگریزی میں بولا کرے گا، اگر ہوم رول کے بعد بھی آپ انگریزی میں بولا کریں گے تو ہوم رول کچھ فائدہ کی چیز نہ ہوگی، اگر آپ کے پاس ایسی زبان نہیں جس میں اپنی ضرورت کی باتوں کو کہہ سکیں تو ہوم رول کی آپ کو کچھ ضرورت نہیں ہے۔

اس روح کا سب سے بڑا مظہر مسٹر گاندھی کی اس تحریر میں ہے کہ اسال آل انڈیا

کانگریس کے صدر مجلس کی تقریر اردو ہندی یا ہندوستانی میں ہو، اگر اس تجویز پہ عمل ہوا تو مسلم لیگ کے لئے بلکہ سب سے زیادہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے منہ پہ ایک تازیانہ ہوگا، جہاں صدر مجلس کے لئے اردو بولنا انتہائی تحقیر ہے، ہمارے نوجوان انگریزی خواں معترض ہیں کہ جمعہ اور عیدین کا خطبہ عربی میں ہونا بالکل بے فائدہ ہے کہ خطبہ سے مقصود نصیحت ہے۔ اور وہ اس زبان میں ہونا چاہیئے جس کو حاضرین مسجد سمجھتے ہوں، شاید ہماری قومی مجلسیں جو مسجدوں کا اگر حکم نہیں رکھتیں تو عیدگاہوں کا حکم ان پہ ضرور عائد کرنا چاہیئے کہ زرق برق کپڑوں کی سالانہ نمائشگاہ وہ بھی ہے، ان قومی عیدگاہوں میں انگریزی تقریریں مساجد کے عربی خطبوں سے کہیں زیادہ بے سود اور کہیں زیادہ بے فائدہ ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ہندوستان جس مرض کا بیمار ہے اس کا صرف ایک ہی علاج ہے، اور وہ ملکی زبان میں تعلیم، ہے، جب تک اس نسخہ کی آزمائش نہ ہوگی ہماری مشکلات کا خاتمہ نہ ہوگا، ہماری تعلیمی ترقی کا سب سے صحیح راستہ وہی تھا جو سائنٹفک سوسائٹی کی روشنی میں سرسید کو ۱۸۶۴ء میں نظر آیا تھا، اور جس پہ ایک مدت تک وہ قدم زن بھی رہے، اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ ملکی زبان کے ذریعہ سے قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے، چنانچہ اس سوسائٹی کے ذریعے سے چالیس کتابیں اُردو زبان میں لکھی اور چھاپی گئیں، ۲۰ ہزار کی لاگت سے علی گڈھ میں اس کے لئے عمارت بنی اور چند ہی دنوں میں اس نے ملک اور حکومت دونوں میں اقتدار پیدا کر لیا، وزیر ہند نے اس کی سرپرستی قبول کر لی۔

اسی سوسائٹی سے ۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو برٹش انڈین ایسوسی ایشن پیدا ہوئی، جس نے یکم اگست ۱۸۶۷ء کو وائسرائے کی خدمت میں حسب ذیل عرضداشت پیش کی:

(۱) اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے۔

(۲) دیسی زبان میں انہی مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جن میں کہ اب طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں امتحان دیتے ہیں۔

(۳) جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو اب علم کی مختلف شاخوں میں معاوضۂ تحصیل لیاقت عطا ہوتی ہیں، وہی سندیں ان طلبہ کو عطا ہوا کریں جو انہی مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔

(۴) یا تو ایک اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمالی مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔

یہ اصلی نظام کار تھا جس پر اہل ملک کو کام کرنا چاہئے تھا، ایسوسی ایشن کی اس تجویز کو گورنمنٹ نے بھی نظر تحسین سے دیکھا، لیکن پھر خدا جانے وہ کونسا جادو تھا جس نے سرسید کے خیال کو مشرق سے مغرب کی طرف پھیر دیا، اور ۱۸۶۷ء میں جب دیسی زبان کی تعلیم کا مسئلہ پیش ہوا تو انہوں نے نہایت دلیری سے اس کے خلاف گواہی دی اور وہ "مدرسۃ العلوم مسلمانان"، جس کا مقصد ایک مشرقی یونیورسٹی کا قیام تھا، ایک خالص انگریزی کالج سے مبدل ہو گیا، اب گو مسلم یونیورسٹی کا تخیل سامنے ہے، تاہم سفر کا رخ چشمۂ حیوان کی طرف نہیں بلکہ ظلمات کی سمت ہے۔

پچاس برس کے بعد مردہ ہڈیوں میں پھر جان آئی، یعنی گورنمنٹ کے سامنے دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز پیش کی گئی، اگست سنہ ۱۹۱۷ء کی بیچ کی تاریخوں میں بمقام شملہ اس غرض سے جو مجلس منعقد ہوئی تھی، ہز ایکسلنسی وائسرائے نے اس میں اپنے

خیالات ان الفاظ میں ظاہر فرمائے۔

آپ کو زیر بحث مسائل پر صرف تعلیمی نقطۂ نظر سے بحث کرنی چاہیئے، یعنی انگریزی تعلیم کی ترقی کیونکر ہو سکتی ہے، تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہو یا دیسی زبانیں ہوں اور انگریزی لازمی زبان ثانوی کے طور پر سکھائی جائے۔ یہ امر خارج از بحث ہے کہ ہم اپنے طریقۂ تعلیم کے مسلمہ طرز کو بالکل بدل ڈالیں۔

تعلیم یافتہ جماعتوں کے نمائندہ انگریزی تعلیم کی سطح پر قائم ہیں جو اب تمام ہندوستان کی قومی زبان ہو گئی ہے اگرچہ مجھے ان اصحاب کے ساتھ دلی ہمدردی ہے، جو دیسی زبانوں سے بے پروائی کئے جانے کے شاکی ہیں، لیکن اب انگریزی کا درجہ دیسی زبانوں کو دیا جانا عملی پالٹیکس سے باہر ہے۔ اس مسئلہ میں سب سے بڑی دقت مختلف دیسی زبانوں کا وجود ہے، جس کا کوئی قابل اطمینان علاج اب تک پیش نہیں کیا گیا

ہز ایکسلنسی ہم کو اپنے جائز حق سے محروم نہیں کرتے بلکہ مختلف دیسی زبانوں کے تصادم کا علاج پوچھتے ہیں، ہمارے نزدیک تو صرف اس کا علاج اردو زبان ہے اس کی عملاً ہمہ گیری اور عمومیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، اور اگر دیگر ملکی فرقوں کو اس فیصلہ سے اتفاق نہیں تو کانگریس و مسلم لیگ کے بیسیوں مختلف العقائد مذاہب سیاسیہ کا حل ایک مخصوص مشترکہ جلسہ سے کیا جا چکا ہے زبان کی اہمیت کا مسئلہ اس قدر پست نہیں ہے کہ اس کی خاطر کوئی مشترک فیصلہ کُن اجلاس انعقاد پا سکے۔

اردو اور ہندی کا جو لوگ سوال اٹھاتے ہیں وہ درحقیقت زبان کے فلسفہ سے بیگانہ ہیں، زبان کے خط کے لحاظ سے تو یہ سوال ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کی زبان کس خط میں لکھی جائے لیکن اس سوال کو صوبوں کے رواج پر چھوڑ دینا چاہیئے رفتہ رفتہ

یہ اختلافات خود مٹ جائیں گے۔ ہم کو اصل زبان کے ذخیرۂ الفاظ پہ غور کرنا چاہیے

زبان میں تین چیزیں ہوتی ہیں، اسم، فعل اور حرف۔ زبان کی اصل ماہیت فعل اور حرف ہیں، اسم دوسری زبانوں سے آتے رہتے ہیں اور مٹتے جاتے ہیں اور بدلتے جاتے ہیں، عربی زبان میں سینکڑوں لفظ دوسری زبانوں سے آئے ہیں، فارسی میں ہزاروں عربی الفاظ مستعمل ہیں، انگریزی میں لا تعداد یونانی اور لیٹن لفظ ہیں تاہم ان کو عربی اور فارسی اور انگریزی ہی کہیں گے، اسی طریقہ سے اگر ہماری اُردو میں آدھے فارسی اور عربی اسما مل گئے ہیں تو اس سے وہ ہندی ہونے سے خارج نہیں ہو سکتی، جبکہ اس کے سارے افعال سارے حروف اور آدھے اسما خالص ہندی ہیں، یہ سچ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کی قومی اور مذہبی ضرورتوں کے لحاظ سے جو کبھی مٹ نہیں سکتیں، ان کا خزانۂ عبارت قومیت کی ضروریات کے اختلاف سے عربی و فارسی و سنسکرت ہی رہے گا، اور اس میں کچھ حرج نہیں، مصر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کی زبان عربی ہے لیکن عیسائیوں کی تمام مخصوص قومی اور مذہبی اصطلاحات قبطی ہیں، اور مسلمانوں کی عربی، پھر بھی وہ ایک ہی زبان بولتے ہیں۔

انڈیا آفس لائبریری

میں

اردو کا خزانہ

اس وقت میں معارف کے ناظرین سے سات ہزار میل دور ہوں۔ بار بار جی چاہا کہ اس عجائبستانِ عالم سے ان کے لائق کوئی تحفہ بھیجوں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ۲۶ر فروری سے (یعنی جس دن سے ہمارا وفد انگلستان کے ساحل پر اترا) آج ۷ر اپریل تک شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو آمد و رفت اور ملاقات سے خالی ہو، لندن چھوڑ کر کبھی پیرس اور کبھی اور کہیں جانا پڑتا ہے، اور اب انگلستان کے دوسرے شہروں کا دورہ شروع ہوتا ہے، کل رات کو اڈنبرا، وہاں سے مانچسٹر، ۳ر مئی کو کیمبرج اور واپسی کے بعد ۵ر کو پیرس، غرض؛

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

گو میری مصروفیت وفد کے دوسرے ارکان، محترم محمد علی و سید حسین صاحب سے بہت کم ہے پھر بھی اتنی کہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا، جس کی معافی چاہتا ہوں اس دوران میں اس ایوانِ حکومت میں جس کا نام انڈیا آفس ہے، تین چار دفعہ جانے کا اتفاق ہوا، اس عمارت میں جہاں سیکڑوں حقیقی و مجازی زیارت گاہیں ہیں، ایک زیارت گاہ کا نام انڈیا آفس لائبریری ہے، یہ لائبریری اسی عمارت کے ایک گوشہ میں واقع ہے، اور

ہندوستان کی علمی تاریخ کا مرقع ہے، ایک گول ریڈنگ روم (مطالعہ کا کمرہ) ہے اس کے ایک پہلو میں کتب خانہ ہے، دوسرے پہلو میں کئی چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں، جو کتب خانوں کے قسموں کے دفتر ہیں، مسٹر اسٹوری جو پہلے علی گڑھ کالج میں عربی پروفیسر تھے۔ وہ یہاں اسسٹنٹ لائبریرین ہیں، ڈاکٹر آرنلڈ جو کسی زمانہ میں علی گڑھ کے گذشتہ علمی دور کے ایک ممبر تھے وہ گو لائبریری سے تعلق نہیں رکھتے، لیکن انڈیا آفس سے متعلق ہیں، میں ان دونوں بزرگوں کا ممنون ہوں کہ انھوں نے لائبریری کے دیکھنے میں ہر طرح مدد دی۔

اس لائبریری میں عربی فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی، گجراتی، ہندی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، عربی اور فارسی کی بعض نادر قلمی کتابیں نظر سے گذریں، قطعات کا ایک نادر مجموعہ یہاں دیکھا جو کبھی ممتاز محل بیگم کی ملک تھا، یہ وہی ممتاز محل ہیں جو شاہجہان کی چہیتی بیوی تھیں اور جن کے غیر فانی نام کو تاج محل ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

تصویروں کا ایک مرقع مجھے دکھایا گیا جو داراشکوہ کی ملکیت میں تھا، اس میں شہزادہ کے مختلف عہد کی، بچپن، تعلیم، جوانی کی تصویریں ہیں، کوفی خط میں لکھا ہوا قرآن مجید کا ایک نسخہ دیکھا جو نہایت عتیق نسخہ تھا، یہ نسخہ قدیم عربی خط کے مطابق زیر و زبر اور نقطوں سے خالی ہے، مجھے ہندوستان میں تاریخ شیر شاہی کی تلاش تھی، یہاں اس کے متعدد نسخے دیکھے، مگر افسوس کہ کتاب کی نوعیت کی نسبت جو ذہن میں خیال تھا وہ صحیح نہیں نکلا۔

اس وقت سرسری طور سے میں کتب خانہ کی اردو کتابوں کے ذخیرہ[1] کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، انڈیا آفس لائبریری تقریباً اسی وقت سے قائم ہے، جب سے اردو نے اپنی ترقی کا

---

[1] انگلستان میں اردو کتابوں کے ذخیرہ کے متعلق یہ پہلی اطلاع ہندوستان میں شائع ہوئی ہے"

آغاز کیا ہے اور اگلے انگریزوں کو چونکہ اپنی نئی حکومت کی تازہ ترین زبان سے غیر معمولی دلچسپی تھی، اس لئے اس لائبریری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اُردو کی قدیم ترین کتابیں جو ہندوستان میں ناپید ہیں، وہ یہاں موجود ہیں، اُردو کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ایک جلد میں جو ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے چھپی ہے، اس فہرست کو بلوم ہارٹ صاحب (J.-H. Blu. mhardt) نے مرتب کیا ہے، یہ اُردو کے فاضل ہیں اور کسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی رہ چکے ہیں قلمی کتابوں کی فہرست بھی اُن کے زیر تحریر ہے مسٹر اسٹوری نے اس کا مسودہ خاص طور سے منگوا کر دکھایا، مگر چونکہ بلوم ہارٹ صاحب خود موجود نہ تھے۔ اس لئے ان کے بلا اجازت اس مسودہ سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔

بہر حال مطبوعہ اردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی۔ اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا کہ الحمد اللہ ہماری زبان بھی اتنی ترقی پا چکی ہے کہ تین سو صفحوں میں اس کی فہرست تمام ہوئی ہے، یہ فہرست سنہ ۱۹۰۰ء میں چھپی ہے، اس لئے موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس میں شامل نہیں ہیں، اس فہرست کو دیکھ کر یہ تعجب ہوا کہ اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی، دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی زبان بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل قلم کا برابر کا سا حصہ ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں میں منقسم نہیں کیا تھا، بلکہ صرف ایک سالم اور متحد ہندوستان دنیا میں موجود تھا۔

بہر حال اُردو کتابوں کی یہ فہرست، جو صرف مطبوعہ کتابوں پر مشتمل ہے، چھ عنوانوں پر بٹی ہے، علوم و فنون، تاریخ و جغرافیہ، ادبیات، کتب تعلیمی، الٰہیات، متفرقات

ہر ایک عنوان کے تحت میں حسب ذیل تقسیمات ہیں۔

۱۔ علوم و فنون

۱۔ زراعت و نباتات
۲۔ صنعت و حرفت
۳۔ ہیئت و نجوم
۴۔ علم الطبخ
۵۔ نیرنگ و طلسمات
۶۔ علم المنزل و قواعد صحت۔
۷۔ نقشہ کشی
۸۔ اخلاق
۹۔ ورزش و سپہگری
۱۰۔ قانون
۱۱۔ انگریزی قانون
۱۲۔ ہندو قانون
۱۳۔ اسلامی قانون
۱۴۔ منطق و فلسفہ
۱۵۔ طب و تشریح
۱۶۔ علم الحرب
۱۷۔ موسیقی
۱۸۔ لغت
۱۹۔ علم السنہ
۲۰۔ طبعیات
۲۱۔ معاشیات
۲۲۔ علم المعانی والبیان
۲۳۔ اجتماعیات
۲۴۔ طب حیوانات (بیطاری)

۲۔ تاریخ و جغرافیہ

۱۔ عام سوانح عمریاں
۲۔ سوانح محمد صلعم
۳۔ سوانح آئمہ کرام
۴۔ حالات قبائل و فرق

۵ - علم الانساب
۶ - جغرافیہ و تقویم البلدان ٹاپوگرافی
۷ - عام تاریخ
۸ - مقامی تاریخ
۹ - سفرنامہ

۳ - ادبیات

۱ - دواوین
۲ - ڈراما
۳ - خطوط و مکاتیب
۴ - انتقادات ادبیہ
۵ - شاعری
۶ - عام شاعری
۷ - تذکرۂ شعراء
۸ - مذہبی شاعری
۹ - مذہبی ہندو شاعری
۱۰ - مذہبی اسلامی شاعری
۱۱ - محاورات و امثال
۱۲ - قصص و افسانہ
۱۳ - قصص منظومہ
۱۴ - قصص منثورہ

۴ - تعلیمی کتابیں

۱ - قواعد
۲ - قواعد عربی
۳ - قواعد برگسنا (پشتو)
۴ - قواعد انگریزی
۵ - قواعد ہندی
۶ - قواعد ہندوستانی (اردو)
۷ - قواعد کشمیری
۸ - قواعد فارسی
۹ - علم الخط
۱۰ - ریاضیات

۱۱۔ علم جبر و مقابلہ
۱۲۔ علم الحساب
۱۳۔ علم حساب الکلیات والجزئیات
۱۴۔ اقلیدس
۱۵۔ علم المساحۃ
۱۶۔ علم وزن و پیمائش
۱۷۔ علم المخروطات۔ الاشکال
۱۸۔ علم المثلثات
۱۹۔ ابتدائی تعلیمی کتابیں (ریڈرس)
۲۰۔ انتخابات

۵۔ الٰہیات

۱۔ بے مذہبی اور لا مذہبی
۲۔ بودھی
۳۔ عیسائی
۴۔ بائیبل
۵۔ بائیبل لٹریچر
۶۔ تاریخ کلیسا
۷۔ تعلیمات
۸۔ ادعیہ و مزامیر
۹۔ قصص
۱۰۔ مناظرہ و موازنۂ ادیان
۱۱۔ ہندو مذہب
۱۲۔ چینی مذہب
۱۳۔ اسلام
۱۴۔ عبادات
۱۵۔ عقائد
۱۶۔ قرآنیات
۱۷۔ حدیث
۱۸۔ سکھ مذہب

۶۔ متفرقات

۱۔ تعلیمات
۲۔ تعلیم النسواں

۳ - تعلیم الصبیان۔ ۵ - رسائل موقت الشیوع

۴ - مجموعہ ہائے تقریر و مضامین۔ ۶ - روداد مجالس

ذیل میں ان چھ عنوانوں میں سے چند کتابوں کے نام مصنف کے نام اور تاریخ طبع اور مقام طبع لکھے جاتے ہیں، اس انتخاب میں قصداً صرف وہی کتابیں لی ہیں جو غدر سے پہلے یا اس کے بعد کسی قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں، قصص و منظومات کو ہاتھ نہیں لگایا ہے، کہ ہر شخص جانتا ہے، کہ اردو میں اُن کا بڑا ذخیرہ ہے۔ صرف علمی کتابیں لی ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علوم جدیدہ کی مختلف شاخوں میں کس تیزی سے اُردو اس وقت تک ترقی کر رہی تھی، جب تک وہ سارے ملک کی متحدہ زبان تھی، اور نفاق قومی سے ناآشنا تھی۔

فنِ زراعت

۱ - چائے اگانے کی کتاب، ۱۷ صفحہ، مطبوعہ لاہور ۱۸۵۴ء۔

۲ - گنگا کی نہر، مترجمہ سدا سکھ لال از انگریزی صفحہ ۴۲، ۱۸۵۴ء مطبوعہ آگرہ۔

۳ - کھیت کرم، مصنفہ کالی رائے، تین حصے، دہلی ۱۸۴۶ء، ۱۸۴۹ء، ۱۸۵۰ء

۴ - پند نامہ کاشتکاری، مصنفہ موتی لال، آگرہ، ۱۸۵۲ء

۵ - علم الفلاحۃ، رابرٹ اسکاٹ برن، صفحہ ۲۵۲، علی گڈھ ۱۸۶۵ء

۶ - علم الفلاحۃ، میجر کاربرٹ، الہ آباد ۱۸۶۹ء۔

۷ - ریشم کا کیڑا، موتی لال، لاہور ۱۸۵۲ء

۸ - تجربۂ ملخ، غلام نبی، میرٹھ ۱۸۶۵ء۔

۹ - توصیف زراعت، کلب حسین خاں، آگرہ، ۱۸۴۸ء۔

سائنٹیفک کتابیں

۱ - بحرالحکمت (اسٹیم انجن کا بیان) ریورنڈ پارکن، ۱۸۴۷ء، لکھنؤ۔

۲ - بخار کی کل، 〃 〃 ایشوری لال، ۱۸۵۵ء، بنارس۔

۳ - نورالنواظر، احمد علی کانپور ۱۸۵۲ء

۴ - علم تجمیر، کالی شنا اور سبد علی، ۱۸۷۳ء پٹنہ۔

۵ - قانون الطباع، (چھاپہ) سیتل سنگھ دہلی ۱۸۴۸ء۔

نجوم و ہیئت کی کتابیں

۱ - خلاصۂ نظام آسمانی، پنڈت واسی وہیرا، آگرہ، ۱۸۵۲ء۔

۲ - مفتاح الافلاک، عبدالسلام، کلکتہ، ۱۸۳۳ء صفحہ ۲۷۲۔

۳ - نظام آسمانی (انگریزی معہ ترجمہ ہندوستانی) کلکتہ ۱۸۳۶ء

۴ - مختصر احوال نظام آسمانی، ۱۸۴۰ء، آگرہ۔

۵ - مختصر وقائق النجوم۔ بڑے صاحب گھاٹلے، مدراس ۱۸۴۶ء

۶ - اصول علم ہیئت، رام چندر، دہلی ۱۸۴۸ء، صفحہ ۳۲۵۔

۷ - علم ہیئت، مترجمہ لفٹنٹ میلس، لکھنؤ، ۱۸۳۲ء۔

جغرافیہ

۱ - ترجمہ مراصد الاطلاع، عربی، در اُردو، عبدالمومن ۱۸۶۱-۶۲ء، پورٹ بلیر، ۳ جلد

۲ - فتح گڈھ نامہ، احوال ضلع فتح گڈھ) کالی رائے، دہلی ۱۸۴۹ء صفحہ ۲۰۴
۳ - علم جغرافیہ، مترجمہ میر غلام علی، کلکتہ ۱۸۵۱ء صفحہ ۲۲۰۔
۴ - جغرافیۂ عالم، دہلی ۱۸۵۳ء صفحہ ۱۰۹
۵ - خلاصہ علم الارض، (مع انگریزی) کلکتہ ۱۸۸۴ء۔
۶ - خلاصۃ الجغرافیہ، آگرہ ۱۸۵۴ء۔
۷ - مراۃ الاقالیم، کلکتہ ۱۸۳۶ء صفحہ ۱۸۰۔
۸ - مختصر بیان جغرافیۂ ہند، پنڈت چنتامنی کانپور ۱۸۶۷ء۔
۹ - جغرافیہ کا پہلا رسالہ، مترجم از انگریزی، میر غلام علی، مدراس ۱۸۵۳ء۔
۱۰ - جغرافیہ ہند از انگریزی، پنڈت سوازوپ نرائن وسیاروپ نرائن دہلی ۱۸۴۸ء صفحہ ۱۲۲

طبعیات

۱ - عجائب روزگار، رام چندر، دہلی ۱۸۴۷ء۔
۲ - بجلی کی ڈاک، جے، ڈبلو، بیل، آگرہ، ۱۸۵۴ء
۳ - ہوا کا بیان: بدری لال، بنارس ۱۸۵۴ء
۴ - علم حکمت (میکنکس) چارلیس فنک، کلکتہ ۱۸۴۳ء صفحہ ۳۰۱۔
۵ - معدنیات، جواہر لال، آگرہ، ۱۸۵۵ء۔
۶ - خلاصۃ الصنایع، (ترجمہ از انگریزی)، بھولا ناتھ، آگرہ، ۱۸۵۴ء، صفحہ ۱۱۲۔
۷ - مراۃ العلوم، ہری ورمن لال، بنارس ۱۸۴۹ء۔
۸ - رسالۂ مقناطیس، ترجمہ از انگریزی، سید کمال الدین دہلی، ۱۸۵۰ء صفحہ ۲۷۱۔

۹ تحصیل فی جبر المقابلہ، سید احمد خاں، آگرہ، ۱۸۴۴ء

۱۰ اصول علم طبعی، ترجمہ از انگریزی، اجودھیا پرشاد و سیوا پرشاد، دہلی ۱۸۴۸ء صفحہ ۱۶۹

۱۱ اصول جبر المقابلہ، محمد احسن، بنارس ۱۸۵۴ء

۱۲۔ اصول قواعد حسابات، ترجمہ انگریزی، اجودھیا پرشاد، دہلی ۱۸۶۰ء صفحہ ۲۶۴

۱۳۔ مقاصد العلوم، ترجمہ انگریزی، سید محمد میر ۱۸۴۱ء کلکتہ۔

۱۴۔ دائرہ علم نیچرل فلاسفی، محمد کریم بخش، لکھنؤ ۱۸۶۶ء۔

معاشیات (پولیٹیکل اکانومی)

۱۔ ترجمہ معاشیات مل، وزیر علی، دہلی ۱۸۴۳ء صفحہ ۱۴۲

۲۔ اصول علم انتظام مدن، ترجمہ انگریزی، دھرم نرائن، دہلی ۱۸۴۶ء۔

۳۔ اصول سیاست مدن، دھرم سبھا علی گڈھ ۱۸۶۹ء۔

۴۔ علم انتظام مدن، ترجمہ انگریزی، راسو لیم سینیر علی گڈھ ۱۸۶۴ء

علم معاشرت

۱۔ اقبال فرنگ، بیان عادات و آداب احوال فرنگ، نواب اقبال الدولہ بہادر کلکتہ ۱۸۳۱ء

۲۔ دستور عمل امورات شادی و غمی، چراغ شاہ ملتانی ۱۸۶۱ء

۳۔ اشتہار کمیٹی، در باب تخفیف مصارف شادی، آگرہ ۱۸۶۸ء

۴۔ ترمیم ضوابط شادی، آگرہ ۱۸۶۸ء۔

۵۔ ضوابط شادی آرہ، ۱۸۶۸ء، ایضاً پٹنہ، ۱۸۷۴ء

منطق

۱۔ ترجمۂ شمسیہ، مولوی سید محمد، دہلی ۱۸۴۴ء۔

۲۔ میزان العلوم، سید عبدالعلی، پٹنہ، ۱۸۶۹ء۔

۳۔ خلاصۃ المنطق، دیوی پرشاد، بدایوں ۱۸۶۹ء۔

لائبریری کے بند ہونے کا وقت آگیا، اس لئے مجبوراً یہ فہرست تمام ہوتی ہے ورنہ جی تو چاہتا تھا کہ اس تمام ذخیرہ کا ایک سرسری جائزہ ناظرین معارف کے پیش کر سکتا۔

(معارف ماہ جون ۱۹۲۰ء)

۲۷ر اپریل ۱۹۲۰ء

البرٹ ہال مینشن، لندن۔

انجمن اردوئے معلّٰی کے چند سوالوں کے جواب

"دسمبر ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کی جوبلی منائی گئی تھی، اس تقریب سے ہمارے دوست پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے اردو سے دلچسپی رکھنے والے چند صاحبوں کے پاس اردو کی ترقی کے کچھ سوال لکھ کر بھیجے تھے، اور ان کا جواب مانگا تھا۔ میں نے ان کا جو جواب لکھا وہ موصوف نے جنوری ۱۹۲۶ء کے سہیل میں چھاپا تھا۔ اس وقت اس جواب میں جو تجویزیں پیش کی گئی تھیں وہ اس وقت انوکھی معلوم ہوتی تھیں، مگر اب چودہ برس کے بعد دیکھیے کہ ان میں سے کتنی تجویزوں پر زمانہ نے عمل کرا دیا، اور اب کتنی باقی ہیں۔

یہ جوابی مضمون شروع کی تمہیدی سطروں اور آخر کے غیر اہم سوالوں کو چھوڑ کر درج ذیل ہے، سوالات یہ تھے:

۱۔ اردو میں ہندوستان کی مقبول اور مشترک زبان بننے کی کہاں تک صلاحیت ہے، اور یہ مقصد کس طور پر حاصل ہو سکتا ہے۔

۲۔ اردو کو دنیا کی سنجیدہ اور علمی زبانوں کی سطح پر لانے کے لئے آپ کیا تجاویز پیش کرتے ہیں۔

۳۔ ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار یا ناخوشگوار رکھنے یا بنانے میں اردو کا کہاں تک

دخل ہے، کیا آپ کوئی ایسی تجویز پیش کریں گے جو اس کشاکش کا بطریق احسن ازالہ یا انسداد کر سکے۔

۴۔ کیا ایسی مرکزی انجمن یا اکاڈیمی کی ضرورت ہے اور اس کا قیام ممکن ہے جو عام طور سے اردو کے لئے مفید ہو، اور اسکی رہنمائی کر سکتی ہو، اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو اس کو قائم اور کامیاب بنانے کے لئے آپکی تفصیلی تجاویز کیا ہونگی۔

عبارت میں کہیں کہیں لفظی اصلاحیں کی گئی ہیں۔

ہندوستان کا عموماً یہ حال رہا ہے کہ جس صوبہ میں جو راج بنا اور جہاں تک وہ پھیلا وہیں کی بولی اس ملک کی زبان بنی اور پورے راج میں پھیل گئی، جب اس صوبہ کی سلطنت مٹ کر دوسرے صوبہ کی سلطنت قائم ہوتی تو پھر اس دوسرے صوبہ کی زبان کو عمومی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی، اس طرح ہندوستان میں جس طرح صوبوں کی سلطنت کا نشیب و فراز بدلتا رہا، اسی طرح زبانوں کا بھی اتار چڑھاؤ ہوا کیا، اسی طرح ہندوستان کے مختلف زمانوں میں مختلف زبانوں کو ہندوستان کی عام زبان بننے کا فخر حاصل ہوا، مسلمان آئے تو یہ درجہ فارسی کو حاصل ہوا، اسی کے ساتھ پنجاب، دلی، اودھ، بہار اور ڈھاکہ اور مرشد آباد وغیرہ میں جہاں تک ان کی ادبی سلطنت پھیلی، وہاں کے نئے اور پرانے باشندے ملکر عام بول چال، خرید و فروخت، وعظ و نصیحت، سمجھانے بجھانے کے لئے ایک ملغوبہ زبان اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، جس کا ابتدائی نام ہندی تھا، بعد کو اردو پڑا۔

مسلمانوں کے بعد انگریزوں کی سلطنت آئی تو ان کو پورے ملک کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی، اور انھوں نے ہندوستانی کے نام سے اس کو اور فروغ دیا۔

(الف) الغرض اوپر کی سطروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستان کا ملک ہمیشہ ایک مشترک اور عام زبان کا محتاج رہا ہے، اور اس کی وہ زبان سیاسی انقلابوں کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔

(ب) ہندوستان کی حیثیت ایسی مختلف قوموں کے وطن کی ہے۔ جن میں سے ہر ایک کی زبان دوسری سے مختلف ہے، اس لئے ایسے ملک کی کوئی دائمی مستقل اور مشترک زبان اگر بن سکتی ہے، تو وہی جو ہندوستان کی مختلف بولیوں کا مجموعہ اور سب قوموں کے باہمی میل جول کا نتیجہ ہے۔

(ج) تصنیفات کی کثرت، مطبعوں کے رواج، اخبارات کی اشاعت، ریلوں کی وسعت اور سفر کی آسانیوں نے پہلے سے بہت زیادہ اس ملک میں ایک مشترک زبان کی ضرورت ظاہر کر دی ہے۔

(د) چونکہ مختلف قوموں کا باہمی میل جول ہی اس زبان کی پیدائش کا سبب ہے اس لئے خود بخود جہاں تک ریلوں کی لائنیں بچھتی جاتی ہیں، یہ مشترک زبان کسی نہ کسی بھیس میں موجود ہے۔

اس وقت ہندی نام کوئی بول چال کی زبان کسی صوبہ کی نہیں ہے، موجودہ، اردو اور ہندی میں جو فرق ہے وہ افعال اور حروف کا نہیں ہے بلکہ صرف اسماء کا ہے، یہ اسماء ہر قوم اور صوبے کے حسب حال کچھ نہ کچھ بدلتے ہی رہیں گے، مگر بہر حال وہ اردو ہی رہے گی، اور وہی ہندوستان کی مشترک زبان بن سکتی ہے، ثبوت کے لئے نظری اور منطقی دلیلوں کی ضرورت نہیں، بلکہ خود عملی واقعہ اس کی دلیل ہے۔ پشاور سے لے کر تم بمبئی تک سفر کرو، پھر کراچی سے لے کر ہمالیہ تک آؤ، ہر اسٹیشن پر، ہر قلی، ہر خوانچہ فروش

سے ہر دو کاندار سے، ہر ساتھی سے، ہر گاڑی والی سے اگر تم اس صوبہ کی خاص زبان نہیں جانتے۔ تو یہی ہندوستانی زبان تمھاری رفیق ہے، اور وہی ہر جگہ تمھاری زبان سے نکلتی ہے اور نکلے گی، اس لئے معمولی کاروبار اور بول چال کی حیثیت سے تو وہ اس وقت بھی ہندوستان کی مشترک زبان ہے، جو کچھ بحث ہے وہ یہ ہے کہ اس کو ہندوستان کی ساری قومیں اپنی علمی اور تعلیمی مشترک زبان مان لیں۔

اس وقت اردو کی حالت یہ ہے کہ جہاں تک عام اور مشترک ضرورت کا لگاؤ ہے: وہ ہندوستان کی مختلف بولیوں والی قوموں کے درمیان جان پہچان اور بول چال کا رشتہ بنی ہوئی ہے، ہندوستان کی تمام بڑی بڑی قومیں ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی اگر وہ انگریزی نہ جانتی ہوں تو یہی سب کے کام آتی ہے۔ مختلف صوبوں کے مختلف بولیوں کے بولنے والے سفر میں جب اکٹھے ہوتے ہیں، تو یہی زبان اُن کے درمیان کی کڑی ہوتی ہے، ہندوستان کے مسلمان جس صوبہ میں رہتے ہیں گو ان کی مادری زبان ان کے صوبہ کی وہی بولی ہے۔ پھر بھی ان کی دوسری عمومی زبان اردو ہے، اور وہی ان کے جلسوں اور مجمعوں کی زبان ہے، اس لئے مسلمانوں کی آبادی کا جہاں تک تعلق ہے، وہ ہندوستان کی عام زبان ہے، جن مقامات میں وہ نہیں بولی جاتی وہاں وہ سمجھی ضرور جاتی ہے، مدراس، بمبئی اور بنگال سے جہاں کی وہ مادری زبان نہیں، اردو اخبار اور رسالے برابر نکل رہے ہیں، ہندوستان سے باہر ان تمام مقامات میں وہ پائی جاتی ہے، جہاں کسی ہندوستانی کا قدم پہنچا ہے، ہندوستان سے نکلا ہوا کوئی جہاز جس بندرگاہ سے عام طور سے گذرا کرتا ہے ہر جگہ اردو کے قدم مضبوط گڑ گئے ہیں، جہاں جہاں ہندوستانی نو آبادی

قائم ہے یہ زبان ان کے دم کے ساتھ ہے۔ افریقہ کے مختلف حصوں اور عرب کے مختلف بندرگاہوں میں وہ بولی جاتی ہے یہاں تک کہ سوئیز تک اس کی نہر جاری ہے، سنگاپور، مالدیپ، رنگون، جاوا، چین، افغانستان تک اس کا تھوڑا تھوڑا نشان ملتا ہے، ان واقعات سے یہ ثابت ہوگا کہ گو زبان سے کتنا ہی انکار کیا جائے مگر یہ ماننا پڑے گا کہ وہی ہندوستان کی مشترک اور عام زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی ایک زبان ہے جو آئندہ ہندوستان کی علمی اور تعلیمی زبان آسانی سے بنائی جا سکتی ہے۔

اس وقت کوئی ایسا عقلمند ہندوستان میں نہیں جو اس ملک کے لئے ایک عام اور مشترک زبان کی ضرورت سے انکار کرے، اگر ہندوستان کو ایک قوم بنانا ہے تو مقامی زبانوں کے سوا ایک نہ ایک عام زبان اس کو بنانی پڑے گی۔ اور جب یہ زبان اس حد تک پھیل چکی ہے اور رائج ہو چکی ہے، تو اس کے سوا کسی اور دیہاتی زبان کو اسی حد تک پھیلانے اور بڑھانے میں کوئی دوسری قوم کیوں اپنا وقت، روپیہ اور اپنی محنت صرف کر رہی ہے، حالانکہ تجربہ ہے کہ جس چیز کو وہ پھیلا رہی ہے وہ اسی زبان کی کم ترقی پائی ہوئی شکل ہے۔

شہروں اور دیہاتوں کی زبانیں بے شبہ مختلف ہیں لیکن اختلاف ادنیٰ اور اعلیٰ کا ہے، جہاں تک شہروں کا تعلق ہے، اردو ہی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اسی کے فعل و حرف اور اسم بولے جاتے ہیں، دیہاتوں کا جہاں تک لگاؤ ہے وہاں ان صوبوں میں بھی جہاں کی علمی و ادبی بلکہ مادری زبان اردو ہے مختلف فعلوں اور اسموں کی کم درجہ اردو بولی جاتی ہے، اور وہ ہر جگہ کی علیحدہ ہے، اودھ کی دیہاتی

زبان گورکھ پور ڈسٹرکٹ کی دیہاتی زبان، آرہ کی دیہاتی زبان، چمپارن کی دیہاتی زبان سارن کی دیہاتی زبان، خاص بہار کی دیہاتی زبان، اسی طرح اطراف دلی کی دیہاتی زبان، اطراف سہارنپور کی دیہاتی زبان، علی گڑھ کی دیہاتی زبان ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہے، حالانکہ تمام ان مقاموں کی علمی تعلیمی، مجلسی بلکہ مادری زبان صرف اُردو ہے، تو اگر ان ہی دیہاتی زبانوں کو ہندی کہہ کر ملک کی عام زبان بنانے کی کوشش ہے تو سوال ہوگا کہ کس مقام کی دیہاتی زبان اس کام کے لئے چنی جائے گی، ہندوستان کے باہر بھی دنیا کے ہر ملک میں ایسی دیہاتی زبانیں موجود ہیں مگر وہ ملک کی عام علمی تعلیمی ادبی اور مجلسی زبان نہیں قرار پاتیں۔

الغرض اُردو کے عام مشترک زبان بنائے جانے پر دلیلیں یہ ہیں:

۱۔ ہندوستان جیسے مختلف ذاتوں، قوموں اور بولیوں کے ملک میں اُردو ہی جیسی ملی جلی بولی عام مشترک زبان بن سکتی ہے۔

۲۔ یہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بنی، اور ان کی دوستی و محبت کی دائمی یادگار ہے، اس یادگار کو مٹانا سیاسی حیثیت سے حد درجہ خطرناک ہے۔

۳۔ اس کو لٹیا ور سے لے کر بنگال کی سرحد، سی پی کے قلب اور دکن کے گوشوں تک سب ہندو مسلمان بولتے ہیں، اس لئے آسانی سے وہ پورے ملک کی مادری نہیں تو کم سے کم علمی اور تعلیمی زبان بن سکتی ہے۔

۴۔ سات کروڑ مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس وقت بھی ہر صوبہ میں ان کی عام اور مشترک زبان ہے، ہر صوبہ میں ان کے اخبارات، رپورٹیں، کتابیں اور رسالے اسی زبان میں ہیں اور وہی ان کی تعلیم اور تقریر کی زبان ہے۔

۵۔ جن صوبوں کی مادری زبان نہیں وہاں بھی وہ عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے اس کو وہاں اور ترقی دینا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

۶۔ ایک زبان جس نے ملک میں عام اور مشترک حیثیت یہاں تک حاصل کر لی ہو، اس کو مٹا کر دوسری زبان کو رواج دینے کی کوشش اگلے بزرگوں کی صدیوں کی محنت پر پانی پھیر دینا ہے۔

۷۔ جہاں تک بیرون ہند کا تعلق ہے، یہی زبان ہندوستان کی عام زبان سمجھی جاتی ہے، اس لئے اس کو مٹا دینے یا بدل دینے کی کوشش دنیا کو پھر نئے سرے سے ایک نئی زبان سے آشنا کرنے کے لئے محنت کرنا ہے۔

۸۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ آس پاس کے دوسرے ایشیائی اور مشرقی ملکوں کی زبانوں سے متعلق ہے، افغانستان، ایران، ترکستان، عرب عراق، شام، مصر وغیرہ ملکوں کے لوگ نہایت آسانی سے اس کو سیکھ سکتے ہیں، اور سیکھتے ہیں، اس لئے اگر یہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان مان لی جائے، تو اس کا نہایت امکان ہے، کہ آیندہ وہ تمام ایشیا بلکہ سارے مشرق میں سمجھوتے کی زبان بن جائے اور یہ امر ہندوستان کی دائمی اور نہ مٹنے والی عزت کا سبب ہوگا۔

اب سوال کے دوسرے ٹکڑے کا جواب دینا ہے کہ اس کو مشترک اور عام زبان بنانے کا کیا طریقہ ہے؟ اور یہ مقصد کس طور سے حاصل ہو سکتا ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ کہ اُردو ہماری کوششوں کے بغیر یہاں تک پہنچی ہے، یعنی کسی نے کوئی خاص کوشش اس کے لئے نہیں کی ہے، تاہم وہ پھیل رہی ہے اور پھیلتی باقی ہے اور یہ اس لئے کہ وہ فطرت کی طلب اور تقاضے کے مطابق ہے، ملک کو ایک

عام اور مشترک زبان کی ضرورت ہے، اور وہ اس ضرورت کی پیاس کو بجھاتی ہے اب اس خودرو ترقی کے علاوہ حسب ذیل دوسرے ذریعوں کو بھی اس کے لئے اختیار کیا جائے تو مناسب ہے۔

۱- اُردو کے ہمدردوں اور ہندی کے حامیوں کا مشورہ کا ایک مشترک جلسہ ہو، اُس میں اُردو اور ہندی کی بحثوں کے متعلق ہمدردی اور نیک نیتی کے ساتھ گفتگو اور سمجھوتہ ہو اور معلوم کیا جائے کہ وہ ہندی سے کیا مراد لیتے ہیں، اور ہم اردو کو کیا سمجھتے ہیں، کیونکر دونوں قومیں ایک زبان کے پلیٹ فارم پر جمع ہوسکتی ہیں، اور دونوں کے پاس اپنے اپنے دعووں کی کیا دلیلیں ہیں؟

۲- مختلف صوبوں کے اسکولوں، کالجوں اور مدرسوں میں اردو ریڈنگ روم اور اُردو کلب قائم کئے جائیں۔ جن میں داخلہ کی شرط یہ ہو کہ ان کو اُردو بولنا پڑےگی۔

۳- چند جوان ہمت اصحاب ایسے کھڑے ہوں جو کسی مرکزی انجمن کی طرف سے ہندوستان کے ان صوبوں کا دورہ کریں جہاں اُردو بولی نہیں جاتی، وہاں جا کر اردو کی ضرورت لوگوں کو سمجھائیں، وہاں کے مدرسوں میں اس کی تعلیم کی طرف توجہ دلائیں اور اُردو قرأت خانے اور کلب قائم کریں اور اردو رسالوں اور اخباروں اور کتابوں کا شوق دلائیں۔

۴- سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور ادبی کتابیں اور قصہ کہانی کے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھوا کر چھپوائیں اور ان کو نصاب میں داخل کرائیں، اور لوگوں کو مطالعہ کے لئے پیش کریں، ان کتابوں اور رسالوں کی تصنیف میں ان باتوں کا خیال رکھا جائے

(الف) زبان صاف شستہ اور سادہ ہو جس میں موٹے موٹے عربی اور سنسکرت

لفظوں سے پرہیز کیا جائے، جہاں تک ممکن ہو، فارسی اور عربی ترکیبوں اور فارسی اضافت اور صفت موصوف اور عطف سے بچا جائے، اور عربی و فارسی جمعوں کی جگہ اردو قاعدہ کے مطابق جمع بولیں، مثلاً تجاویز کے بدلے تجویزیں، تدابیر کی جگہ تدبیریں کتب کے بجائے کتابیں وغیرہ، اسی طرح سنسکرت کے حرف عطف وغیرہ سے بھی پرہیز کیا جائے۔

(ب) فارسی، عربی اور سنسکرت کے بہت سے الفاظ کٹ چھٹ کر اور گھڑ اور پٹ پڑھ کر اردو لفظ بن گئے ہیں، لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کو غلط ٹھہرا کر صحیح طور پر عربی، فارسی، سنسکرت لفظ بولے جائیں، اس کی سختی سے مخالفت کی جائے۔

(ج) اردو گرامر اور اردو سکھانے والی بول چال کی کتابیں بنگالی، تامل، تلنگو، ملیالم سندھی، گجراتی اور مرہٹی ہیں۔ ان میں سے ہر زبان کے بولنے والوں کے لئے الگ الگ لکھی جائیں اور ہر ایک میں اردو ڈکشنری بنائی جائے۔

(د) ایک دو ایسے اخبار اور رسالے خاص اسی ضرورت سے آسان سہل اور بالکل سادہ زبان میں نکالے جائیں، جو مبتدیوں کے کام آئیں اور وہ ان کو پڑھیں۔

(ھ) کوشش کی جائے اور نمونے پیش کئے جائیں کہ آیندہ ہماری تحریروں کے عام فہم نمونے بیہ ہوں۔

(و) اردو کی اس خوبی نے کہ اس میں ہر زبان کے لفظ آسانی سے چلن میں آسکتے ہیں اس بات کا موقع دے دیا ہے کہ لوگ اس کی خوبی کو عیب بنا دیں، یعنی گویا ہر فریق کو یہ عام اجازت دی گئی ہے کہ جس قدر لفظ فارسی یا عربی یا سنسکرت یا انگریزی کے وہ بڑھاتے جائیں وہ اردو ہی باقی رہے گی، اس طرح اردو کی مٹی پلید ہو رہی ہے اس کی روک تھام ضروری ہے۔

(ز) اس کے لئے ہمارے خیال میں یہ کیا جائے کہ چند مسلمان اور ہندو اہل قلم مل کر اُردو کا ایک ایسا لغت لکھیں جس میں اُردو کے قابل تمام کھرے لفظ چن لیں، اور ان ہی کو دوسرے لفظوں کے پرکھنے کا معیار بنائیں۔

(ح) اردو ہی کے چھپے ہوئے منی آرڈر فارم اور کچہری کے کاغذات اور دوسرے سرکاری کاغذات استعمال کئے جائیں اور اُردو ہی میں خطوں پر پتے لکھے جائیں، سڑکوں پر بورڈ لگائے جائیں، اسٹیشنوں پر نام لکھے جائیں۔

(ط) ایسے معنوں کے لئے جن کے لئے پہلے سے خاص اردو لفظ مل سکتا ہے غیر زبان کا لفظ استعمال نہ کیا جائے، نیز یہ کہ اگر کسی زبان کا کوئی لفظ اُردو میں چل گیا ہے تو اس کو چھوڑ کر دوسرا لفظ نیا نہ بولا جائے، مثلاً کونسل کی مجلس کی جگہ مجلس زعماء" ڈاک خانہ کی جگہ "پوسٹ آفس" یا "بوسطہ"۔ اسٹیشن کی جگہ "محطہ" پروگرام کی جگہ "بروغرام" وغیرہ۔

اُردو کو سنجیدہ علمی زبانوں کی سطح پر لانے کی تجویزیں یہ ہیں:-

(الف) اُردو کی چھوٹی بڑی لغت کی کتابیں لکھی جائیں۔

(ب) اُردو میں انسائیکلوپیڈیا، بک آف نالج، اور جیوگرافیکل اور ہسٹاریکل ڈکشنری کے طریقے پر عام معلومات کو بڑھانے والی کتابیں لکھی جائیں۔

(ج) نئی علمی اصطلاحوں کے بنانے کے لئے اب کسی نئی کوشش کے بجائے ہندو مسلمان اہل علم کی ایک ایسی انجمن بنائی جائے جو اُردو کی موزونی کے لحاظ سے ان اصطلاحوں پر نظر ثانی کرے جو دارالترجمہ حیدرآباد دکن یا ہندی سبھا، بنارس اور الٰہ آباد نے بنائی ہیں۔ اور ان دونوں میں سے ان اصطلاحوں کو چن لے جو ہندوستان کی عام تعلیمی

زبان کے مناسب ہو اور ان ہی کو رواج دیا جائے۔

(د) غیر زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے کئے جائیں۔

(ہ) مختلف مضمونوں پر خود اُردو میں کتابیں لکھوائی جائیں۔

(و) ایسے سرمایہ والے اشاعت گھر ہوں، جن کے پاس اچھا مشورہ دینے والا اسٹاف ہو اور وہ اُردو مصنفوں سے حق تصنیف خریدنے، اور اس کے صحیح چھاپنے کا کام کریں یا جو کسی سلسلۂ تصنیف کو کسی خاص علم اور فن کے متعلق ترتیب دلائیں۔

(ز) ایسے اشاعت گھر ہوں جو پچھلی چھپی ہوئی نہ ملنے والی کتابوں کو برابر چھاپ چھاپ کر بازاروں میں لائیں، آج اُردو میں بیس پچیس برس پہلے جو اچھی کتابیں لکھی گئی تھیں وہ مشکل سے ملتی ہیں۔

(ح) سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ ملک کی عام مجلسوں مثلاً اسلامی تعلیمی کانفرنس کانگرس لیگ اور تمام سرکاری کونسلوں اور عدالتوں کی زبانیں اُردو ہوں۔

(ط) اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ وہی تمام ملک میں تعلیم کی زبان قرار دی جائے کم از کم قومی یونیورسٹیوں میں وہی تعلیم کی زبان ہو جائے، جامعہ عثمانیہ نے اس راہ کو بہت کچھ آسان کر دیا ہے۔

(ی) یونیورسٹیوں کے اعلیٰ مطالعۂ و امتحان میں اُردو کو بھی جگہ دی جائے۔ اور بحیثیت ایک مستقل زبان کے اس کے لئے بھی جگہ رکھی جائے۔

(۳)

تیسرے سوال کا طریقۂ سوال صحیح نہیں ہے۔ اس سوال کے لفظوں سے یہ نکلتا

ہے کہ اردو کی بنا پر ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں خوشگواری یا ناخوشگواری پیدا ہوئی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے تعلقات کی ناخوشگواری کی بنا پر زبان کا مسئلہ معرض بحث میں آیا، اور ہندوؤں نے غلط فہمی سے اردو کو اکیلے مسلمانوں کی قومی زبان قرار دے دیا، اس لئے ہندی اور اردو میں کشاکش ہے، اس کا حل یہ ہے کہ ہم اس سے مایوس نہیں ہیں کہ ہندی کے ہمدردوں سے اردو کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا، اسی کی کوشش کرنی چاہیئے بحث لفظی ہے، کیونکہ روزمرہ کی بات چیت کے لحاظ سے اردو اور ہندی میں کوئی بڑا فرق نظر نہیں آتا، آج سے چند سال پہلے کے ہندی اور اردو پریس سے جو تحریریں نکلتی تھیں ان میں بھی کوئی نمایاں فرق نہیں تھا، اب جیسے جیسے بعض مسلمان اہل قلم ایک نئی اردو عربی و فارسی کی بے جا آمیزش سے بنا رہے ہیں، ہندو بھی سنسکرت سے ملا کر ایک نئی زبان بنانا چاہتے ہیں۔

ان دونوں قوموں کے تعلقات کی ناخوشگواری کے بعد ہندی تحریروں میں بالقصد سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کئے جانے لگے ہیں، اور ہندوؤں کی عام تقریروں میں سنسکرت کے اسی قسم کے الفاظ زیادہ سننے جانے لگے ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ زبان کے مسئلہ میں یہ کشاکش موجودہ ناخوشگوار فضا کا نتیجہ ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ حالات سدھر جائیں گے، تو ہندوؤں کو سنسکرت الفاظ کے استعمال میں وہ غلو باقی نہ رہے گا، جو اس وقت ہے، اس لئے زبان کی حیثیت سے اردو اور ہندی میں کوئی نمایاں اور بہت زیادہ واضح امتیاز آئندہ قائم نہ رہے گا۔

(۴)

ابھی مرکزیت کے سوال سے گریز کیجئے، اس کا فیصلہ طبائع اور رجحان پر موقوف ہے

جس اکاڈیمی یا بزم علمی کے خدمات زبان اُردو کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوں گے وہ خود بخود اپنی مرکزیت حاصل کرے گی، ہاں آپ مرکزیت کے تصور سے خالی الذہن ہو کر (ورنہ آپس میں منازعات کے چھڑ جانے کا امکان ہے) ایک ایسی علمی انجمن بنا سکتے ہیں، جو جوابات مندرجہ سوالات نمبر ۱ و نمبر ۲ کو بہتر سے بہتر طریقے سے عملی جامہ پہنا سکے۔ اس انجمن کے کام یہ ہوں:-

(الف) ہندوستان کے اعلیٰ پایہ مصنفوں کے خدمات حاصل کر کے ان کی تصنیفات کو شائع کرنا۔

(ب) مختلف کالجوں اور اسکولوں کے طالب علموں کے ذوق علم کا اندازہ لگا کر ان میں سے کچھ کو تصنیف و تالیف، ماہوار رسالوں اور اخباروں کی اڈیٹری کا کام کرنے اور دوسری ادبی خدمتوں کے لئے چننا۔ اس کے لئے ان سے معاہدہ لکھوا کر ان کو وظیفہ دینا۔

(ج) جن صوبوں میں اُردو مروج نہیں وہاں اس کو رواج دینے کے لئے ایسے اشخاص پیدا کرنا جو تکلیفیں اٹھا کر وہاں جائیں، اور تحریروں، تقریروں اور عام گفتگوؤں کے ذریعہ سے لوگوں کو ایک عام مشترک زبان کی ضرورت جتائیں۔ ان کو اُردو سکھائیں، وہاں سے ایسے اشخاص ان صوبوں میں لائیں جو یہاں اُردو سیکھیں اور اپنے یہاں جا کر اس کو پھیلائیں، اُردو سکھانے کے رات کے مدرسے اور مفتی کتب خانے اور قرأت خانے جگہ جگہ قائم کریں، جن میں ہفتہ یا مہینہ میں ایک دفعہ عام فہم اُردو میں تقریریں کی جائیں یا تحریریں پڑھی جائیں۔

(سہیل علی گڈھ، جنوری ۱۹۲۶ء)

ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی

"یہ مضمون ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی دوسری ادبی کانفرنس میں جو اپریل ۱۹۳۱ء
میں الہ آباد میں ہوئی تھی، پڑھا گیا تھا۔"

اُردو کی جائے پیدائش بننے کا فخر خواہ ہندوستان کے کسی گوشہ کو حاصل ہو، مگر اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ دکن ہی وہ سرزمین ہے جہاں اُردو شاعری کا بیج پہلے بویا گیا، اور اس نے پودا بن کر نشو و نما حاصل کی۔ شمالی ہند کے رہنے والوں نے جب اس پودے کے پھل پھول اور بو باس کو دیکھا، تو بے اختیار اس کی آبیاری کو آمادہ ہوئے اور چند روز کے بعد اس کی قلم اپنی سرزمین میں لگا کر اس کو سدا بہار بنا دیا۔ قائم کے زمانہ تک اردو کو دکنی کا طعنہ سننا پڑتا تھا۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ   اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

تاریخ اُردو کی نئی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو نظم نے دہلی کے تخت طاؤس کے بجائے دکن کے چتر و مسند کے زیر سایہ نشو و نما پائی۔ سلطان قلی قطب شاہ نے سنہ ۹۱۸ھ میں جب قطب شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی تو بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ تینوں میں شیعیت اور تفضیلیت کی اشاعت ہوئی۔ ساتھ ہی عزا اور میلاد کی مجلسیں قائم ہونے لگیں، جن میں محتشم کاشی وغیرہ کے فارسی بندوں کے ساتھ ملک کی دیسی

زبان میں بھی مرثیہ پڑھنے کا رواج ہُوا۔

یہ بات اُردو زبان کی تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ اُردو میں عشق و محبت کی داستان سرائیوں سے پہلے مذہبی نظموں کی ترانہ سنجی پیدا ہوئی۔ چنانچہ سلطان قلی اور اس کے بھتیجے محمد علی قطب شاہ، اور دوسرے شعراء شجاع الدین نوری اور نصرتی وغیرہ نے مرثیے لکھے، لیکن غالباً مرثیوں کی صنعت میں سب سے زیادہ جو شخصیت نمایاں ہے وہ ہاشم علی برہان پوری کی ہے۔

ہاشم علی برہان پوری کے مجموعۂ مراثی کا نام دیوان حسینی ہے۔ شاہ اودھ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ تھا جس کا ذکر اسپرنگر کے کیٹلاگ میں ہے۔ انگلینڈ میں اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ ملتا ہے جس کا ذکر آج کل کی بعض تحریروں میں کیا گیا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے مارچ ۱۹۳۱ء کے سفر پونا میں محبی پروفیسر شیخ عبدالقادر (دکن کالج پونا) کے کتب خانہ میں اس کا ایک مکمل نسخہ میری نظر سے گذرا، اس سے ہاشم علی اور اس کے اس دیوان مراثی کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوئیں۔

ہاشم علی برہانپوری نام کے سوا اس شاعر کا حال کسی تذکرہ میں نہیں ملا، جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ خود اسی مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے، اس دیوان کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے اس کے آخر میں خوش قسمتی سے کاتب نے جو شاعر کا معاصر تھا، چند سطریں حوالۂ قلم کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی نام علی محمد خاں ہے اور ہاشم علی اس کا عجیب و غریب مرکب تخلص ہے، چنانچہ اس دیوان کے آخر میں ہے۔

لہ راقم نے پنجاب کے ایک اخبار میں اس کا ایک اقتباس پڑھا تھا جس سے معلوم ہوا کہ اس نسخہ پر ایک لائق صاحب قلم کا مفصل مضمون ہے سے یہ مضمون پونہ میں سفر کی حالت میں لکھا گیا تھا۔

"تمام شد دیوان حسینی گفتۂ علی محمد خاں دام ظلہ، تخلص ہاشم علی"۔

اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ یہ نسخہ خود شاعر کی زندگی میں مرتب ہوا ہے، اس کی ولادت اور وفات کا سال نہیں معلوم، مگر اس کے اس دیوان میں اس کے ایک مرثیہ کی تمہید میں ایک فارسی عبارت ہے، جس میں مذکور ہے کہ ۲۰ رمضان ۱۱۴۸ھ کو اس کے ہم مشرب و ہم عقیدہ دوست حافظ فضل الدین نے خواب دیکھا کہ ضریح سے صدائے غیب آئی اور ہاشم علی کو اپنے مرثیہ سنانے کی فرمائش سنائی دی، عبارت یہ ہے،

"از جملہ تفضلات امام شہید کہ بریں عاصی شدہ آنست کہ برادر ایمانی حافظ کلام ربانی فضل الدین در عالم رویا بتاریخ بستم ماہ مبارک رمضان ۱۱۴۸ھ مشاہدہ نمود (ص ۲۷)

اس کے اس دیوان میں ایک مخمس مرثیہ ہے، جس کا نام شاعر نے دردنامہ رکھا ہے، اس کے آخر میں یہ دو شعر ہیں:-

جب منجم نے کیا اس دردنامہ کا حساب — غین و قاف و سین و طا آیا رقم اندر کتاب

سن کے یو تاریخ کوں سینہ میں دل ہوتا کباب — ختم کر ہاشم علی تا تم کی شادی کا بچھون!

اس حساب سے یہ ولی دکنی کا معاصر ہے جس کی وفات کا سال ۱۱۵۵ھ ہے، عام طور

۱؎ مزید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ولی دکنی کا جس کو اب گجراتی کہنا زیادہ موزوں سمجھا جاتا ہے، سال وفات ۱۱۱۹ھ ہے، مولوی عبدالحق صاحب نے یادگار ولی (حیدرآباد) کے صفحہ ۶۳ پر پروفیسر شیرانی نے اورینٹل کالج میگزین (نومبر ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۸) میں اور پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں نے معارف اگست ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۷ میں اس کو لکھا ہے۔

ولی کے نام سے ایک اور شاعر ولی ویلوری ہے جس کی وفات سال ۱۱۶۰ھ کے بعد ہے، ولی ویلوری پر پروفیسر مصطفیٰ خاں کا مضمون معارف ۱۹۵۲ء میں چھپا ہے، اس بنا پر ہاشم جس ولی کا معاصر ہے وہ ولی ویلوری ہے۔ (د - س)

سے ہاشم علی اس کا نام سمجھا جاتا ہے، مگر اوپر کے اقتباس سے جو اس کی زندگی میں لکھا گیا ہے ظاہر ہے کہ اس کا نام علی محمد خاں تھا اور "ہاشم علی" پورا اس کا تخلص ہے، گو تخلص کا یہ اسلوب شعراء کی طرز و روش کے خلاف ہے، مگر واقعہ یہی ہے کہ یہ اس کا تخلص ہے، نام نہیں، چنانچہ اس کے دیوان کے ہر قصیدہ اور نظم کے آخر میں یہی تخلص آیا ہے، مثلاً

جو درنت ہاشم علی ہے سر بسر ۔۔۔ انقلاب و فتنہ و آشوب دہر

بول توں بلبل صفت ہاشم علی ۔۔۔ صبح دم ہیں مدح اولاد علی

زندگی دنیا کی ہے ہاشم علی خواب و خیال ۔۔۔ جو رہا سویا وہ چوکا جاگتا ہے گو محال

شعر ہاشم ہے سخن میں زینت گلدستہ ستی ۔۔۔ جو وصل ہے وہ شعر ہر دوان سخن پارہ اتارے گا

عام طور پر برہانپوری کہتے ہیں، شاید یہ اس کی جائے پیدائش ہو، مگر اس کے دیوان میں ایک شعر یہ ہے:

گجرات میں پڑی جب یہ مرثیہ کہن بلبلاں ۔۔۔ سنکر چلے ہیں رونے دکھنی دکھن کو اپنے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا قیام گجرات میں تھا۔

دیوان حسینی | چونکہ ہاشم علی کا یہ دیوان سراسر مرثیوں کا مجموعہ ہے اس لئے شاعر نے اس کا نام دیوان حسینی رکھا ہے، چنانچہ وہ خود کہتا ہے:

نوں رکھتا ہے کربلا کا یوں بیاں ہاشم علی ۔۔۔ ہے یو "دیوان حسینی" نام اس دیوان کا

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر سال ماہ محرم میں نیا مرثیہ تصنیف کرتا تھا، کہتا ہے:

تجھ کو ہاشم علی حسین سرور　　ہر برس مرثیہ لکھاتے ہیں

اپنی شاعری کی برتری کا بھی اس کو خیال تھا۔

شاعروں نے شعر بولے گرچہ رنگین و دلکشا　　اے عزیزان تو سخن ہے اس دلِ بریان کا

عربی سے بھی واقفیت تھی ، بعض مصرعے پورے عربی میں ہیں ۔

یہ بشارت بہشت کے در پہ　　ادخلوا خالدین سلام علیک

ربنا اغفر لنا خطایانا　　یا النبی الامین سلام علیک

فارسی میں بھی بعض مرثیے کہے ہیں۔ جن کی زبان اچھی خاصی ہے ، حافظ کی فارسی غزل ع "دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدارا" پر مصرعے لگائے ہیں ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرثیوں کے علاوہ وہ غزلیں وغیرہ نہیں کہتے تھے چنانچہ ایک جگہ مقطع میں یہ اقرار ہے :

بجز مدح نہیں شعر ہاشم علی　　کہ زردستی کے سخن پہ سلام

دوسری جگہ ہے

شاعری میں یوں منفرد ہے تجھے ہاشم علی　　جز ثنا و مرثیہ شعر دگر کہنا غلط

ایک اور مرثیہ کا مقطع ہے :

شعر ہاشم علی کے تیئں یاراں　　مدح مولا ہی دیکھیو خالص

ہاشم علی ہمیشہ ثنا خواں شاہ کا　　جز مدح و منقبت سخن اس نے لکھا نہیں

موجودہ نسخہ دیوان حسینی کا یہ پیش نظر نسخہ میرے خیال میں نہایت ہی پرانا ہے ، اور خود مصنف کی زندگی میں لکھا گیا ہے ، جیسا کہ داخلہ سے ظاہر ہے ، یہ نسخہ ۴ × ۸ ۲ کی تقطیع پر پرانے کشمیری کاغذ پر خوشخط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے ، جدول ، مذہب کی لکیریں

سرخ ہیں، اصل دیوان اسی خط اور جدول میں ہے، دیوان حروفِ ابجد کی ترتیب پر الف سے یا تک مرتب ہے، مگر شروع میں اور بیچ میں بعض بعض حروف کی ردیفوں کے بعد اور آخر میں بعض نئی نظمیں جدولوں کے بغیر دوسرے خط میں بڑھائی گئی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کی ترتیب کے بعد شاعر نے جو مرثیے کہے ہیں، وہ اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے حروف میں بڑھائے گئے ہیں، چنانچہ نسخۂ مذکور کے آخر میں یہ صراحت بھی ملتی ہے

"این چند تا مرثیہ ہندی نو کہ در دیوان مرزا صاحب مشفق مہربان انیس خفی و جلی محمد علی سلمہ ربہ نبود، احقر عباد محمد علی غفر اللہ تعالیٰ ذنبہ برائے یاد بود نوشت، امید کہ ہر کہ بخواند بدعائے خیر فقیر حقیر را یاد نماید"

نوشتہ بماند سیہ بر سفید   نویسندہ را نیست فردا امید

تمت تمام شد دیوان حسینی گفتہ علی محمد خاں دام ظلہ تخلص ہاشم علی"

اس نسخہ میں ۴۲۰ صفحے ہیں، اور ہر صفحہ میں تقریباً سترہ شعر ہیں، اور یہ کل کے کل سر تا سر مرثیے، سلام اور مصائب کربلا کے بیان میں ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ آج سے دو سو برس پہلے اردو کے ایسے شاعر موجود تھے، جنھوں نے صرف مرثیوں کا ایسا ضخیم مجموعہ یادگار چھوڑا، اور اس حیثیت سے یہ مجموعہ غالباً ہندوستان میں اپنی طرز کا تنہا اور یکتا ہے۔

زبان | زبان کی خصوصیتیں وہی ہیں جو دکنی کے کلام میں ہیں، مثلاً

ستین اور سین	بجائے	سے	منی	بجائے	میں
لیہ	"	یہ	میانی	"	میں
کوں	"	کو	کنتیں	"	کے تئیں، کے لئے
سوں	"	سے	مجے	"	مجھے

آنجھو	بجائے	آنسو	کسوں	بجائے	کسی
تمن	”	تم	سونے	”	سے
ہمن	”	ہم	اتیا	”	اتنا
ہیگا	”	ہوگا			

جمع الف نون کے ساتھ، یہاں تک کہ ہندی لفظوں کی بھی، جیسے انکھیاں، پلکاں، آنجھواں، (اور آج تک دکھنی اُردو میں اسی طرح سے جمعیں بنائی جاتی ہیں) منت (کلمۂ نفی) کو "منتہ" (ہائے کے ساتھ) چنانچہ ایک مرثیہ کو جس میں ردیف منتہ ہے، ت کے بجائے ہ کی ردیف میں جگہ دی ہے۔

ہندی لفظوں کا بکثرت استعمال، جیسے بچن بات کے معنی میں، مکھ منہ کے معنی میں:-

رو رو سکینہ غم سوں کہی پھر نہیں سنے بابا کے مکھ سوں میٹھی بچن کربلا منی

سیس سر کے معنی میں "نمانا" "جھکانا" "من" دل کے معنی میں "دولن" بجائے دلہن:-

بیٹھی گھونگھٹ میں سیس نمادر بیں خموش روتی ہے آج من میں دولن کربلا منی

بجن بمعنی محبوب

ع جب سیں چلے ہیں میرے سجن کربلا منی

ویسے بمعنی دیکھے ع چہرہ خورشید سا ویسے تیرا

باج بمعنی بن ” آج تجھ باج سیہ پوش ہوا کعبہ زحم

جگت بمعنی دُنیا ” ہاشم علی ہو جگت میں سبھی ملال

اندھکار بمعنی اندھیرا ” آج تجھ باج جگت بیچ ہے اندھکار حسین

اوجارا بمعنی اجالا ” وہ جگت کے اجاری پر اتیا ستم

چندر بمعنی چاند ؎

پھر محرم کا چندر آیا نہ ہوتا کاشکے | قتل سرور کی خبر لایا نہ ہوتا کاشکے

کرن بمعنی کان ع | دو نوں کانوں اوپر زلفاں پڑی چھوتی کرن تے ہے

نینن بمعنی آنکھ ؍؍ | کیا نور نینن ہے ہے

چرن بمعنی قدم ؍؍ | افسوس ہے نہ لائی گھر نیں چرن نوں اپنی

اکاس بمعنی فضا ؍؍ | غم کے داغاں سے بھرا سارا اکاس

داس بمعنی غلام ؎

اے شہِ دیں کنیز ہاشم علی | ہے تمہارا بندہ و مملوک و داس

ذرا اوپر کے دوسرے مصرع کی فارسی و ہندی ترکیب کی آمیزش ملاحظہ ہو

نگر بمعنی شہر

سن نگر میں شور محشر ہر گلی | ہے شب قتل شہیداں آج رات

اس نگر سے کوئی خاص شہر مراد نہیں، کیونکہ دوسری جگہ وہ کہتا ہے

اس درد سوں ہاشم علی لاگے دلاں ہیں تلملے | نگروں نگر گلیوں گلی کہتے ہیں یاراں آہ ہین

صاف شعر | اس قدامت کے باوجود مرثیہ میں بہت سے شعر صاف بھی ہیں:-

ظلم کیا برملا ہائے فلک کیا کیا | فاطمہ کا دل جلا ہائے فلک کیا کیا

جس کے گلے مصطفیٰ بوسہ لیا بارہا | شمر کا خنجر رکھا ہائے فلک کیا کیا

عابدیں بیمار تھا شاہ گرفتار تھا | تجھکوں سزاوار تھا ہائے فلک کیا کیا

شکوۂ دوراں لکھوں غم کی پو باتاں لکھوں | کاں لکھاں تا فلک ہر رقم لکھوں ہائے فلک کیا کیا

جس وقت شاہ رن سوں پیاسا جگر سدھالے | بیتاب کھول سر کوں زینب نے یوں پکارا

دیکھو رسول احمد، فرزند کوں تم اپنے — افسوس کربلا میں بے سر پڑا ہے مارا

یہ کوفیاں بیدین، مہمان بولائے ہم کو — بن جور بن جفا سوں کرتے نہیں مدارا

ہوا پھر کر محرم کا مہینا — نبی کے آل کا ٹوٹا سفینا

سدھارا تشنہ لب فردوس کوں وہ — جہاں میں کوئی نہ تھا جس کا قرینا

سلیماں تخت کو چھوڑا ہے روتا — گرا خاتم نبی کا جب نگینا

کہا شہ نے حرم سوں ہیں بے چارا — مجھے شربت شہادت کا ہے پینا

نہ یہ تبدیل ہووے آج تقدیر — ہوئے حق کے قضا اوپر رضینا

سکینہ نے کہا وہ دن نہ آوے — جہاں میں بے پدر ہو مجھ کو جینا

یہ دشت کربلا ہے ہائے بابا — کہاں مکہ کہاں جد کا مدینا

کلام کا نمونہ ان مرثیوں میں سرتاپا درد مضمون، ماتم، بین، بے بسی، اور بیکسی کے حسرت انگیز واقعے بیان کئے گئے ہیں، قدرت کے منظر لڑائی کا نقشہ، گھوڑے کی تعریف، تلوار کے تشبیہی مضمون اور مبالغہ کی رنگ آمیزی مطلق نہیں، بلکہ درد و غم کے صرف فطری مضمون ان مرثیوں میں پائے جاتے ہیں، ایک مرثیہ کی سرخی ہے:-

"توجیہ نمودن شہر بانو بعد از شہادت امام زادہ علی اصغر و بیان کردن حالات و مکالمہ نمودن با او"

دیکھئے کہ ایک معصوم ننھے بچہ کی موت کا کتنا پر اثر فطری بیان ہے۔

کہتیں بانو آج میں کس کا جھولاؤں پالنا

ہائے اصغر باج میں کس کا جھولاؤں پالنا

اے جانِ مادر کہاں ہے تو پھر میں تجھکو کہاں ملون

بیٹھی اکیلی کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا

بر میں سولاؤں ہیں کسے دودھ پلاؤں ہیں کسے
جا ماں بناؤں ہیں کسے کس کا جھولاؤں پالنا

سویا ہے گردن ڈال کیوں اُلجھے ہیں لٹ کے بال کیوں
رنگیں لوہو سیں گال کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

تو کھول انکھیاں ہیں دیکھوں تو بول بتیاں ہیں سنوں
رونا نہیں تو کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا

تو چھوڑ مجھ کو کہاں گیا، توں دودھ کس کا کیوں پیا
بسر لیے میری کیوں پیا کس کا جھولاؤں پالنا

بھیگا لہو میں ہے گلا، لیتی ہوں تیری میں بلا
توں پاس اپنے مجھ بلا کس کا جھولاؤں پالنا

جاؤں کدھر میں کیا کروں، یہ گود خالی لے پھروں
اصغر اصغر میں کہوں کس کا جھولاؤں پالنا

یہ دیکھ میرا حال توں، نوچی موں سر کے بال کوں
ہیں دل کی حالت کیا کہوں کس کا جھولاؤں پالنا

تجھے کھیلنے کے دن ترے، کیا عمر تھی کیا سن ترے
نہیں چین مجھ کو بن ترے کس کا جھولاؤں پالنا

نہیں بھولی مجھ کو توں کبھوں تجھ یاد کرتے ہی رہوں
رو رو کے تجھ بن دن بھروں کس کا جھولاؤں پالنا

یہ بہن تیری غمگسار بیٹھی ہے روتی زار زار

تو اُٹھ سکینا کر پکار کس کا جھولاؤں پالنا

تو روٹھ ہٹ کر کہاں گیا، میں تجھکوں لاؤں پھر منا

منہ ہوئے مجھ سوں تو جدا کس کا جھولاؤں پالنا

تیری صورت پر میں فدا پھرتا نظر میں توں رہا

جب کہ لحد میں توں گیا کس کا جھولاؤں پالنا

جانا نظر میں نور کیوں توں مجھ سوں ہوتا دور کیوں

آتا ہے غم کا پور کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

کہاں سیں اجل تھی گھات میں، گئی لیکے تجھ کو ہات میں

بالا کیا اجی ہات میں کس کا جھولاؤں پالنا

اے میرے پیارے لاڈلے، پھر آکے لگ توں مجھ گلے

انجھوں نیر سیں بہ چلے، کس کا جھولاؤں پالنا

کہاں کھیلتا ہے آج تو، خالی یہ گھر تجھ باج یوں

جاتا ہے میرا راج کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

ہاشم علی کوں نہیں تواں، بانو کا لکھنا سب بیاں

کہتی تھی ہر دم با فغاں کس کا جھولاؤں پالنا

حضرت قاسم کی شادی اور شہادت کا پُر از سماں ان لفظوں میں کھینچا ہے۔ جس سے آج سو دو سو برس پہلے کے رسم و رواج بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

محبانِ غم شہیداں کا دلوں سینتیں بھولا دو منہ

جگر میں شہ کی فرقت کی اگن جلتی بوجھا دو منہ

حسن رضا کی جب وصیت پر لگے قاسم کے تئیں بھیانے[1]

کہا رخصت کرو رن کوں، یہ جنگل میں بہادو منہ

نہیں سامان شادی کا مصیبت سب مہیا ہے

یہ سر کاٹیں گے رن میا نے اسے سرا[2] بندھا دو منہ

پلا دیں گی مجھے شربت شہادت کا حوراں ساری

نہیں پانی پیاسوں کوں سو شربت کر پلا دو منہ

براتی ساتھ نہیں میرے چلے ہیں سب شہید ہو کر؟

میرے سر پر قضا پھرتی دگر چھتر پھرا دو منہ

طبق دیکھے ملائک کوں گئے[3] انتے نور کے رن میں

کہا قاسم نے اے اماں بری میری لے جاؤ منہ

لہو میں لال ہو ویں گے، مرے دو ہاتھ کنگن کے

نہیں حاجت مجھے مہندی، انجھو[4] سیتیں گندھا دو منہ

سینہ کے دف رہیں بجتے میری شادی کے تا محشر

سو غم کی آج تم نوبت میرے بھیا کے بجا دو منہ

لہو اور خاک رن میانے لگے گی میرے تن اوپر

او تبنا تیل منہ لاؤ، مجھے روتی چڑھا دو منہ

زمیں کے سیج پر سونا مجھے ہے گا لحد میانے

---

1. یعنی بیاہنے۔ 2. سہرا۔ 3. آ۔ 4. آنسو۔

رہے گی سیج سب خالی نہیں فرصت بچھادو منتہ

جلائی آگ ہے قسمت نہیں یہ روز اجل سے گا

سو دلہن ساتھ تم میرا یہ عقد غم پڑھا دو منتہ

مقرر مثل ہے گی شہادت رن میں پانے کوں

سو جلوہ میں ادا کرنا یہ نقد جاں دلا دو منتہ

اجل سیں تلخ اب ہونا میرا شیریں دہن دیکھو

جگر اس غم سیں ہے ٹکڑے نباتاں کو چونا دو منتہ

کہاں دلہن ستیں رونا سو تخت جلوہ سیں اُٹھ کر

تیری دوری کی آتش سوں دل اپنا تم جلا دو منتہ

عروسی کل قیامت کوں تمہاری ہو گی جنت میں

رکھو نتھ ناک میں اپنی سہاگ اپنا لٹا دو منتہ

شہادت سن میری ہر گز نہ رنگا دامن تو روتم

سو کاجل کو نین سیتیں بہا انجھو مٹا دو منتہ

روا ہے آج دولہن کوں سراپا لال جلوہ کا

مرے لہو میں رنگو آنچل وو گر رنگ تم رنگا دو منتہ

اس نسخہ میں ایک بات خاص لحاظ کے قابل یہ ہے کہ اس میں اکثر ثقیل ہندی حروف کو خفیف لکھا گیا ہے، مثلاً بیٹھے کی جگہ بیٹھے، توڑو کی جگہ تورو، لوٹاؤ کی جگہ لوتاؤ، اوٹھنا کی جگہ اوٹھنا وغیرہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک فارسی کی عادی زبانیں ہندی حرفوں کے ادا کرنے پر پوری طرح قادر نہیں ہوئی تھیں۔ الف حمد دو کو لفظ پر

مدّ دے کر لکھنے کے بجائے دو الف سے لکھا ہے، یعنی "آج" کو "ااج" وزن میں بعض حروف کے گرنے کی پروا اس نے نہیں کی ہے، نین کی جگہ نینن، نہیں کی نئیں، اسی طرح عربی لفظ عروس کو عارس باندھا ہے۔

غزل گو میر[1] و مرزا[2] سے پہلے کے پرانے اردو شاعروں کے غزلیات کے بہت سے دیوان چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، جن سے ہماری زبان کی تاریخی ترقی ظاہر ہوتی ہے مناسب ہے کہ اسی طرح مرثیہ گو میر[3] و مرزا[4] سے پہلے کے اس مجموعۂ مراثی کو بھی شائع کیا جائے تاکہ پتہ چلے کہ وہ کیا زمین تھی جس کو میر و مرزا نے اپنی بلند خیالیوں سے آسمان بنا دیا، اور معلوم ہو کہ ان مرحوموں نے جس گلستانِ سخن کو سدا بہار بنا دیا، اس کی بہار کا آغاز کیونکر ہوا ہے

اس نسخہ کے اصل دیوان کا پہلا شعر یہ ہے جو حمد میں ہے:

ابتدا ہر نامۂ و ہر کام کا　　　لازم آیا ذکر تیرے نام کا

اور آخری شعر یہ ہے:

جیہی ہے آرزو دل میں تجھے ہاشم علی دائم　　　کہ مولا کے کرم سیتیں نجف اور کربلا دیکھے

مگر دیوان کی ترتیب کے بعد جو نئے مرثیے بڑھائے گئے ہیں، اس کے لحاظ سے الف کی ردیف میں پہلا شعر یہ ہے:

افسوس ہے ہزار کہ نوشہ گذر گیا　　　رونی دلھن کوں چھوڑ کھونگھٹ میں گذر گیا

اور آخری شعر یہ ہے جو اردو مسدس کی فارسی بند ہے:

داشتت ہاشم علی چو دو سے ارادت بہ نیاز
کرد منظوم چنیں واقعہ در سوز و گداز

---

[1] میر تقی میر۔ [2] مرزا سودا۔ [3] میر انیس۔ [4] مرزا دبیر۔

مجموعہ کے شروع میں غالباً اسی زمانہ کے ایک اور مرثیہ گو شاعر کے دو مرثیے ہیں جن کی زبان بھی اسی قسم کی ہے، اور ان میں شاعر کا تخلص نقی آیا ہے۔ یہ حسب معمول چو مصرعے ہیں، تین مصرعے ایک قافیہ کے اور چوتھا ہر مرثیہ میں ایک قافیہ اور ردیف کا، سودا نے اسی رنگ میں مرثیے لکھے ہیں۔

نامہ اعمال کا اس کے ہے گناہوں سیں سیاہ — تجھ سیں امید شفاعت ہے نقی کو اے شاہ

تجھ سا کوئی کی دو جگ میں نہیں رکھنا پناہ — از ازل تیرے چرن[1] سیتیں لگا ہے ہائے ہائے

(ہندوستانی جولائی ۱۹۳۱ء)

---

[1] قدم

اُردو کیونکر پیدا ہوئی

(ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی پچیس۲۵ سالہ یادگار مجموعہ میں جو لائی ۱۹۲۲ء میں چھپا)

ہندوستان کی ادبی تاریخ کا حال جب سے ہم کو معلوم ہے یہ نظر آتا ہے کہ اس ملک میں کبھی ایک بولی نہیں بولی گئی درحقیقت یہ ملک ایک برِ اعظم ہے جس میں ہر زمانہ میں مختلف قومیں اور مختلف نسلیں جو مختلف بولیاں بولتی تھیں، آباد تھیں، آباد ہیں، اور آباد رہیں گی، دنیا کی زبانوں کی تین مشہور اصلیں آریائی، تورانی اور سامی یہاں دوش بدوش ملی جلی ملتی ہیں۔ ڈریویڈی زبانوں کی اصلیت تورانی بتائی جاتی ہے، صوبوں کی دوسری زبانیں آریائی ہیں اور عربی کی شمولیت سامی اثر کا نتیجہ ہے۔

چند مشہور راجاؤں کے زمانوں کو چھوڑ کر جو ملک کے اکثر حصّوں پر حکمراں رہے، ہندوستان کا اکثر یہی حال رہا کہ اس کے مختلف صوبے، مختلف مستقل ریاستوں کی صورت میں رہے، ان صوبوں کی وسعت، راجہ کی قوت اور فتوحات کے دائرہ کی کمی بیشی کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، ہر ریاست کی زبان اس کے صوبہ کی مقامی زبان تھی اور وہی گویا سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی، اب جس قدر اس ریاست کا دائرہ ہوتا اسی حد تک اس زبان کا جغرافی دائرہ کبھی گھٹ اور کبھی بڑھ جاتا۔

مثلاً دیکھئے کہ اودھ کی بولی برج کی بھاشا، مگدھ کی مگدھی، اطراف دہلی کی ہریانی یہ

چاروں ہمسایہ ہیں، مگر ان کی حدیں اپنی سلطنتوں کی حدوں سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ مگدھ (بہار) کی بودھ سلطنت جس کا دارالسلطنت پاٹلی پتر (پٹنہ) تھا، جب ہندوستان پر چھاگئی تو اس کی زبان بھی ہندوستان کی عام سرکاری زبان بن گئی اور آج اسی مگدھ کی پالی زبان کے کتبے پشاور سے لے کر بہار اڑیسہ کے کناروں تک ملتے ہیں۔

ہندوستان میں سندھ سے لے کر گجرات تک کا علاقہ ہمیشہ ایرانیوں اور عربوں کے جہازوں کا گذرگاہ رہا اور اسی کا اثر تھا کہ جہازیوں کے ساتھ ساتھ ان کی زبانوں کے اثرات بھی خاموشی کے ساتھ پھیلے رہتے تھے، خصوصاً سندھ وہ صوبہ تھا جو اکثر ایران کی سلطنت کا جزو بنتا اور خلیج فارس کے تمدن سے متاثر ہوتا رہا، سندھ کی آثار قدیمہ کی موجودہ تحقیقات اس نظریہ کی صداقت کو روز بروز آشکارا کرتی جارہی ہے۔

بہرحال آریائی زبان کی دوسری شاخ ایرانی یا فارسی کا اثر سندھ سے لے کر گجرات تک وسیع تھا، اس کے بعد پہلی صدی ہجری کے خاتمہ کے قریب ساتویں صدی عیسوی میں فارس کی فتح کے بعد عربوں نے بھی ایرانی سلطنت کے جانشین کی حیثیت سے سندھ پر قبضہ کیا اور ان کے جہازات خلیج فارس کے اُبلہ، سیراف اور بصرہ نامی بندرگاہوں سے نکل کر سندھ، گجرات اور ملیبار ہو کر چین تک جانے لگے، ان جہازوں کے چلانے والے، فارسی اور عربی بولتے تھے، اس کا اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہندوستان کے جن بندرگاہوں سے یہ گذرتے ہوں وہاں ان کی زبانوں کے کچھ الفاظ مستعمل ہوجائیں اور وہاں کی مقامی زبانوں کے کچھ لفظ ان جہازیوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں، چنانچہ اس کی مثالیں عرب سیاحوں اور ملاحوں کی زبانوں میں ملتی ہیں، چنانچہ آج بھی ہندوستانی جہازوں کے ذریعے ہندوستانی زبان، افریقہ، عرب، عراق اور مصر

کے بندرگاہوں تک گئی ہے، اور خود مجھے عدن، جدہ، پورٹ سعید، سقوطرہ اور پورٹ سوڈان میں ہندوستانی بولنے والے ملاح اور دوکاندار ملے۔

اس موقع پر ہمارے سامنے سب سے پہلا بیان ایک ملے جلے ایرانی عرب جہاز راں بزرگ بن شہریار کا ہے، وہ کہتا ہے کہ مجھ سے ایک عرب جہاز راں ابو محمد حسن نے بیان کیا کہ

میں ۲۸۸ھ میں منصورہ (بھکر) میں تھا، وہاں مجھ سے مستند بزرگوں نے یہ بیان کیا کہ الرا اور کے راجہ نے جو ہندوستان کا بڑا راجہ تھا اور جس کی حکومت کشمیر بالا اور کشمیر زیریں کے بیچ میں تھی، اور جس کا نام مہروگ بن رائق (؟) تھا ۲۷۰ھ میں منصورہ کے بادشاہ عبداللہ کو لکھا کہ وہ اسلام کی شریعت کا کچھ حال اس کو بتائے تو عبداللہ نے منصورہ میں ایک عراقی کو پایا جو بہت تیز طبع اور خوش فہم تھا اور شاعر تھا اور جس نے ہندوستانیوں میں نشو و نما پائی تھی اور جو اہل ہند کی مختلف زبانوں سے واقف تھا، اس نے ایک قصیدہ لکھ کر راجہ کو بھیجا، راجہ نے اس کو بلا بھیجا اور اس کے حکم سے اس نے قرآن کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا۔[1]

اس اقتباس سے ظاہر ہوگا کہ ہندوستان کے سواحل میں بھی بہت سی مختلف زبانیں تھیں اور وہ لوگ جن کی اصل زبان فارسی اور عربی تھی وہ یہاں کی زبانوں کو سیکھتے اور بولتے تھے اور ان میں یہ لیاقت رکھتے تھے، کہ وہ ان میں شاعری کرسکتے تھے اور قرآن پاک جیسی کتاب کا ترجمہ کرسکتے تھے۔

یہ ہندوستانی اور اسلامی زبانوں کے باہم اختلاط اور میل جول کے امکان کا پہلا واقعہ ہے جو سفرناموں اور تاریخوں میں مذکور ہے، اس واقعہ کا زمانہ ۲۷۰ھ یعنی

---

[1] عجائب الہند، بزرگ بن شہریار ص ۲-۳، پیرس۔

سنہ ۸۸۳ھ ہے، اور آج سے قریباً ایک ہزار اسی سال پہلے کی بات ہے۔
اس کے ۳۴ برس کے بعد سنہ ۳۳۲ھ میں مسعودی ہندوستان آیا ہے، جو ہندوستان
کا ابتدائی حال اس طرح لکھتا ہے۔

"[1] اس کے بعد ہند کے لوگوں کے خیالات مختلف ہو گئے اور مختلف گروہ پیدا ہو
گئے اور رئیس نے اپنی ریاست الگ کر لی تو سندھ پر ایک راجہ بنا۔ اور قنوج
پر دوسرا راجہ ہوا، اور کشمیر میں تیسرا راجہ تھا اور مانگیر (مانکھیڑ) پر جو بڑا علاقہ ہے (گجرات
و کاٹھیاواڑ) بلہرا (وبھ رائے) کی حکومت ہوئی، اور اب تک ہمارے زمانہ تک
جو سنہ ۳۳۲ھ ہے، راجہ اسی لقب سے ملقب ہے، اور ہند کی زمین بہت وسیع ہے
خشکی، پہاڑ اور دریا میں پھیلی ہے، ان کا ملک ایک طرف زابج (جاوہ) سے ملتا
ہے، جو جزیروں کے بادشاہ "مہراج" کا دارالملکت ہے اور یہ ملک ہندوستان
اور چین کے درمیان حدِ فاصل ہے، لیکن ہندوستان کی طرف منسوب ہے۔
اور دوسری طرف کوہستان سے متصل خراسان اور سندھ اور تبت تک ہے،
اور ان ہندوستانی ریاستوں میں باہم اختلاف اور لڑائیاں ہیں، اور ان کی
زبانیں الگ الگ ہیں اور ان کے مذہبی خیالات مختلف ہیں، زیادہ تر لوگ
تناسخ اور آواگون کے قائل ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے۔"

اس کے بعد یہی سیاح سندھ کے حال میں کہتا ہے۔

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے ...... اور مانگیر (مانکھیڑ)
کی زبان جو بلہرا (وبھ رائے) کا دارالسلطنت ہے اور اس کے ساحلی شہروں جیسے

[1] مروج الذہب مسعودی ج اول ص ۱۶۲ پیرس

چیمور، سوبارہ اور تھانہ (موجودہ بمبئی کے پاس) کی زبان لاری ہے[1]"

یہ سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ اور کوکن کی زبانوں کی نسبت قدیم عربی شہادت ہے، اس کے بعد بغدادی سیاح اصطخری کا زمانہ ہے جو ۳۴۰ھ میں آیا تھا وہ کہتا ہے۔

"منصورہ (موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے[2]"

بعینہٖ یہی الفاظ ابن حوقل کے سفرنامہ میں ملتے ہیں، اس کا زمانہ ۳۳۱ھ سے ۳۵۸ھ تک ہے وہ کہتا ہے:۔

"منصورہ (بھکر) اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے[3]"

۳۷۵ھ میں بشاری مقدسی ہندوستان آتا ہے، وہ ملتان کے حال میں لکھتا ہے،
۹۸۵ء

"اور فارسی زبان بھی سمجھی جاتی ہے[4]"

پھر دیبل یعنی ٹھٹھ کی بندرگاہ کے حال میں لکھتا ہے:۔

"دیبل (ٹھٹھ) سمندر کے ساحل پر ہے اس کے چاروں طرف سو گاؤں کے قریب ہیں، اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہیں، سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر لگتا ہے۔ سب سوداگر ہیں، ان کی زبان سندھی اور عربی ہے[5]"

ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست ۳۷۷ھ میں ترتیب دی ہے سندھ کی زبانوں کی نسبت جس کی وسعت میں اس کے نزدیک ہندوستان بھی داخل ہے، یہ لکھتا ہے،

"یہ لوگ مختلف زبانوں اور مختلف مذہب والے ہیں اور ان کے لکھنے کے کئی خط ہیں۔

لہ ایضاً صفحہ ۳۸۱ ۲ہ سفرنامہ اصطخری صفحہ ۱۷۷، لائیڈن۔ ۳ہ سفرنامہ ابن حوقل صفحہ ۲۲۲ لائیڈن ۴ہ سفرنامہ بشاری معروف بہ احسن التقاسیم صفحہ ۴۸۱ لائیڈن۔ ۵ہ سفرنامہ بشاری صفحہ ۴۷۹۔

ہیں، مجھ سے ایک ایسے شخص نے جو ان کے ایک شہر میں گھوما پھرا تھا، کہا تھا کہ ان کے ہاں دو سو خط کے قریب مستعمل ہیں، میں نے (بغداد کے) قصر حکومت میں ایک بت دیکھا تھا جس کی نسبت مجھ سے کہا گیا کہ یہ بودھ کی صورت ہے،.....

......اس کے نیچے اس طرح لکھا ہوا تھا[1]

اب وہ زمانہ آیا، جب سلطان محمود کا باپ سبکتگین اپنی نئی سلطنت کا پتلا بنا کر کھڑا کر رہا تھا، اب ہندوستان کی بولیوں میں عربی و فارسی کے بعد ترکی کے میل کا وقت آیا، اس وقت پشاور، اور پنجاب اور غزنیں میں صلح اور لڑائی کے تعلقات قائم تھے، آمد و رفت، لڑائی بھڑائی، اور صلح و پیام کے لیے دونوں قوموں کی زبانوں میں اختلاط کا موقع آگیا تھا، اس وقت لڑائیوں کے ہزاروں ہندو قیدی[2] اور نوکری پیشہ ہندو سپاہی افغانستان و ترکستان میں گھر گھر پھیلے تھے، امیر سبکتگین کی فوج میں دوسری قوموں کے ساتھ ہندو بھی داخل تھے۔

"و لشکر خواستن گرفت و بسیار مردم جمع شد، از ہندو خلج و از ہر دستی[3]"

سلطان محمود کے دربار میں ہندی کا ترجمان تلک نام ایک ہندو تھا جو بچپن میں کشمیر پہونچ گیا تھا، اور فارسی سیکھ لی تھی، اور ہندوؤں کے ساتھ نام و پیام اور رسالت کی خدمت اس کے سپرد تھی۔

"و خطے نیکو بہ ہندوی و فارسی و مدتے دراز بکشمیر رفتہ بود و شاگردی کردہ ......

و او را دبیری و ترجمی کردے با ہندوان[4]"

---

[1] کتاب الفہرست مطبوعہ مصر ص۴۸۴، [2] قابوس نامہ (۱۹۵۱ء) باب در سر بندہ خریدن، [3] تاریخ بیہقی ص۲۴۲ و ص۵۰۹ کلکتہ، [4] ایضاً ص۵۰۳۔

ابو الفضل بیہقی اپنی تاریخ آل سبکتگین میں اپنے زمانہ یعنی سلطان مسعود (۴۲۱ھ۔ ۴۳۲ھ) کے عہد میں اسی قسم کے ایک اور ہندوستانی ترجمان بیربل کا ذکر کرتا ہے جس کا تعلق ان کے دفتر انشا سے تھا۔

"ہم چناں بیربل بدیوان ما"[1]

سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے اہل علم تھے، وہاں ہندوستان کے اہل علم بھی شریک بزم رہتے تھے، کالنجر کے راجہ نندا نے ۴۱۳ھ میں جب سلطان کی شان میں ہندی شعر لکھ کر بھیجا، اس موقع پر فرشتہ میں ہے[2]۔

"درزبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد، سلطان آں را بفضلائے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ ہمگی تحسین و آفرین کردند"[3]

یہ وہ زمانہ ہے جب لاہور بھی فتح نہیں ہوا تھا، اس زمانہ میں بھی سلطان کے دربار میں عرب و عجم اور ہند کے فضلاء پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے، اور سب اتنا درخور رکھتے تھے کہ ہندی شعر کو سمجھیں اور مزا لیں۔

غزنوی بادشاہوں کے زمانہ میں جب پنجاب غزنین کا صوبہ تھا ہزاروں لاکھوں مسلمان جن کی زبان فارسی تھی بہ پنجاب میں بس گئے تھے، ظاہر ہے کہ ان میں اور عام اہل ہند میں بول چال اس طرح ہوتی ہوگی کہ وہ ہندی ملی ہوئی فارسی اور یہ فارسی ملی ہوئی ہندی بولتے ہوں، اور چند روز میں یہ کیفیت ہو گئی کہ مسلمان ہندی میں یا فارسی آمیز ہندی میں شاعری کرنے لگے، چنانچہ اس عہد کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان المتوفی ۵۱۵ھ نے جو لاہور میں پیدا ہوا تھا اور لاہور ہی میں رہتا تھا، ایک

۱؎ تاریخ بیہقی ص ۵۰۲، ۲؎ مطبوعہ نولکشور ص ۲۱ جلد ۱، ۳؎ مطبوعہ نولکشور ص ۴۱ جلد ۱۔

دیوان عربی کا ایک فارسی کا اور ایک ہندی کا یادگار چھوڑا۔

ٹیکے بہ تازی دیکھے بہ پارسی دیکھے بہ ہندی" (لباب الالباب عوفی جلد ۲ ص ۲۲۲) جب یہ شوق روز بروز ترقی کرتا گیا یہاں تک کہ ایک ترک خاندان جو دہلی میں رہ پڑا تھا، اس میں امیر خسرو (المتوفی ۷۲۵ھ) جیسا ہمہ داں شاعر پیدا ہوا، جس نے عربی فارسی ہندی میں علیحدہ علیحدہ بھی اور تینوں زبانوں کے مصرعوں یا لفظوں کو ملا کر بھی شاعری کی، چنانچہ انھوں نے خود اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ میں اس پر فخر کیا ہے۔

امیر خسرو نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیوں کے نام لیے ہیں، سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی (گوڑ بنگالہ کا ایک حصہ) گجراتی، تلنگی، معبری، کرناٹکی جس کو کنڑی کہتے ہیں، دھور سمندری (دھور سمندر کرناٹک کا پایۂ تخت تھا جو اس زمانہ میں نیا فتح ہوا تھا) اودھی، اور دہلوی۔

جو زبانیں تھوڑے سے فرق سے اب بھی موجود ہیں، امیر خسرو سے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانہ میں بھی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں یہی بولیاں رائج تھیں، ابوالفضل ہندوستان کی مستقل زبانوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے[1]۔

دہلوی، بنگالی، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، تلنگی، مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی شالی، (جو سندھ، کابل اور قندھار کے بیچ میں ہے) بلوچستانی اور کشمیری۔

اوپر کے اقتباسات سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس ملک میں ہر علاقہ میں صوبہ وار بولیاں بولی جاتی تھیں، اور ان میں کوئی ایک عام اور مشترک بولی نہ تھی، اور دوسری یہ کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قدرتی طور سے ایک زبان تیار ہو رہی تھی۔

---

[1] مطبوعہ نولکشور ص ۱۳ جلد ۱،

ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے چھ سو برس قیام کے بعد بھی ملک میں زبانوں کے اختلاف کا یہی حال رہا کہ ایک صوبہ کا رہنے والا، دوسرے صوبہ کے رہنے والے سے بات چیت اور کاروبار کرنے سے عاجز تھا۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا ملک جس میں کم از کم تیرہ مستقل زبانیں بولی جاتی ہوں اس کو ایک مملکت، ایک حکومت اور ایک ملک کیونکر قرار دیا جا سکتا تھا، اور ایسی مختلف بولیوں اور زبانوں والے ملک کے انتظام اور کاروبار کے لیے ایک متحدہ مشترکہ زبان کی کتنی سخت ضرورت تھی، یہی بات تھی جس نے اس ملک میں ایک نئی بھاشا کو پیدا کیا، اور اس کو ترقی دی۔

اسلامی عہد کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان سندھ گجرات، اودھ، دکن، پنجاب، اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی، جن میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل سندھی، گجراتی، دکھنی اور ہندی ہیں، جن صوبوں کی بولیوں کو الگ وجود نہیں بخشا گیا ان میں بھی یہ اب تک ماننا پڑتا ہے کہ ان کی دو قسمیں ہیں، ایک مسلمانی اور ایک خالص دیسی، چنانچہ بنگالی، مرہٹی، کنڑی، تلنگی، ملیالم، ہر ایک میں مسلمانی بولی خالص بولی سے الگ ہے، مسلمانی بنگالی، مسلمانی مرہٹی، مسلمانی تلنگی، خالص بنگالی، خالص مرہٹی اور خالص تلنگی سے الگ اور ممتاز ہے یہ امتیاز بھی ہے کہ مسلمان ان صوبہ وار بولیوں میں عربی و فارسی لفظوں کو ملا کر بولتے ہیں اور ان صوبوں کے اصل باشندے اُن کو خالص اور بے میل بولتے ہیں۔

اب صورت یہ ہوئی کہ ہر صوبہ کی مقامی بولیوں میں مسلمانوں کی زبان کے الفاظ کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی، مسلمانوں اور ہندوؤں کا یہ میل جول جیسا کہ پہلے کہا گیا

سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھہ تک سندھ میں اور پھر یہاں سے گجرات اور کاٹھیاواڑ تک ہوا ہوگا، اس میل جول سے جو زبان بنی اس کا پہلا نمونہ ہم کو سنہ ۷۶۲ھ میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سندھ میں ملتا ہے، سنہ مذکور میں سلطان ٹھٹھہ پر ناکام حملہ کر کے جب گجرات جاتا ہے تو ٹھٹھہ والوں نے اس کو اپنے شیخ کی کرامت سمجھ کر کہا۔

"برکت شیخ ٹھیا، اک موا، اک تہا"

یعنی یہ شیخ کی برکت تھی کہ ایک حملہ آور (سلطان محمد شاہ تغلق جس نے سنہ ۷۵۲ھ میں حملہ کیا تھا) مر گیا، اور دوسرا سلطان فیروز شاہ تغلق ناکام رہا۔

عبارت سے یہ اخذ ہے کہ زمانہ سنہ ۷۶۲ھ میں عربی، فارسی اور ہندوستانی بولیوں کا مجموعہ جس کو آج آپ اُردو کہتے ہیں پیدا ہو چکا تھا، ان واقعات سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زبان کی پیدائش کی وجہ مختلف قوموں کا کاروباری اور تجارتی اختلاط اور میل جول تھا اور اسی ضرورت نے اس نئی زبان کو جنم دیا تھا، اس زبان کی پیدائش کی یہ وجہ اگر نہ سہی تو اس کے قیام، بقا اور ترقی کی وجہ اس سے بھی بڑھ کر نا گزیر تھی اور وہ یہ کہ مسلمان جب اس پورے ملک پر حکمراں ہوئے تو گو فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے ان کے ساتھ آئی تاہم ایک ایسی قوم کے لیے جس کا تعلق پورے ملک سے ہو، اس ملک میں کوئی ایک بھی متحدہ اور مشترکہ زبان موجود نہ تھی، لکھے پڑھے تو خیر آج کی انگریزی کی طرح کل کی فارسی سے کام چلا لیتے تھے، مگر ان پڑھ نا خواندہ اور عوام کے لیے ایک ایسی زبان کی سخت ضرورت تھی جو پورے ملک کی بول چال، آمد و رفت اور کاروبار میں کار آمد ہو، اور بعینہٖ یہی ضرورت آج بھی موجود ہے۔

اُردو نام زبان اردو کی تاریخ کے متعلق میر امن اور سرسید اور دوسرے پرانے بزرگوں نے

جو بیان سنایا تھا وہ اب پارینہ سمجھا جاتا ہے، اور اب دکنی مضمون پر جیسی اچھی تحقیقانہ کتابیں لکھی گئی ہیں جن سے اس زبان کی تاریخ کا دشوار گذار راستہ بہت کچھ صاف ہو گیا ہے اور اب اس کے وجود کا سراغ بہت دور تک لگایا جا چکا ہے اور آج سے پانچسو برس پہلے کے فقرے جمع کئے گئے ہیں اور تیموری بادشاہوں سے بہت پہلے کی نظم و نثر کی کتابیں مہیا کی گئی ہیں، اور اب چہار درویش کے مصنف میر امن کے اس بیان کو لوگ صرف بزرگوں کی کہانی سمجھتے ہیں۔

در حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کی زبان سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے، ان ہی کے راجہ پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے، ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے، اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمانوں کی آمیزش پائی، آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے ہندوستان کو لیا، ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا ...... جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں جمع ہوئے، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان مقرر ہوئی۔

جب حضرت شاہجہاں صاحبقراں نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا ...... تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا اگرچہ دلی جدی ہے اور وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے، اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلّی خطاب دیا تھا

ان چند سطروں میں اردو کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے وہ زمانہ اور اشخاص کے ناموں کو چھوڑ کر سر تا پا حقیقت ہے، یعنی یہ کہ موجودہ معیاری اردو دہلوی زبان وہ دوسری زبانوں سے نکلی ہے، آجکل بعض فاضلوں نے "پنجاب میں اردو" اور بعض اہل دکن نے "دکن میں اردو" اور بعض گجراتیوں نے "گجرات میں اردو" کا نعرہ بلند کیا ہے، لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر علاقے/صوبے کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے ان سب کا نام "اردو" رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ ان کا نام پنجابی، دکنی یا گجراتی اور گوجری وغیرہ رکھنا چاہیے، جیسا کہ اس عہد کے لوگوں نے رکھا ہے، یہ تغیرات جیسے ملتان و بنگال میں ہو رہے تھے تو خود پایۂ تخت دہلی میں تو اور زیادہ ہوتے۔

امیر خسرو اور ابوالفضل دونوں نے دہلوی زبان کا الگ نام لیا ہے، عہد شاہجہانی میں جب یہاں اردوئے معلّٰی بنا تو اُسی زبانِ دہلی کا نام زبانِ اردوئے معلّٰی پڑ گیا، چنانچہ لفظ اردو زبان کے معنی میں دہلی کے علاوہ کسی صوبے کی زبان پر اطلاق نہیں پایا ہے، میر تقی میر کی تحریروں میں جب اس کا نام پہلی دفعہ آیا ہے، تو اصطلاح کے طور پر نہیں بلکہ لغت کے طور پر آیا ہے، یعنی میر نے "اردو زبان" نہیں کہا، بلکہ "اردو کی زبان" کہا ہے۔

"ریختہ کہ شعر ست بطور شعر فارسی بزبان اردوئے معلّٰی بادشاہ ہندوستان" (ذکر میر)

بادشاہ ہندوستان کے کیمپ یا پایۂ تخت کی زبان"

اس کے بعد عام استعمال میں زبان اردو کے بجائے خود زبان کا نام اردو پڑ گیا، اور پھر یہ اردو کے معنی سے نکل کر ملک میں ہر جگہ اسی اصول پر پھیل گئی جس اصول پر ہندوستان میں ہمیشہ راجدھانی کی بولی تمام حدودِ سلطنت میں پھیلتی رہی ہے۔

اس زبان کی اصلیت کیا ہے؟ ہم نے پچھلی سطروں میں اس کو بار بار "نئی زبان" کہا ہے مگر کیا حقیقت میں اس کو نئی زبان کہنا چاہیے؟ ہم جس کو آج زبان اردوئے معلّٰی کہتے ہیں، حقیقت میں وہ دہلی اور اطراف دہلی کی وہ پرانی بولی ہے، جو وہاں پہلے سے بولی جا رہی تھی، اور جس میں زمانہ کے قاعدے کے مطابق انقلاب آتا رہتا تھا اور خراد پر ہو کر لفظوں کی مناسب صورت بن گئی۔

ہر زبان تین قسم کے لفظوں سے بنتی ہے، اسم، فعل اور حرف، اس بولی میں جس کو اب اردو کہنے لگے ہیں، فعل جتنے ہیں وہ ٹھیٹ ہندی کے ہیں، حرف جتنے ہیں ایک دو کو چھوڑ کر وہ ہندی کے ہیں۔ البتہ اسم میں آدھے اپنے ہندی کے اور آدھے عربی فارسی اور ترکی کے لفظ ہیں، اور بعد کو کچھ پرتگالی اور انگریزی کے وہ لفظ مل گئے ہیں، جن کے معنی ان باہر کے ملکوں سے آئے ہیں، جیسے نیلام، پاؤ (روٹی)، پادری، الماری وغیرہ۔

اس لیے اردو اور ہندی دونوں ٹھیٹ ہندی ہیں، صرف دو فرق ہیں، ٹھیٹ ہندی تو اپنی جگہ پر رک گئی، لیکن اسی ہندی نے اس وقت کے نئے ضروریات کے بہت سے عربی، فارسی اور ترکی کے وہ الفاظ لے لیے، جن کے معنی اور مسمّی ان ملکوں سے آئے تھے۔ دوسرا فرق یہ پیدا ہوا کہ وہ ہندی اپنے خط میں اور یہ اردو فارسی خط میں لکھی جانے لگی۔

رفتہ رفتہ ایک اور فرق بھی پیدا ہوا کہ پرانی ہندی کے بہت سے لفظ جو زبان پہ بھاری اور ثقیل تھے زمانہ اور زبان کی فطری ترقی کے اصول کے مطابق ان میں ہلکا پن، خوبصورتی اور خوش آوازی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اسی طرح عربی اور فارسی اور ترکی کے لفظوں میں بھی اپنی طبیعت کے مطابق اس نے تبدیلیاں پیدا کیں۔

اردو نے ہندی کے لفظوں میں اس قسم کا جو تغیر کیا ہے اس کی چند مثالیں یہ ہیں۔

ہندی	اردو	ہندی	اردو
گگن	گگن	ویشاکھ	بیساکھ
براہمنڑ	برہمن	وچار	بچار
راونڑ	راون	گنشتری	گنتری
وواہ	بیاہ	پکش	پاکھ (جیسے بھادوں ماس)
بشٹھ	بیٹھ	میگھ	مینھ
ورش	برس (سال)	ورشا رتو	برسات
پرنتو	پر (مگر)	وارتا	بات
اوچت	اچھا	ہستی	ہاتھی
سمبندھی	سمدھی	پاد	پاؤں
جیو	جی	دگدھ	دودھ یا دودھ
سنگتی	سنگت	[illegible]	[illegible]
رکھشا	رکھ	ناش	ناس (خرابی)
پونچھا	پہنچا	اگنی	آگ
کنتو	کیمل کہ	پوران	پرانا
مائی	مالی	مورتی	صورت
سمے	سماں	ستیہ یا سانچ	سچ
دیش	دیس	کٹمب	کنبہ (خاندان)
لکشن	لچھن	اشٹ	آٹھ

ہندی	اردو	ہندی	اردو
پانیں	پانی	گھرت	گھی
دودھ سے	دہی	بھنن بھنن	بھانت بھانت

اب چونکہ پورا ملک ایک تھا اور ہمیشہ آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ اس لیے اس دہلوی ہندی میں سیکڑوں لفظ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی بولیوں سے آکر رفتہ رفتہ شامل مل گئے خصوصاً پنجابی اور دکھنی لفظوں کی آمیزش زیادہ ہوئی۔

کہیں یہ ہوا ہے کہ فارسی اور ہندی دونوں کے ہم معنی لفظوں کو ایک جگہ کر کے بولنا شروع کیا تاکہ دونوں زبانوں کے الگ الگ جاننے والے ایک لفظ سے دوسرے لفظ کے معنی کو سمجھ لیں، جیسے دھن دولت، رنگ روپ، رنگ ڈھنگ، خاک دھول، کاغذ پتر، موٹا تازہ، ہنسی ذلق، ہنسی خوشی، رہنا اور ہنسا، رشتہ ناطہ، طرح طرح، رعب داب، دکھ درد، صاف ستھرا، ہیٹ ہتم، کبھی فارسی لفظوں کو ہندی کا اپنا بنا کر دیتے ہیں جیسے جی بیتن جیسی مزدور، لونڈی باندی (زبانِ ہندی میں بہت سے عربی الفاظ ہیں)۔

ان دونوں کو دو زبانوں کی جگہ ایک بنا ڈالنے کے لیے یہ ہوا ہے کہ دونوں کے لکھنے والے اپنی اپنی جگہ پر چند اصول ایسے ایک ساتھ بنائیں جن کو دونوں برتا جائیں۔

(معارف جولائی ۱۹۳۲ء)

بہار کے نوجوان
اور
ادب کی خدمت

اگر کوئی پوچھے کہ صوبہ بہار کی مادری زبان کیا ہے؟ تو جواب ہر طرف سے یہی ملے گا کہ ہندوستانی۔ جس کو عام طور سے اردو کہا جاتا ہے، اس زبان کے عروج کا جو زمانہ دلّی اور لکھنؤ میں تھا بعینہ وہی صوبۂ بہار میں تھا اور یہ بات اہل ادب میں بے تامل مانی جاتی ہے کہ دلّی اور لکھنؤ کے بعد اس زبان کا تیسرا مرکز عظیم آباد پٹنہ تھا، جو صاحبِ کمال بھی اپنے گھر سے بے گھر ہوا، اور اجڑی دلّی کو چھوڑ کر نکلا، اس نے پہلے لکھنؤ میں قسمت آزمائی کی۔ اگر بخت نے یہاں یاوری نہ کی تو پورب کی سمت اور بڑھا، اور عظیم آباد پہنچ کر دم لیا، اگر یہاں کی آب و ہوا بھی اس کو راس نہ آئی تو بنگال میں مرشد آباد کی طرف نکل گیا۔

اس رسالہ کے کسی پچھلے سالانہ نمبر میں، میں نے حضرت مخدوم شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سے وہ چند فقرے لکھے تھے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دوسرے صوبوں کے قدیم بزرگوں کے دہن مبارک سے اس بولی کے چند فقرے نکلے ہیں، اس صوبے کے بزرگ بھی اس کو بولتے اور سمجھتے تھے، اس کے بعد جیوں جیوں یہ بولی ترقی کر کے زبان بنتی گئی، اس کی اس ترقی میں یہ قطعہ ہند بھی اپنی بساط بھر حصہ لیتا رہا، اور یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک نئی حکومت نے اس صوبہ کو بنگال میں ملا کر

اس کی مستقل حیثیت کو مٹا نہ دیا، اور بہار کے تمام دفتروں اور صیغوں میں بنگالیوں کا تقرر عمل میں نہ آیا، جو ہندوستانی کے ایک حرف سے آشنا نہ تھے، ساتھ ہی صوبہ میں ہندوستانی کے ساتھ بنگالی اور اوڑیا دو اور زبانیں بھی شریک ہوئیں۔

اس درخت پر دوسری کلہاڑی اس صوبہ کے ایک مشہور گورنر نے ماری جب ملک کی متحدہ زبان کے رسم خط کو اردو اور ہندی کے دو حصوں میں بانٹ کر ملکی اتحاد کی رگ کے آخری قطرہ کو بھی بہا دیا، ۱۸۶۶ء میں بہار بنگال کی گورنمنٹ نے ہندی کو دفتروں کا خط قرار دیا اور اسی اثنا میں یہاں بنگال کی ہمسائیگی کے اثر سے انگریزی تعلیم کو روز افزوں ترقی ہوتی گئی، تو اس زبان پر اس صوبہ میں مردنی چھا گئی۔ عدالتوں اور دفتروں کی ضرورت سے کون آزاد ہے، ہندی رسم خط نے عوام میں ہندوستانی رسم خط کی جگہ لینی شروع کی اور خواص میں جو دن پر دن انگریزی تعلیم پر ٹوٹے جاتے تھے، دیسی زبان کی وقعت گھٹتی چلی گئی یہاں تک کہ دوستوں میں خط وکتابت، گھروں میں بات چیت، جلسوں میں تقریر وتحریر سب انگریزی میں کی جانے لگی، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دیسی زبان میں بولنا اپنی ذلت اور بے توقیری کا مرادف تھا۔

یہ کیفیت قریب قریب پچاس ساٹھ برس رہی، اس طویل عرصہ میں بزرگوں کی ادبی دولت برباد ہو گئی۔ اپنی زبان کی خدمت کا ولولہ جاتا رہا، صحیح زبان بولنے اور لکھنے کی دھن نہ رہی، انگریزی اسکولوں میں جو مدرس اور ماسٹر پڑھاتے تھے، ان میں بڑا حصہ بنگالیوں کا تھا، وہ جیسی ہندوستانی بولتے تھے، اسی کے قریب قریب ان کے شاگرد بھی بولنے لگے، اگر اس عہد میں قاضی رضا حسین صاحب رئیس عظیم آباد اور ان کے ہم نشین اہل علم وادب کا مختصر سا گروہ پٹنہ میں نہ ہوتا تو یہ رہی سہی یادگار بھی ملیامیٹ ہو جاتی۔

قاضی صاحب کی ادب آفرین، اور علم آموز صحبتوں میں جو نوجوان آ آ کر شریک ہوئے اس پورے پچاس برس کے زمانہ میں دہی، اسلاف کی اس یادگار کو اپنے سینے سے لگائے رہے، اس گروہ میں شہر عظیم آباد کے علاوہ اس کے قصبات کے نوجوان شرفا بھی برابر کے شریک تھے، ظہیر احسن شوق نیموی، عبد الغفور شہباز، عبد الغنی وارثی، سید رحیم الدین، حافظ فضل حق آزاد، حافظ محب الحق وغیرہ دیہات اور قصبوں کی پیداوار تھے، اور شہر کے باشندوں میں سے دو نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، قاآنی ہند حکیم عبد الحمید صاحب مرحوم اور حضرت شاد، ایک اور نام ذکر کے قابل ہے، وہ مولوی اعظم صاحب کا ہے جو اپنے وقت کے انشاپرداز تھے، اپنے چھوٹے چچا مرحوم مولوی ابو یوسف صاحب کے ساتھ ان کی سر راہ زیارت پٹنہ میں ہوئی، لمبا قد، گداز بدن، چہرہ پہ بھری داڑھی، میرے چچا نے مجھ سے فرمایا کہ صورۃ الخیال معروف بہ ولایتی بیگم کے مشہور افسانہ کے اصلی مصنف یہی ہیں، چچا مرحوم بھی اسی آغوش صحبت کے پروردہ اور اسی گروہ کے ہمنشین تھے، اسی لئے اس بارہ میں ان کا بیان وثوق کے قابل ہوگا۔

دوسرا نام منشی محمد صاحب حسنین کا ہے، یہ بھی دیہات کے باشندہ اور اسی خوش نثر پریس کے ایک دانہ تھے، اپنے زمانہ میں خوب پھلے پھولے اور کلکتہ جا کر وہاں کے مشہور اخبار اردو گائیڈ وغیرہ کے مدتوں ایڈیٹر رہے، چچا مرحوم بھی اور ان میں برادرانہ محبت تھی۔ ان ہی کے ساتھ ایک دو دفعہ ان سے ملاقاتیں ہوئیں، دبلے پتلے سے تھے، لمبا قد تھا، سیاہ ایرانی ٹوپی پہنتے تھے۔

یہ چند نام بر سبیل تذکرہ اس لئے آگئے، کہ شاید آجکل کے ہمارے نوجوان ادیبوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے نام پڑ جائیں اور صوبہ کی ادبی ترقیوں کے سلسلہ میں ان کے

کارناموں کو فراموش نہ کریں۔

یہ تو نافل کا زمانہ رفتہ رفتہ رخصت ہوا، اور اب چند سال سے نظر آرہا ہے کہ خود اُردو کے گھرانے میں ابراہیم پیدا ہو رہے ہیں، یعنی انگریزی اسکولوں اور کالجوں ہی جن کے ہاتھوں سے ہندوستانی ادب کا قتل عام ہوا تھا اب ایسے مسیحا دم پیدا ہو رہے ہیں جنکی مخلصانہ کوششوں سے اس تن مردہ میں نئی جان پڑنے کی اُمید بندھ رہی ہے، نئی تعلیم کے تیز تند جھونکوں نے ہماری ملکی ادب کی جن شمعوں کو گُل کیا تھا۔ اب ان کی جگہ بتی قندیلوں نے لے لی ہے، جن کو اب زمانہ کا طوفان حوادث گُل کرنے کے بجائے خدا نے چاہا تو اور زیادہ تیز کرتا جائے گا۔

یہ پورا انقلاب میری آنکھوں کے سامنے گذرا ہے، حالات کی تبدیلی میں سب سے بڑا ہاتھ ملک کے پچھلے سیاسی انقلاب کا ہے، بنگال کی شورش کے اثر سے ۱۹۱۱ء میں بہار کو بنگال سے علیحدہ کیا گیا، اس علیحدگی سے بنگال کا اثر اس صوبہ سے آہستہ آہستہ کم ہونے لگا اور خود صوبہ کو اپنی اپنی خود مختاری کا فرمان ملا، سر علی امام مرحوم کا یہ احسان وطن کی گردن پر ہمیشہ رہے گا، یہ خود مختاری ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس کے بعد ہی دنیا کے سیاسی انقلابات اور اسلامی دنیا کے تیز تیز تغیرات نے یورپ کی طرف سے نفرت اور قومیت اور وطن کی محبت پیدا کی، اس نے ہندوستانیوں کے دلوں سے انگریزیت کا رعب اٹھادیا اور بتادیا کہ بھیڑ، شیر کی کھال اوڑھ کر شیر نہیں بن سکتی۔ نہ انگریزوں کی نقالی ہندوستانیوں کو انگریز بنا سکتی ہے، اس تحریک کی آندھی نے بدیسی چیزوں کے ساتھ بدیسی زبان و ادب کے بڑے پن کا بھی خاتمہ کر دیا، اور دیسی زبان کی ترقی کا میابی روز بروز بڑھنے لگا، ملک کی بڑی بڑی سیاسی مجلسوں میں جہاں انگریزی کے سوا ہر زبان ناقابل فہم تھی، انگریزی

اس طرح شہر بدر کی گئی کہ انگریزی بتوں کے بڑے پرستاروں کو بھی ہندی اور ہندوستانی میں بولنے سے چارہ نہ رہا۔

کانگریس، خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں میں ہر صوبہ کے نمائندوں کو ہفتہ ہفتہ اور مہینہ مہینہ سمٹ کر ہندوستان کے مختلف گوشوں میں جمع ہونا پڑتا اور دوسروں کی تقریریں سننی اور اپنی سنانی پڑتیں، ہر صوبہ میں کانگریس و خلافت کی شاخوں میں کارکنوں کے اجتماع اور جلسوں میں مجبوری یا شوق سے ایک ایک کو تقریریں کرنی پڑیں، جن میں غلطیوں پر ہنسی اڑائی جاتی تھی، اس لئے مقرروں کو اپنی بول چال اور تقریروں میں احتیاط کی پوری کوشش کرنی پڑتی تھی، اسی تحریک کے اثر سے یہاں اخبارات نے جنم لیا، اور اسی کے پیٹ سے رسالوں کی ولادت بھی عمل میں آئی۔

اس طوفان کا دائرہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، اور اُن تک بھی پہنچ گیا جو اس باد سموم سے پوری حفاظت کے ساتھ بچا کر رکھے گئے تھے، یعنی انگریزی اسکول اور کالج، اب انگریزی خط و کتابت، اور تقریر و تحریر، امتیاز کا نشان اور غرور کا سامان نہیں رہی اور لوگ اپنی دیسی زبان سے محبت کرنا سیکھنے لگے، مادری زبان کی تعلیم کا مطالبہ روز افزوں ہوا، اور یونیورسٹیوں کو بھی اس سخت مطالبہ کے آگے جھکنا پڑا، بلکہ خود صوبہ کی گورنمنٹ کو بھی، بعض کمشنریوں میں ہندوستانی رسم خط کو اس کی جگہ دینی پڑی، یہ معمولی سی مثال اس اصولِ فطرت کی ہے کہ ڈھونڈو تو پاؤ گے اور کھٹکھٹاؤ تو کھولا جائے گا" ضرورت ہے کہ ہم اس اصول کو بار بار آزمائیں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک ہندوستانی زبان اس ملک کی عام زبان اصولاً اور عملاً تسلیم نہ کر لی جائے، اب یہ صوبہ اور خاص ہو رہا ہے اور اونٹ کی گردن سے بلی کھولی جا رہی ہے، یعنی اڈیشہ بہار سے الگ ہو رہا ہے، اور اب

اس صوبہ میں صرف ایک زبان جس کا نام "ہندوستانی" ہے، باقی رہ گئی ہے۔

اب توقع ہے کہ اس صوبہ کے باشندے یہ مطالبہ کریں کہ چونکہ اب اس صوبہ کی زبان خاص "ہندوستانی" ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ حکومت اب اس کی تعلیم و اشاعت پر خاطر خواہ توجہ مبذول کرے۔

اس سلسلہ میں ہم کو غور کرنا ہے کہ اس کو صوبہ کی عام اور مقبول زبان بنانے کے لئے کیا کیا تدبیریں عمل میں لائی جائیں، سردست حسب ذیل صورتیں ذہن میں آتی ہیں۔

۱۔ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے مکتبوں اور پاٹ شالوں میں اس کو مناسب جگہ دی جائے اور اسلامی مکتب گاؤں گاؤں کھولے جائیں، اور اس کے لئے دیہاتی قصبوں کے مسلمان خاص کوشش کریں۔

۲۔ اسکولوں میں اس کی تعلیم باقاعدہ ہو، اور اس کے لئے اچھے معلم بہم پہنچائے جائیں یعنی جو لکھ سکیں اور بول سکیں۔

کیا یہ شکوہ آپ کو افسوس نہ ہوگا کہ پورے صوبہ میں انٹرنس کے امتحان میں ہندوستانی کی ... جوابی کاپیاں بھی مشکل سے ہوں گی۔

۳۔ یونیورسٹی نے اردو کا اعلیٰ امتحان کھولا ہے، مگر اب تک اس کا معیار تعلیم بلند نہیں، یونیورسٹی کو مجبور کرنا چاہیئے کہ اس کے لئے لائق پروفیسر مقرر کئے جائیں۔

۴۔ یونیورسٹی اور گورنمنٹ کو مجبور کرنا چاہیئے کہ اس زبان کی بہترین کتابوں پر سالانہ انعام دیں۔

۵۔ وکیلوں اور مقدمہ بازوں کو چاہیئے کہ ہندوستانی کے فارموں کو استعمال کریں اور اسی زبان و خط میں تحریریں داخل کریں۔

۶۔ صوبہ کے مشہور شہروں اور قصبوں میں اس زبان کے کتب خانے اور قرأت خانے (ریڈنگ روم) بکثرت قائم کئے جائیں۔

۷۔ ہر جگہ اخباروں اور رسالوں کے پڑھنے کے لئے چندہ سے دار المطالعہ کھولے جائیں۔

۸۔ مدرسوں، اسکولوں اور کالجوں میں ہندوستانی زبان کی علمی و ادبی مجلسیں بنائی جائیں جن میں طالبِ علم ہندوستانی میں تحریریں لکھ کر سنائیں یا تقریریں کریں۔

۹۔ ہر سال صوبہ کے طالب علموں کا ایک مقابلہ کا جلسہ ہو، جس میں اس زبان کے سب سے اچھے بولنے والے کو انعام دیا جائے۔

۱۰۔ صوبہ کی عام زبان میں جن غلطیوں کا علانیہ ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان کی تصحیح کی جائے، اور اس پر رسالے لکھے جائیں اور طالب علموں میں تقسیم کئے جائیں۔

۱۱۔ صوبہ میں اعلیٰ تصنیف و تالیف کے لئے خواہ دارالمصنفین کے طور پر یا ہندوستانی اکاڈیمی کے اصول پر ایک ادبی ادارہ قائم کیا جائے۔

۱۲۔ ڈاک خانہ کے ہندوستانی فارم خصوصیت سے استعمال کئے جائیں۔ اسی طرح کچہریوں کے وہی فارم لئے جائیں، جو ہندوستانی میں ہوں۔

اس اظہار میں ہم کو خوشی ہے کہ پچھلے پندرہ بیس برس کے عرصہ میں ہندوستانی نے اس صوبہ میں گو کمیت کے لحاظ سے نہیں مگر کیفیت کے لحاظ سے خوش آیند ترقی کی ہے غلطیاں کم ہو رہی ہیں، لہجہ بدل رہا ہے، نوجوانوں میں مضمون نگاری، شعر و سخن اور تقریر و خطابت کا چرچا ہے، قافلہ جب رختِ سفر باندھ کر صبح کو روانہ ہو تو وہی وقت ہے کہ وہ اچھی طرح دیکھ لے کہ جس راہ پر وہ قدم رکھ رہا ہے وہ منزلِ مقصود تک سیدھی جاتی ہے، یا نہیں اس وقت ہمارے کاروانِ ادب کے لئے وہی وقت ہے۔

زبان کی صحت | سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہر قدم پر زبان کی صحت پر نظر رہے ۔ اس کے لئے خاص کاوش کی جائے ، اور تذکیر و تانیث اور صحیح روزمرہ کا دھیان رہے اور بعض دوسرے صوبوں کی طرح اپنی غلطیوں پر ہٹ دھرمی نہ کی جائے ، اس میں شک نہیں کہ ہمارے یہاں قدما کے بہت سے پرانے لفظ بولے جاتے ہیں ، جو اب متروک ہیں اور ان میں لکھنؤ اور دہلی کی تقلید چنداں ضروری نہیں ، لیکن ہمارے ہاں اصلی غلطی یہ ہے جو زیادہ تر دیہاتوں میں ہے کہ کسی ایک لفظ کی تذکیر و تانیث یکساں نہیں رہنے پاتی ، ایک ہی فقرہ میں ایک لفظ ابھی مذکر استعمال ہوا تھا ابھی مؤنث ہو گیا ، اگر پابندی کے ساتھ ایک لفظ کو مذکر یا مؤنث ہمیشہ یکساں بولا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس دیار کی زبان میں یہ لفظ مذکر یا مؤنث ہے ۔ جیسا کہ دلی اور لکھنؤ میں بہت سے لفظوں کی تذکیر و تانیث میں اختلافات ہیں ، اور یہ زبان کا عیب نہیں ۔

شعر و سخن | شعر و سخن کا عصر جدید ہمارے صوبہ میں بھی پیدا ہو گیا ہے ، اور بعض اچھے اچھے شاعر اس میدان میں کمال کا جوہر دکھا رہے ہیں ، ہمارا بوڑھا لیکن ہمہ دان شاعر فضل حق آزاد ہمارے صوبہ میں اس عہد جدید کا بانی ہے ، معاصرین میں تمنا پھلواروی ، فنون سخنوری میں کامل ہیں ، ڈاکٹر عظیم الدین کا تخیل بڑی رفعت رکھتا ہے ، نجم گیلانی اگر توجہ کرتے تو شاعری کے آسمان میں ستارہ ہو کر چمکتے ، رسا ہمدانی نے بھی طبع رسا پائی ہے ، خود ہمارے دوست و رفیق درس انجم صاحب کسی سے کم نہیں ، مگر کاروباری طبیعت نے ان کی شاعری کو بھی کاروباری بنا دیا ہے ، یعنی مجبور ہوں گے تو کہیں گے ورنہ نہیں ، نوجوانوں میں رضی عظیم آبادی ، صبا رشیدی ، نجم ندوی وغیرہ اُبھر رہے ہیں ، مقصود ناموں کا گنانا نہیں ، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ طبیعتیں آمادۂ ترقی ہیں ، رضی صاحب کو اگر خدا نے موقع دیا

تو وہ شاعر فطرت ہوں گے۔

ضرورت یہ ہے کہ ہمارے نوجوان شعراء ان بے راہیوں سے بچیں جن میں اس عہد کے دوسرے صوبوں کے نوجوان شعراء مبتلا ہیں، ایک یہ کہ کلام کی اشاعت میں جلد بازی اور عجلت سے پرہیز کریں اور بار بار کی نظر سے جب تک صحت لفظی و معنوی کا یقین نہ ہو جائے اس کو منظر عام میں پیش نہ کریں، ہو سکے تو پرانے عہد کے ممتاز شعراء سے اصول فن کے نکتے سیکھیں، فن سے جہالت نوجوانوں کی عادت بن رہی ہے، سستی اور عریاں جذبات کے اظہار میں شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

فارسی ترکیبوں کا استعمال اعتدال کی حد سے زیادہ نہ ہو، پھر یہ لحاظ رہے کہ جو نئی ترکیبیں پیدا کی جائیں وہ فارسی کے محاوروں کے مطابق صحیح بھی ہوں۔ آجکل کے نوجوان شعراء جو لفظی شاعری و شکوہ کے طالب ہیں، فارسی کا صحیح علم نہ رکھنے کے سبب سے ایسی ترکیبیں ایجاد کرتے ہیں جن کو سنکر علم و دانش کے لبوں پہ مسکراہٹ آجاتی ہے۔

خوشی ہے کہ صوبہ میں مضمون نگاروں کی تعداد کم نہیں، مگر یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ ان کی تعداد اسی وبائے عام میں مبتلا ہے، جس میں دوسرے صوبوں کے نوجوان اہل قلم مبتلا ہیں، سطحی باتیں، پست خیالات، تفریحی مشاغل، بیہودہ مباحث، نصب العین سے دور "ادب لطیف،، سے بیزار اور ادب عالی سے معرّا، سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہمارے کچھ بنیادی اور اصولی خیالات ہوں جن کو مجرد اور دلچسپ پیرایوں میں، معلومات سے مدلل اور نتائج سے پر مضمون کر کے پیش کیا کریں، ہر تحریر سبق آموز، اور ہر بیان دماغ افروز ہو، جس کے پڑھنے سے ناظرین کے علم میں اضافہ، دانش میں ترقی اور خیال میں وسعت پیدا ہو۔ صوبہ میں اس حیثیت سے پروفیسر محفوظ الحق، پروفیسر نجیب اشرف، ڈپٹی ولی الحق

وغیرہ ہر حیثیت سے معتنم ہستیاں ہیں اور ان سے مستقبل کو بڑے بڑے توقعات ہیں، عبدالملک صاحب آروی بھی اس فہرست میں ہیں بشرطیکہ ان کو ان کے حوصلہ کے مطابق مناسب فضا مل سکے، نوجوان علماء میں سید محمد اشرف (ابھو گیا) مسعود عالم ندوی اور محمد ناظم ندوی اور دوسرے ندوی عزیز مستقبل میں چمکیں گے۔

لیکن نظر آتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں دوسرے صوبوں کے ان شاعروں اور نثاروں کی تقلید کا عیب پیدا ہو رہا ہے، جن کو عوام کے طبقہ سے واہ واہ کی داد یں ملتی ہیں، ہمارے شاعران گویئے شاعروں کی تقلید میں گم ہو رہے ہیں جو جگہ جگہ گا گا کر اپنے نام و نمود کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ خوش سلیقی کے وجہ سے اپنے کلام کا عیب دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دیں، ہمارے نثاران بے مغز نثر نویسوں کی نقالی میں لگے ہیں، جن کی تحریریں نوجوانوں کی محفل میں شور تحسین برپا کرتی ہیں، زندگی اور زندگی کے مشکلات واقعہ ہیں۔ ان واقعات کی تلخی کو لفظی شراب اور معنوی شراب کے نشہ سے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے، بہادر وہ ہیں جو واقعہ کو واقعہ سمجھ کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں، وہ نہیں جو اس کو بھلا کر غم غلط کرنا چاہتے ہیں۔

اوپر کی سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے ممکن ہے کہ ہمارے نوجوان ادیب و صاحب قلم و شاعر اس کو شکر برا مانیں، لیکن چونکہ جو کچھ لکھا گیا ہے خلوص سے لکھا گیا ہے اس لئے امید ہے کہ "جوانان سعادت مند" حافظ کی طرح راقم کو بھی معاف فرما کر "پند پیر دانا" پر توجہ فرمائیں گے۔

(ندیم گیا ۱۹۳۵ء)

سفر گجرات کی چند یادگاریں

جولائی سنہ ۱۹۳۰ء میں بڑودہ کی مجلس سیرت کے سلسلہ میں مجھے گجرات کے سفر کا اتفاق ہوا، اس خطّہ کو ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں چند خصوصیتیں حاصل ہیں، اوّل یہ کہ عرب اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا، دوسرے یہ کہ عرب سے جو علما و زہاد اس کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوتے تھے وہ پہلے یہیں اترتے تھے، موقع ملتا تو آگے بڑھتے ورنہ یہیں سے لوٹ جاتے تھے، ہندوستان سے جو علماء عرب جانا چاہتے تھے، وہ اسی راستہ سے سفر کرتے تھے، اس صوبہ کے سینکڑوں دیہات حرمین شریفین کے مصارف کے لئے وقف تھے، اور دوسرے ملکوں سے جو نادر اور تحفہ چیزیں یہاں آتی تھیں، وہ پہلے یہیں پہنچتی تھیں، حج کے لئے ہر سال ہزاروں علماء، امراء، اور عام مسلمان اسی راہ سے منزل مقصود کی طرف روانہ ہوتے تھے۔

آخر زمانہ میں سلطان عالمگیر اور سیواجی کی سیاسی کشمکش کا میدان جنگ یہی خطہ تھا، اور اس لئے سلطانی لشکر کا پڑاؤ اکثر یہاں رہتا تھا، اور اس تعلق سے یہ صوبہ بھی پورے ہندوستان کا دارالسلطنت بنا ہوا تھا، اور ہر قسم کے اہل کمال ادھر کا رخ کرتے تھے۔

دکن و گجرات کے علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے، اور جیسے وہ ہندوؤں کی کثرت، زور و قوت اور سیلاب تمدن میں غرق ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے

کہ ہندوستان کے علمی و مذہبی و سیاسی مرکز یعنی ہندوستان خاص سے وہ بہت دور ہے، اس لیے یہاں کے دیہاتوں اور قصبوں میں مسلمانوں کی حالت قابل رحم تھی، سلطان عالمگیر کی دوربین نگاہوں سے ان وجوہ و اسباب کا نتیجہ چھپا نہ تھا، سلطان نے اس پورے علاقہ میں علماء، صوفیہ، اور مذہبی معلمین کی قطار در قطار آباد کر دی، مؤذن، خطیب، امام اور ملا (جو جانور شرعی طور سے ذبح کرتے تھے) موروثی مقرر کر دیئے، اور ان سب کے لئے وظائف اور سرکاری اوقاف معین کئے، جو آج تک ان کے اخلاف کے قبضہ میں ہیں، اور وہاں کے دیہاتوں میں آج تک انہی ملاؤں کی اولاد اپنے اس فرض کو ادا کر رہی ہے، یہاں تک کہ کوئی ہندو بھی اگر جانور ذبح کرانا چاہتا ہے، تو یہ خدمت ان ہی کے ہاتھوں سے کرانا ہے، یہاں اب بھی ایسے سیکڑوں ہزاروں شریف خاندان آباد ہیں، جو انہی مذہبی فرائض کے لئے یہاں آباد کئے گئے تھے، اور ان کو اس کے لئے سرکاری اوقاف دیئے گئے، جن پر وہ آج تک قابض ہیں اور انہی کے بدولت آج انگریزی سرکار میں بھی ان کو عزت اور وقار حاصل ہے، اور مسلمانوں کی کچھ مسلمانہ صورتیں وہاں نظر آتی ہیں۔

بھڑوچ: بھڑوچ جس کے کنارے دریائے نربدا بہتا ہے، اور جو آگے چل کر بحر عرب میں ملجاتا ہے، عربوں کے جنگی و تجارتی آمد و رفت کا مرکز تھا، عرب اس کو بروص کہتے تھے، سنہ ۱۵ھ میں حضرت عثمان ذو النورین کے عہد میں جب اسلام کے ملکی فتوحات کا شباب تھا، ان کے جنگی جہاز اس کے ساحل پر آ لگے تھے، سفر کے اثناء میں جب میں بھڑوچ پہنچا اور نربدا کے کنارے آ کھڑا ہوا تو تخیل کی آنکھوں نے تیرہ سو چھتیس برس پہلے کی تصویریں نگاہوں کے سامنے کر دیں، اور گو میں شاعر نہیں تاہم جذبات کے تلاطم نے موزوں ترانہ کی شکل اختیار کر لی۔

نربدا اے نربدا! اے جادۂ بحرِ عرب
گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحرِ عرب

جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز
تیرے دروازہ پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز

تو گذشتہ کاروانوں کا نشانِ راہ ہے
ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے

رشتۂ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا استوار
تیرے ساحل کا ہر اک ذرّہ ہے اُنکی یادگار

ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو
چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو

آج کسکو یاد ہے وہ داستانِ باستاں
تیرے ساحل پہ جب اترا تھا عرب کا کارواں

تو ہے دریائے عجم پہری یا شاہدِ عالم ہے تو
اس سمندر کے گلے کی شہ رگِ اعظم ہے تو

تیرا ہر قطرہ حیاتِ نو کا اک سرشار جام
اس تنِ آبی میں تیرا خون دوڑتا ہے مدام

نسبتِ بحری پہ اے خوش بخت گشتہ تو نربدا!
عہدِ ماضی کی تری عزت رہے باقی سدا

تو بتا تیرے تپش ظاہر ہے آج تیری خاک سے
ذرّہ ذرّہ پہ ترے خورشید کی تو لاگ ہے

یادگارِ عہدِ خیرالقرن ہے تیری زمیں
مطلعِ انوارِ ذی النورین ہے تیری جبیں

چشمِ عبرت کی نگاہیں جب تری جانب اٹھیں
تیری موجیں کہنہ افسانوں کی سطریں بن گئیں

یہ ترانہ تالی لمراد نربدہ رقم سے نکالی ہے، اس لئے اہلِ وجد دیکھیں اس پہ کان نہ دھریں

بھڑوچ کا ایک پرانا خاندان

بھڑوچ میں عہدِ عالمگیری کی یادگار ایک خاندان ہے جو یہاں مسند قضا پر متمکن تھا، اس خاندان کے موجودہ چشم و چراغ جناب قاضی نورالدین شیرازی صاحب ہیں، علم و دیانت کا ضمیمہ کردہ یادگارِ زمانہ ہے، ایک موروثی کتب خانہ ان کے اسبابِ زینت میں ہے، افسوس ہے کہ اس وقت قاضی صاحب موجود نہ تھے، اس لئے میں کتب خانہ کی سیر نہ کر سکا، مگر میرے ایک عزیز نے ان کا کتبخانہ دیکھا ہے، اس کے حسبِ ذیل چند نوادر کا حال مجھ سے بیان کیا۔

اس خاندان کے چند نوادر کتب | (۱) شرح مثنوی مولانا روم (؟) جلد پنجم، آخر میں ہے۔

"ذو القعدہ سنہ ... میں بسنت رائے نے قصبہ چھرہٹہ سرکار خیر آباد میں تحریر کیا"

(۲) حدائق السحر فی دقائق الشعر، مولفہ محمد بن محمد بن عبد الجلیل العمری المعروف برشید وطواط، آخر میں ہے۔

تم الکتاب بعون الملک الوهاب وحسن توفیقه علی ید العبد الضعیف محمد الحافظ الهروی، محرّراً فی یوم الاثنین، ثانی عشر من ربیع الاول سنة اثنین وستین وثمانمائة الهجریة النبویة بدار السلطنة شیراز زمان فی...

(۳) المحیط للسرخسی، جلد ثانی، جمع الامام الهمام مولانا رضی الدین محمد بن محمد سرخسی الحنفی، آخر میں ہے:-

کان الفراغ من کتابته فی یوم الرابع ذو القعدة سنة ۹۰۹ کاتبه محمد ابن علی بن رمضان العبادی الشافعی الازهری۔

(۴) گلستان، متوسط تقطیع اور معمولی خط نسخ۔

مصنف کے اصل نسخہ سے یاقوت مستعصمی نے اور اس نسخہ سے بحکم جہانگیر سید جلال الدین بخاری سنہ ... اور اس سے سید محمد بن سید زین العابدین بن سید احمد حسنی رضوی نے سنہ ۱۲۱۹ھ میں نقل کیا۔

(۵) خزانۃ المعروف جلد ثانی شرح مشکوٰۃ فارسی از کتاب التذکرۃ، تا کتاب البیوع دوسری، تیسری اور چوتھی جلدیں۔

ملا یہ کتاب ایران میں چھپ چکی ہے، اور مقتبس ہے۔ سنہ ... یہ کتاب بھی مصر میں چھپ چکی ہے۔

صفحہ اوّل مطلا ہے، تقطیع کلاں، اس پر خواص خاں غلام فرخ سیر بادشاہ غازی کی مہر ۱۱۲۵ھ ہے۔

ابو معروف حسین ۱۲۲۱ھ بھی تحریر ہے۔

مدرسہ دارالرشاد احمد آباد میں بھی رہ چکی ہے۔

(۶) کتاب الخلاصہ (خلاصۃ الفتاوی) مولفہ طاہر بن احمد بن عبدالرشید البخاری، ناقص از وسط، تقطیع کلاں، مختلف مسخ شدہ مہریں ہیں، آخر میں ہے۔

تم کتاب الخلاصۃ من املاء الشیخ محمد بن محمد بن نصر المدعو بحافظ البخاری علی ید افقر عبیدہ محمد المدعو بصفی الدین بن محمد الخلیلی ولد ابن حسین بن علی بن محمد بن احمد، فی دولۃ الملک محمد بن مراد بن سلیم بن سلیمان، بن سلیم بن بایزید من شهور سنۃ ثلاث بعد الالف سنۃ ۱۰۰۳ نقل من نسخۃ تاریخہا یوم الجمعۃ العشرین من شهر ربیع الاول سنۃ ثلاث وتسعین وستہ مائۃ۔
سنہ ۶۹۳

(۷) مجمع البحرین، ترجمہ انگشت پرم ہنس، از اختر بن دید، فارسی شاہ سرہند نے ۱۰۳۶ھ میں سنسکرت سے ترجمہ کیا، کاتب نند رام ولد انت رام، خط فارسی نستعلیق، ۱۳×۸ تقطیع، صفحات ۸۲۔

ہندوستان کی سب سے پرانی مسجدیں	قاضی صاحب کے عزیز خاص جن کو حکومت برطانیہ سے سردار صاحب کا خطاب حاصل ہے وہ موجود تھے، ان کا دیکھ دہ

بھی گنج شہید سجادہ وجلال کا کہنہ مرقع تھا، موصوف نے اپنے خاندان کے پرانے ہتھیاروں کی

سیر کرائی، ان کی عمارت کے سلسلہ میں ایک چھوٹی سی معمولی مسجد ہے، جس پر سنہ ۴۳۰ھ کا یہ کتبہ لگا ہے "ھذہ العمارۃ القدیمۃ فی شھور سنۃ ۴۳۰" اس کتبہ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ بعد کو لگایا گیا ہے، بہرحال اس کی کوئی تاریخی سند اگر موجود ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ صوبہ کے اسلامی فتوحات سے پہلے کی یادگار ہے، یا یوں کہئے کہ محمود غزنوی کے حملہ گجرات سے چند سال بعد کی ہے، جو بہرحال کوئی مستقل فتح نہ تھی۔

اس کے بعد اس شہر میں اسلام کی ایک اور قدیم یادگار وہاں کی سنگی جامع مسجد ہے اس جامع مسجد کی اصل تعمیر کا کتبہ ۶۵۵ھ ہے، بعد کو محمد تغلق کے عہد میں سنہ ۷۲۱ھ میں دروازہ کے اوپر ایک گنبد کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ گنبد سنگ خارا سے بنایا گیا ہے، اور اس پر حسب ذیل کتبہ لگا ہے۔

"در عہد دولت سلطان عالم غیاث الدنیا والدین محمد تغلق، ہفتصد و بست و یک"

غالباً ان مسجدوں سے زیادہ پرانی کوئی دوسری مسجد ہندوستان میں نہ ہوگی

انکلیشور کا ایک خاندان | بھڑوچ سے قریب ہی ایک پرانا قصبہ انکلیشور نام ہے جو صورت کے سفر میں کبھی ریچ کی ایک منزل تھا، یہاں بھی عہد شاہی کی یادگار ایک خاندان آباد ہے، خاندان کے بانی شاہ عبد العلیم صاحب ہیں، جو اکبر کے معاصر تھے، ۱۰۰۰ھ میں انہوں نے وفات پائی ہے، ان کی خانقاہ اور مسجد یہیں واقع ہے، خاندان کے موجودہ جانشین کا نام سید حیدر علی غلام علی انعامدار ہے، موصوف کے پاس خاندان کی پرانی اکبر کی سند پرانی کتابوں کی ایک الماری ہے، اس میں چند عربی کی اور باقی فارسی تصوف کی کتابیں ہیں، گجراتی اردو میں بھی بعض کتابیں نظر آئیں۔

اس خاندان کے چند نوادر کتب | عربی کتابوں میں سب سے نادر چیز یہاں قدیم طب کی

ایک کتاب تقویم الادویہ ہے، اس کا سال کتابت ۸۵۸ھ ہے، نسخہ بخط عرب نیرہ حز! سے لکھا ہوا ہے، اور اب تک اچھی حالت میں ہے۔

حقہ کی تاریخ | یہاں ایک مجموعہ میں ایک صفحہ پر چند واقعات کی تاریخیں لکھی ہوئی نظر پڑیں، جن میں سب سے اہم ہندوستان میں حقہ کے رواج کی تاریخ ہے، یہ تاریخ "ناخوشی ہی" کے الفاظ سے نکالی گئی جس سے ۱۰۲۹ھ نکلتے ہیں، چونکہ یہ چیز گجرات ہی کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوئی ہے، اس لئے عجب نہیں کہ تاریخی بیان صحیح ہو، ۱۰۲۹ھ جہانگیر کا عہد ہے۔

بنائے سورت کی تاریخ | گجرات کا دوسرا مشہور دریا جو بحر عرب سے جا کر ملتا ہے اور یا تاپتی ہے، اس کے ایک کنارہ پر شہر سورت آباد ہے اور دوسرے کنارہ پر راندیر، پہلے بحر عرب میں جانے والے جہازوں کا بندرگاہ راندیر تھا، مغلوں کے شروع عہد میں اس کے بجائے سورت کی آبادی بڑھی اور وہ ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ بنا، اس قلمی یادداشت میں اس بندرگاہ کی آبادی کی تاریخ ۹۳۷ھ نظر آئی، تاریخ کا مصرعہ یہ تھا،

باد آباد بندر سورت

راندیر جس کو پہلے رانیر کہتے تھے، اسلام کے قدیم فتوحات میں ہے، اس یادداشت میں اس فتح کی تاریخ ایک قدیم مسجد کے کتبہ سے حسب ذیل بتائی گئی ہے

بذاکر و مسجد بجا سے کنشت
بہ ابوالنش انا فتحنا نوشت

راندیر کی پرانی مسجد | چند دوستوں کی دعوت پر راندیر جانے کا بھی اتفاق ہوا، یہ دولتمند دیندار مسلمان تاجروں کا مسکن ہے، اور دعویٰ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس قصبہ میں جس قدر خوبصورت، اور عمدہ اہتمام کے ساتھ مسجدیں دیکھنے میں آئیں ہو رہے

ہندوستان میں کہیں نہیں آئیں ، ان مسجدوں میں سے ایک قدیم مسجد جو نادوارہ ہے ، یادداشت تذکرہ میں اس مسجد کی بنا کی تاریخ یہ لکھی تھی ۔

گر کسے پرسد زتو تاریخ ازیں معبد شریف   گو مسمیٰ مسجد اعلیٰ دور باب شریف

۷۹۵ھ

گجراتی ہندوی کی بعض کتابیں بھی اس خاندان کے ذخیرہ میں دکھائی دیں جن میں سے درج ذیل کتابیں ذکر کے قابل ہیں ۔

لغت عربی وہندی | عربی اور ہندی یا ہندوستانی کا ایک لغت ملا ، جس کے شروع کے چند شعر یہ ہیں ۔

الله	خدا	ہے کرتار	الخالق	آفرید	سرجنہار
الدنیا	گیتی	سنسار	الاحمق	نادان	گنوار
الجنت	بہشت	سرگ	السقر	دوزخ	نرگ
الیوم	روز	دیس	الشعر	موئے	کیس
اللیل	شب	رات	القول	گفت	بات
السبیل	راہ	باٹ	السبع	ہفت	سات
الاسم	نام	ناؤں	الموضع	دیہہ	گاؤں
الظل	سایہ	چھانوں	المقام	جائگہ	ٹھانوں
الراس	سر	سیس	العشرین	بیست	بیس
العین	چشم	آنکھ	اللحیہ	ریش	پانکھ
الاذن	گوش	کان	الورق	برگ	پان
الطعام	خوردن	کھان	السہم	تیر	بان

آخری حصہ:-

الفرح خوشی ہلاس القنوط ناامید نراس

الفخذ ران تہی جانگ الجسم تن ہے انگ

المورد آب خورا درارہا السحر افسانہ لپواڑا

الکدر تیرہ گدلا الکفیف نابینا اندلا

مصنف اور تصنیف کا زمانہ مذکور نہ تھا۔

اسی قسم کا ایک عربی لغت برادر عزیز نجیب اشرف صاحب ندوی کی ملکیت میں ہے اگر وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس کے ابتدائی شعر یہ ہیں۔

الالہ پرستیدہ پوجیا المعلوم دانستہ بوجھیا

الحمد ستودہ بکھانیا المعروف شناختہ پچھانیا

الرسول فرستادہ بھیجیا الواضح روشن سنجیا

الآل دودمان کنبہ الخفور خوشہ لدنیا

معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ گجرات میں عرب اور ایرانی کثرت سے آباد تھے اس لئے ان کو ہندی سے آشنا کرنے کے لئے اس قسم کی لغت یہاں لکھے گئے ہیں۔

رسالہ فقری جہانگیر

پچودہ خانوادہ

اس رسالہ کا آغاز ان لفظوں سے ہے

بدانکہ بوجھ تو لیں یہ رسالہ فقری حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا ہے۔ بادیو پچھے دیکھے دگرنہ تو فقیری نہ کرے۔

سوال۔ اگر تیرے پوچھے کہ اول فقیری کیا ہے و آخر فقیری کیا ہے اور خانہ یعنی گھر فقیری کیا ہے، اور کیلی فقیری کیا ہے، اور لقمہ فقیری کیا ہے،

اسی قسم کے سوال و جواب پر رسالہ کے اکیس[۲۱] صفحے ختم ہوئے ہیں۔ تصنیف و مصنف کے ذکر سے پوری خاموشی ہے۔

رسالہ فقہ ہندی | یہ فقہی مسئلوں کے بیان میں ایک نظم ہے۔ آغاز کے اشعار یہ ہیں۔

حمد و ثنا سب رب کوں خالق کل جہان — لائق حمد ثنا ی کے اور کو نہ جان،
علم شریعت نال دی بھیجا پاک رسول — جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبول
یارب اپنے کرم سوں بھیج بے حد درود — نبی محمد مصطفےٰ اسوں ہوں خوشنود
بھیجو اُن کی آل پر اور اصحاب تمام — تس پچھو احباب پر بہت درود سلام
کیتے مسئلے دین کے عمد رکھے ہیں — فقہ ہندی زبان سے بوجھ کر و یقین
مطلب مسئلے پوچھنا، جو کچھ سمجھے زبان — عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان

اس کے بعد فقہی ابواب ہیں اور ان کے تحت میں ہر قسم کے مسائل ہیں، خاتمہ میں تصنیف کا سال ۱۱۰۶ھ بعہد اورنگزیب عالمگیر صاف بتایا گیا ہے۔ خاتمہ میں ہے

فقہ ہندی کوں مومناں کرو زبان پیا — مسائل آدمی دین کے کچھ دشواری ہوئے غلط
سنہ ہزار یکسو بچھ ماہ رمضان تمام — اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اس فقہی نظم میں خاص چیز نظم کا وزن ہے، جو عربی و فارسی کے بجائے ہندی وزن کی پیروی میں ہے، اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پرانے لوگوں کے زمانہ میں ہندی کس کو کہتے تھے۔

داستان حضرت ماہ رمضان | اس نظم میں ماہ رمضان کی فضیلتوں کا ذکر ہے۔ مصنف کا نام بدیع الدین ہے۔ شروع کے شعر حسب ذیل ہیں۔

سرنامہ اُنہ نام سبحان لکھوں — کہ دل کی ورق پہ سجل کر رکھوں

زباں کو ہے جو ہر اسی کی ثنا · اسی کی سو قدرت ہے جگ میں مِلی
کریم و رحیم وہ غفار ہے · کرم عاصیاں پہ کرنہار ہے
زہر چیز اس کی صنعت کا بیاں · کہ پیدا کیا جن نے ارض و سما

آخر میں لکھا ہے۔

کرو اس کی سب نعمتوں پہ شکر · مصیبت کے اوپر حکم ہے صبر
کہ تا عاقبت تیری ہووے بھلی · کہ شادی و غم جگ میں آتی چلی
بدیع الدین تعریف عمل کی کرو · کر چھوٹک کی جس سیں توبہ دیرو

اس نظم کی خصوصیت خاص فارسی آمیز ترکیبیں اور قافیوں میں صرف صوتی ہم رنگی ہے عربی الفاظ حکم اور صبر وغیرہ کو اس طرح باندھا ہے، جس طرح ہندی میں بولے جاتے ہیں۔

داستانِ قیامت | اس نظم کا شروع ان اشعار سے ہے۔

سخن ہے مرا جوں گل بوستاں · نصیحت کی باتاں سنو دوستاں
لباسی مسلماں کہاتے ہیں دوست · کہ کھاتے ہیں سب گلہ بکری کا گوشت
لباسِ شریعت کہیں تن منیں · شریعت کی باتاں نہ سمجھیں منیں
بڑی ریش تسبیح خوش بے دمت · بھرا دل میں کینہ بہانہ کرد فن

آخری شعر میں اس نظم کا سال ؟؟ (؟) بتایا گیا ہے۔ یا ۱۱۶۷ھ ہو۔

سنہ ایک ہزار و ستو نے سو · لکھی یہ حکایت کتابوں کی رو
بتاریخ غرہ دریں ماہ پیر · باتمام آں شد مدد دستگیر

فقہ مبین | یہ نظم فقہ کے مسائل میں ہے، آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

بنام پاک رب العلمین سول · شروع کرتا ہوں میں فقہ مبین حول

بحق معجزہ و مقبول مرسل — سبھی عقدہ فقہ کے مجھ پہ کر حل
مسائل فقہ کے ہیں اصل ایماں — جو نیں بوجھے سو وہ کیوں ہو مسلماں

اس کے بعد اپنے تمام ۴۰ ماخذوں کا نظم میں ذکر کیا ہے، پہلے ایمان کے مسائل، پھر طہارت، وضو، غسل وغیرہ، اس کے آخر میں بدعت کا رد اور جوئے کی برائی ہے، آخر میں ہے۔

یقیں فقہ المبیں کو اں کرتے مختوم — بحق دین پناہ و آل معصوم
صد و ہشتاد و دو و الف ہجرہ — بتاریخ ہمایوں گشت تمام
اگیارا سو میں اسی اور دو — سنہ ہجری بلیوں کے بتایو

رسالہ کے آخر میں خاتمہ کی عبارت ہے۔

"نسخہ قوت دین فقہ المبین تصنیف حضرت شاہ یقین رحمۃ اللہ علیہ"

اس سے مصنف کا نام شاہ یقین، کتاب کا نام قوت دین فقہ المبین اور تصنیف کا سال ۱۱۸۲ھ معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی تحفۂ رسالہ کسی رسم شادی کی تعریف و توصیف میں ہے، رسالہ اس طرح شروع ہوتا ہے

ثنا و حمد ہے درگاہ یزداں — وہ خالق سب کا ہے کیا جن و انساں
ثنا و حمد کے لائق صمد ہے — سزاوار خدائی کا خدا ہے

. . . .

محمد اشرف اولاد آدم — حبیب و سرور و سردار عالم
نبی آدم محمد سرور دیں — کہ ختم الانبیا ہیں رہبر دیں
جو اس کی شان میں لولاک وارد — دیکھو محبوب کا رتبہ ہے شاہد

اس کے بعد خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کی مدح اور امامین علیہما السلام کی تعریف

یہی چند شعر ہیں، اس کے بعد نکاح کا قصہ شروع ہوتا ہے۔

شروع کرتا ہوں اب شادی کی تعریف
نزاکت سیں لکھوں ہیں اسکی توصیف

مہیا سب کیا سامان اظہر
لباس و زیور و لولو و گوہر

اس کے بعد ان سرخیوں کے ماتحت چند باب ہیں:۔ در وصف الطعام، در وصف المحل، در وصف بردن برات، در وصف گشت، در وصف نکاح خوانی، در بیان خلوت، خاتمہ اس پہ ہوتا ہے۔

سخن کو مختصر کالوں تک لکھے گا
یہ بہتہ طومار آخر کون تھکے گا

بحضرت عشق باوا سانہ داری
مری یہ مثنوی ہے یادگاری

شب نسبت دو دوم از ماہ رجب
کہ شادی ہوئی شہر گشت ہے شب

سنہ ہجری دراں وقت بود موجود
ہزار و یکصد و تسعین و یک بود

آخر شعر سے تصنیف کا سال ۱۱۹۱ھ معلوم ہوتا ہے، وزن سے حرفوں کا گرنا، اس وقت معیوب نہ ہوگا۔

زفافت نامہ حضرت بیؑ | آغاز:۔

بنا اول کروں حمد خدا ہیں
زباں اوپر یس کی ابتدا ہیں

کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت
بنا کر جا کہ دکھایا اپنی حکمت

بیچ کا ایک شعر ہے، جس میں زباں کا نام دکھنی بتایا گیا ہے۔

مجھے توفیق دے یا رب کہ بکل
بنا ہجری دکھنی میں کھولوں

تصنیف کا سال معلوم نہیں کتابت کا سال ۱۲۵۱ھ ہے۔

قصہ بالنہ | اس مثنوی میں ایک قصہ بیان ہوا ہے، جس کے متعلق شاعر کا دعویٰ ہے

کہ یہ قصہ پہلے فارسی میں تھا، اور اب دکھنی میں اس کو نظم کیا جاتا ہے۔

عزیزاں روایت سنو کان دھر — اوّل فارسی تھی یہ دکھنی دگر
انتھا گوڈرہ ایک شہر کا جو نام — ہمیشہ شیخ کا انتھا داں مقام
نتھے ایک دن اس جمعہ مسجد منے — اتھے خرد و بزرگ او سارے جنے
دستے میں مسافر نیا آن کر — سلامٌ علیک کہہ کے بیٹھا نگر
پوچھے سب نے اسکو توں کاں سے آیا — شہر ہے دور ہے نام محمد حیا
لگا بولنے کوں او یوں تُنکے بات — زلیخا کا قصہ اوتوں کے سنگات
نگر ساری مجلس نے سن کر کلام — لگے بولنے آفریں سب تمام

فتح شاعر کا تخلص ہے، آخر میں ہے۔

فتح مختصر کر تو اپنی زبان — کہاں تک تو لکھے گا اسکا بیاں

زمانہ معلوم نہیں، تاہم اس کے بعض الفاظ خاص لحاظ کے قابل ہیں "تھا" اور "تھے" کی جگہ "انتھا" اور "اتھے"، "اور" کی جگہ "او"، "میں" کی جگہ "منے"، "کہاں" کی جگہ "کاں"، "وہ" کی جگہ "او"۔

قصۂ سوداگر بچہ | یہ نظم حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت کے بیان میں ہے، آغاز اس طرح ہے:-

ثنا اور حمد مولا کی صبح و شام کرتا ہوں — درود اں مصطفیٰ او پر دل و جان سیں میں پڑھتا ہوں
درود اں حمد سے پیچھوں حکایت اک کہوں نادر — عزیزاں تم سنو اں سکوں لکھوں دل کوں میں حاضر

آخر میں تاریخ ہے۔

گیارہ سو اد پچیس برس گذرے تھے ہجرت کے — تبھی تصنیف میں آئے خوارق پیر حضرت کے
توجہ رحمۃ اللہ پہ کر دتم اس تہ پیراں — صفائی بات کی ہوئے اسے اے حضرت پیراں

خالق باری | ہمارے فارسی و ہندی ادبیات میں خالق باری کی تاریخ ایک معما ہے۔ اس کی تصنیف کی نسبت امیر خسرو کی طرف مشہور ہے، لیکن محققین کو ہمیشہ سے اس میں شک ہے، تعجب کی بات ہے کہ اس کا کوئی قدیم نسخہ اب تک نہیں ملا ہے[1]۔ اس کتب خانہ میں اس کا نسخہ نظر آیا، لیکن وہ بھی قدیم نہیں، رسالہ تاریخ سے گو معرّا ہے، مگر اس کے نستعلیق خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سو اسو برس سے زیادہ عمر کا نہیں۔

خالق باری کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں ایک لفظ ملتا ہے جو "بدا" یا "بڑا" پڑھا جاتا ہے۔ ع واحد ایک بڑا کرتار

مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ تصنیفاتِ خسرو میں جو نسخہ چھپا ہے، اس میں یہ لفظ "بدا" چھاپا گیا ہے اور اس کے نیچے "ع" لکھا گیا ہے، لیکن عربی میں "بدا" کرتار کے معنی میں میرے پندار میں نہیں آیا ہے، معلوم نہیں فاضل محشی کے پاس جو عربی اور سنسکرت دونوں کے فاضل ہیں، اس کی سند کیا ہے، موجودہ نسخہ میں یہ لفظ بڑا لکھا گیا، لیکن یہ بھی مہمل ہے۔ بعض مطبوعہ نسخوں میں "خدا" چھپا ہے، اور شاید یہی صحیح ہو۔

زیر بیان نسخہ میں اوّل تو کچھ اشعار زیادہ معلوم ہوئے، دوسرے یہ کہ افعال اور ضمائر میں قدامت زبان کی جھلک دکھائی دی، یہ تین شعر نئے معلوم ہوئے جو مطبوعہ نسخہ میں مجھے نہیں ملے۔

چوں برادر ہست خسر بورہ کسیت ہے جو کا بھائی ہے   در خسر یہ سی جو کا باپ جن دی جاتی ہے

---

[1] خالق باری کا ایک قدیم نسخہ بعد کو پروفیسر شیرانی کے ہاتھ آیا، اور اب قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ وہ خسرو سے بہت بعد کی تصنیف ہے، اصل نسخہ مع مقدمہ کے اب انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔

ریخت اندر گوش خود سیماب وی پور ایمیا　　　پنبہ پچیک روئی گالا، جسم تن آمد۔ کیا

واں نہالی بستر و بالیں تکیہ اے جواں　　　غلط بالا۔ لیٹ اوپر۔ وس پچھاڑ گستراں

حسب ذیل شعر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے قلمی نسخہ سے مطبوعہ کے تتمہ نمبر ۱۰۸ میں

اس طرح چھپا ہے۔

عطسہ چھینک شاخ سینگ کفش گم ہے کفش دوز

گاذر و خیاط ہے دھوبی و درزی جامہ دوز

پہلے مصرع کا وزن صحیح نہیں معلوم ہوتا، فاعلاتن کا دوسرا اور تیسرا رکن کم ہے

پیش نظر نسخہ میں غلطی نہیں، پھر دوسرے مصرع میں قافیہ دوز مکرر ہے، جو درست بھی نہیں

اور جامہ دوز خیاط و درزی کے تقابل کے بعد بے معنی سا ہے، پیش نظر نسخہ میں یہ شعر یوں ہے۔

عطسہ چھینک و شاخ سینگ و کفش گم ہے کفش دوز

گاذر و خیاط ہے دھوبی و درزی، جیس دوز

اسی کے بعد تتمہ نسخہ مطبوعہ نمبر ۱۰۸ میں ہے

ناگہاں ہے بخت سست ابھاگ بخت بھاگ　　　فارسی آمد سرود و ہندوی گو بند راگ

اس کا پہلا مصرع شروع میں غلط ہے، دوسرا رکن ٹوٹتا ہے، اور تیسرا رکن غائب ہے۔

چار بار فاعلاتن کے بجائے تین ہی بار ہے، پیش نظر نسخہ میں یہ غلطیاں نہیں۔

واں کہ بد بخت است ابھاگا؛ بخت ور فرخ سست بھاگ

فارسی آمد سرود و ہندوی گو ہند راگ

مطبوعہ نسخہ میں ہے ع "طعم سواد، و طعام خورش، جو کہئے کھاتا"،

پیش نظر نسخہ میں طعم کی جگہ "مزہ" ہے، جو زیادہ بامزہ ہے۔

مطبوعہ میں ہے۔

دُرّ و گہر دارید موتی جانیے　　　ہم صدف سیپی، سمندر آب نیے

پیش نظر قلمی میں دوسرا مصرع یوں ہے۔ مصرع "ہم نبسد، رانی گلے پچھیا نیے"

اس قسم کے اختلافات اور بھی ملیں گے، لیکن اہم چیز ضمیر کا معاملہ ہے۔ مطبوعہ نسخوں میں لوگوں نے زمانۂ مابعد کی ضمیریں کر دی ہیں، مثلاً قدیم "توں" کی جگہ جدید "تو" بہت پرانی زبان میں متکلم "ہوں" تھا جو اب بھی ہوتا ہے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ حضرت خواجہ فرید شکر گنج ۵۶۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۶۴ھ میں وفات پائی اور امیر خسرو نے جن کی طرف یہ خالق باری منسوب ہے ۷۲۵ھ میں وفات پائی، غرض دونوں کا زمانہ کچھ ہی آگے پیچھے ہے۔ حضرت خواجہ شکر گنج کا جو فقرہ میں نے اپنے مضمون "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے شائع کیا ہے، اس میں واحد متکلم اور واحد مخاطب کی ضمیریں "ہوں" اور "توں" استعمال ہوئی ہیں، بعینہٖ یہی دونوں ضمیریں پیش نظر نسخہ میں ہیں، مثلاً

خواہم گفت کہوں گا ہوں　　　خواہم کرد کروں گا ہوں

خواہی آمد آوے گا توں　　　خواہی نشست بیٹھے گا توں

خواہم دید دیکھوں گا ہوں　　　خواہی دید دیکھے گا توں

خواہم داد دیوں گا ہوں　　　خواہی داد دیوے گا توں

خواہم دوید دوڑے گا ہوں　　　خواہی دوید دوڑے گا توں

مطبوعہ نسخہ میں "ہوں" کی جگہ "میں" اور "توں" کی جگہ "تیں" ہے۔

سفر گجرات کی کچھ اور باتیں بھی بیان کرنی تھیں، مگر دیکھتا ہوں کہ قلمی سفر بھی خامہ طویل ہو گیا ہے، ہمسفر ناظرین کے ملال خاطر کا اندیشہ ہے، اس لئے قلم کی باگ یہیں روک لی جاتی ہے۔

(معارف ستمبر ۱۹۲۶ء)

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

"ہندوستانی اکاڈمی کی ادبی کانفرنس الہ آباد ۱۹۳۰ء میں پڑھا گیا"

لغت کا کام عام طور سے لفظوں کے معنی بتانا سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے، کہ قوموں کی طرح قوموں سے متعلق ہر چیز ایک مستقل تاریخ رکھتی ہے زبان قوم کی تاریخ کا نہایت اہم جز ہے، اس لئے زبان اور اس کے لفظوں کی تاریخ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے، اور یہ تاریخ ہمارے لغت کا بڑا اہم باب ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کی طرف ابھی تک ہماری زبان کے لغت نویسوں نے توجہ نہیں کی ہے۔

قومیں اپنی تاریخوں میں کتنی ہی خیانت کریں، اور اُن کے واقعات کو کتنا ہی الٹ پلٹ ڈالیں، مگر زبان اور اس کے الفاظ کا ذخیرہ ایک سچے امانت دار کی طرح پچھلی روداد کا ریکارڈ یا مسل ہمارے لئے تیار رکھتا ہے۔ جس سے اس زبان کے محقق ضرورت کے وقت پوری طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، چنانچہ اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ کسی قوم سے تعلقات اور رابطے دنیا کی کن کن قوموں سے رہے ہیں، تو اس قوم کے لفظوں کے خزانے میں ہمارے لئے معلومات کا بڑا سرمایہ محفوظ ملے گا۔

ہماری ہندوستانی اردو زبان کی عمر چاہے کتنی ہی چھوٹی ہو پھر بھی اس کی ملکیت میں ایسے لفظوں کی کمی نہیں، جو اپنی مستقل تاریخ رکھتے ہیں، اور اپنی خاموش زبان سے

ہم کو سنانے کے لئے بہت سے ایسے واقعات یاد رکھتے ہیں جن کو کاغذی تاریخ کے اوراق بھلا چکے ہیں۔

ہم اپنی زبان کے اس قیمتی سرمایہ کا آغاز سکوں سے کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لفظی دولت مضمون کی معنوی دولت کے لئے فالِ نیک بن سکے۔

دام۔ ہماری زبان کا ایک پامال لفظ دام ہے، ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہیں اور دوسرے معنی ایک معمولی سکہ کے ہیں جس کی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان میں چھدام کی ہے، جو چھے اور دام دو لفظوں سے بنا ہے، اس لفظ کی تاریخ کے لئے ہم سے دو ہزار برس پہلے ہم کو لوٹ کر جانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشور کشا اور سوداگر ایشیا پر پھیل گئے تھے، مصر و شام و عراق سے ایران اور ہندوستان تک کے ڈانڈے مل گئے تھے، ان ملکوں میں یونانی حکم اور یونانی سکے چلتے تھے، اور ان کے یونانی نام زبانوں پر تھے

یونانیوں کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکہ کا نام درخم (DRACHMA) اس نے عربی میں درہم اور فارسی میں بیچ سے ایک حرف گر کے درم کی صورت اختیار کی، ہندوستان میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر اور اس کی جگہ ایک لمبی آواز بڑھ کر دام ہو گیا، یہ لفظ جس طرح سکہ کو بتاتا تھا سکہ کے وزن کو بھی بتاتا تھا، چنانچہ عربی طب میں دواؤں کا وزن درہم، اور فارسی طب میں درم سے بتایا جاتا ہے، اسی لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو ڈرام ہو گیا۔ جو اب ہمارے انگریزی طبی نسخوں، دواخانوں اور شفاخانوں میں ایک بیگانہ کی حیثیت سے وارد ہے، اور شاید اب کوئی پہچانتے بھی نہیں کہ دام اور ڈرام دونوں کی ایک ہی شخصیت ہے، صرف آب و ہوا، لہجہ اور شکل و صورت کا فرق ہو گیا ہے۔

اکبر کے زمانہ میں دام چاندی کے سب سے چھوٹے سکہ کے بجائے تانبے کے سکہ کا نام

تھا (صفحہ ۸ فرہنگ فخری) اس کو پہلے پیسہ کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں، یہ روپے کا چالیسواں حصہ تھا، پھر ایک دام کے پچیس حصے کر کے ہر حصہ کو جیتل کہتے تھے لیکن اس کو گنتے نہیں، بعد کے زمانہ میں بھی اس کا نام ملتا ہے۔ (صفحہ ۱۲)

اسی تقسیم سے ایک محاورہ بھوجپوری زبان میں اب تک چلا ہے، ہر گاؤں یا ہر زمیندار کی ملکیت ۱۶ آنے فرض کی جاتی ہے اور یہ آنے پھر پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہیں، ایک دام کا آدھا ادھیلہ اور ۱/۴ پاؤلہ اور ۱/۸ دمڑی کہلاتا ہے، اور یہ آخر لفظ دام کی تصغیر یا تحقیر ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ جو دام قیمت کے معنی میں ہم بولتے ہیں وہ اسی سکہ کی یادگار ہے جس سے پہلے چیزوں کی قیمت کا اندازہ اور لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔

آئین اکبری[1] کے مطابق ایک من تانبے میں ایک ہزار چالیس دام ڈھلتے، تیار ہوتے تھے۔

تغلقوں کے زمانہ میں درم سنگ، خرید فروخت کی تول یعنی باٹ کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ (فیروز شاہی ضیاء برنی ص ۳۱۹)

کیراٹ۔ اودھ کے دیہاتی کاغذوں میں ۱۶ آنے کی تقسیم آخر میں پائی اور آنوں کی پائیوں پر ہو، اور اس کے بعد کیراٹ اور تجزیہ ہوتی ہے، لفظی بہروپیوں کے پہچاننے والوں کو اس کے پہچاننے میں دقت نہیں ہو سکتی کہ یہ کیراٹ عربی قیراط کی خرابی ہے، اور عربی زبان میں یہ لفظ قیراط یونانی سے آیا ہے[2]، آجکل انگریزی میں بھی لفظ کیرٹ (Carat) کی صورت میں مستعمل ہے، وہ انگریزی سونے کے بنے ہوئے زیوروں اور چیزوں میں

---

[1] آئین اکبری جلد اول (ادارہ)   [2] لسان العرب لفظ قرط ج ۹۔

اس لئے کیریٹ گولڈ کی اصطلاح کا عام رواج ہے۔

اشرفی۔ درہم اور قیراط جس طرح باہر سے آئے ہوئے نام ہیں، اسی طرح ہمارے سب سے قیمتی سکہ اشرفی کا نام بھی باہر سے آیا ہوا ہے، مجھے بہت دنوں سے اس کی اصلیت کی تلاش تھی، اور پتہ نہ چلنے پر اس کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ چونکہ یہ طلائی سکہ سب سکوں میں اشرف ہے اس لئے اشرفی کہلایا، مگر دفعۃً ایک غیر متوقع ماخذ سے اس کی اصلیت دریافت ہوئی، تو معلوم ہوا کہ سکہ اشرف نہ تھا، بلکہ جس بادشاہ کی طرف وہ منسوب ہے، وہ اشرف تھا۔

طلائی سکہ کے لئے سب سے پرانا نام دینار ہے، اور یہ بھی یونانی ہے[۱]، مگر چونکہ عربوں میں یہ سکہ جاری تھا، اس لئے انھوں نے عبدالملک کے زمانہ میں ۷۶ھ یا ۷۷ھ[۲] میں جب اپنا طلائی سکہ ڈھالا تو اس کا نام دینار ہی رہنے دیا۔ جب ان کے قدم ہندوستان پہنچے تو ان کا دینار بھی ان کے ساتھ آیا، اور آج تک خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعداد میں سکہ رائج الوقت کے ساتھ چند دینار سرخ دائمی طور سے جاری ہے۔

تغلق کے زمانہ میں ہم کو اشرفی کے لئے دو لفظ ملتے ہیں، ایک تنکہ[۳] زریں تنکہ سکہ کے معنی میں عام طور سے بولا جاتا تھا، (برنی ص ۱۴۳ و ص ۳۱۵) اور اسی سے تنخواہوں کی تعیین ہوتی تھی، پیادے کی ماہانہ تنخواہ ۲۴ تنکہ، اور سوار کی ۷۰ تنکہ تھی، (برنی ص ۳۱۹) مخدوم زادہ بغداد کے لئے دس لاکھ تنکہ وظیفہ مقرر ہوا، (برنی ص ۴۹۶) مصری خلیفہ کا سفیر جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں آیا ہے اور جمعہ کے دن خلیفہ کا نام خطبہ میں پہلی دفعہ پڑھا گیا ہے تو خیر من طبقہا بہ انداز تنکہ زر و نقرہ بر آن نثار شدہ (برنی ص ۴۹۲)۔

---

[۱] جرجی زیدان نے اس کو لاطینی لکھا ہے، تاریخ تمدن اسلام (ص ۱۹ ج ۱)، [۲] مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱۸۔ [۳] ڈاکٹر تارا چند نے بتایا ہے کہ تنکہ سنسکرت میں سکہ کو کہتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کے لئے اس زمانہ میں تنکۂ زر بولا جاتا تھا، خلجی کے زمانہ میں ایک تنکۂ زر ایک تولہ سونے کا ہوتا تھا اور تنکۂ نقرہ ایک تولہ چاندی کا (فرشتہ ص ۱۴۸) روپیہ کو تنکۂ نقرہ اور اس سے کم درجہ سکہ کو صرف تنکہ کہتے تھے، یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض بعض پرانے خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعیین میں بولا جاتا ہے۔

(دیکھو مولانا حالی کا خط بنام سید سلیمان ندوی در معارف)

خیال ہوتا ہے کہ یہی تنکہ تو آج "ٹکے" کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں؟

دوسرا لفظ مہر زر ہے۔ اس کو مہر اس لئے کہتے تھے کہ اس پہ شاہی نام نقش ہوتا تھا مہر زر کی اصطلاح برنی میں ملتی ہے۔

"سلطان محمد مہر مس پیدا آورد فرمان داد کہ مہر مس خرید و فروخت، چنانچہ مہر زر و نقرہ جاری ست" (ص ۴۵۵)

یہی مہر زر اکبر کے زمانہ میں بھی زبان و قلم پہ تھا، آئین اکبری میں اکبری سکوں کے بیان میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، (ص ۱۰) اگرچہ اکبر نے اشرفی کے لئے سہنسہ، رہس، آتمہ، چگل، لعل جلالی، آفتابی وغیرہ بنائے اور چلائے، مگر مہر کا نقش بھی مٹا نہیں بلکہ پرانی شاہی اشرفی کو آج بھی مہر کہتے ہیں۔

دکن میں طلائی سکہ کا نام "ہون" تھا جو آخر میں مخفف ہو کر ہُن ہو گیا، اور آج ہماری زبان میں اس نسبت سے دولت کی کثرت کے معنی میں "ہن برسنا" ایک یادگار رہ گیا ہے روپیہ کا لفظ اور سکہ شیر شاہ کا چلایا ہوا ہے (آئین اکبری ص ۱۰)، اور عجب نہیں ہے کہ رُپا سے بنا ہو، سونے کے سکے کے لئے اشرفی کا لفظ ہندوستان میں نور الدین جہانگیر کے زمانہ میں استعمال میں آیا ہے، چنانچہ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں حسن گنگو بہمنی کے خزانہ پانے کی

اتفاقی سرگذشت کے بیان میں لکھا ہے۔

"زنجیرہا در گردن ظرفے مملو از اشرفی علائی و طلاہائے غیر مسکوک دید" (فرشتہ نولکشوری ص ۲۱۴)

فرشتہ کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۱۰۱۵ھ سے سنہ ۱۰۳۳ھ تک ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گجرات و دکن کی راہ سے یہ اشرفی مسافرانہ ہندوستان وارد ہوئی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ سونے کے سکہ کے لئے افریقہ کی طلا خیز اور زرریز زمین ہی سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوئی ہے، انگریزی گنی کا مولد افریقہ کا ملک گانا یا گینی قرار پایا ہے جس کو عرب غانہ کہتے تھے، اور بلاد التبر (سونے کا ملک) کے نام سے پکارتے تھے، اور وہیں سے سونا لاتے تھے، وہم ہوتا ہے کہ غانہ کا تعلق عربی کے غنی اور غنا سے تو نہیں؟ بہرحال ہماری اشرفی کا مولد و منشا بھی ہندوستان نہیں، بلکہ ایشیا بھی نہیں، افریقہ ہی کا ایک گوشہ ہے، اگر دوسری طرف کا، یعنی مصر۔

مصر کے چرکسی بادشاہوں میں سے ایک برسبائی تھا، اس نے سنہ ۸۲۵ھ سے سنہ ۸۴۱ھ تک حکومت کی ہے، اس کا شاہی لقب الملک الاشرف تھا، یہی اشرف اشرفی کا معدن ہے، مشہور عرب جہازراں ابن ماجد اسد البحر نے جس نے سنہ ۹۰۴ھ (۱۴۹۸ء) میں واسکوڈی گاما کو ہندوستان پہنچایا تھا، الفوائد فی اصول البحر والقواعد کے نام سے جہازرانی پر ایک کتاب لکھی ہے، جو چند سال ہوئے کہ فرانس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے اسکا زمانہ نویں صدی ہجری کا اخیر اور دسویں صدی ہجری کا شروع تھا، یہ بحر ہند اور بحر عرب کا ایک نڈر جہازراں تھا، گجراتی ہندو بنیا بیوپاریوں کی طرف سے اس کو کنکا کا سنسکرت خطاب ملا تھا جس کے معنی ماہر ریاضی داں کے ہیں (دیکھو میری کتاب عربوں کی جہازرانی ص ۱۳۰۔۱۳۷)، اس کی اسی کتاب کے مطالعہ سے اشرفی کا بھید مجھے معلوم ہوا، ابن ماجد ایک

خاص سلسلہ میں لکھتا ہے ۔

والحادی عشر بر سبیل الاشرف	گیارہواں بادشاہ برسبائی اشرف
ضارب سکۃ الاشرفی	ہے جو اشرفی سکہ کا چلانے والا
(ص ۴۰ طبع پیرس)	ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی سکہ مصر سے چل کر بحر ہند میں داخل ہوا تھا اور یہاں سے پورے ہندوستان میں پھیل گیا، ابن ماجد نے اپنی یہ کتاب ۸۹۵ھ میں لکھی ہے۔ اور اس سکہ کے بانی کا ذکر کیا ہے، اور فرشتہ نے اپنی اصل کتاب اس کے بیس برس بعد ۹۱۵ھ میں لکھی اور "اشرفی علائی" کا نام لیا ہے، یعنی علاء الدین خلجی کے وقت کی اشرفی، حالانکہ خلجی کے زمانہ میں اشرفی کا نام بھی پیدا نہیں ہوا تھا، مگر یہ ایسا ہی ہے، جیسے ہم پرانے زمانہ کے بادشاہوں کے سونے کے سکوں کو یا انگریزی پونڈ کو اشرفی کہہ دیتے ہیں۔

بیمہ۔ روپے اور اشرفی کی تقریب سے وہ طریقہ یاد آیا جس سے قیمتی چیزیں محفوظ کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر بذریعہ ڈاک بھیجتے ہیں، جس کو ہم آپ بیمہ کہتے ہیں۔ خیال یہ تھا کہ یہ ڈاک کے نئے طریقوں میں سے ہے، اور یہاں سے یہ نئے طریقے آئے ہیں وہیں سے یہ لفظ بھی بگڑ کر آیا ہے، مگر اتفاق سے سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ کا قلمی نسخہ نظر سے گذرا، جو عالمگیری عہد کی تصنیف ہے، ۱۱۰۷ھ میں عالمگیر کی تخت نشینی کے چالیسویں سال مرتب ہوئی ہے۔

سجان رائے اہل ہند کی دیانت اور امانت داری کی دلیل میں یہاں کے مہاجنوں کے ذریعہ سے ترسیل زر کا حال لکھتا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"لین دین میں یہاں کے لوگوں کی سچائی کا یہ حال ہے کہ کوئی لکتا ہی نا آشنا اور

وشجان ہو، گواہی اور شہادت کے بغیر ہزاروں روپئے امانت صرافوں کے حوالے کردیتا ہے یہ صراف بھی ایسے سچے ہوتے ہیں کہ جب اُن سے امانت واپس مانگیے، بلا حیلہ حوالہ کئے بے توقف واپس کر دیتے ہیں، اور طرفہ یہ کہ اگر کوئی دور دراز راستوں کے ڈر سے اپنا نقد روپیہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکے تو وہ ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ دیانت دار صراف ان روپیوں کو اپنی تحویل میں لے کر ہنڈی میں اپنے کارندوں کے نام جو ہر شہر میں ان کی طرف سے سچائی کی دکان کھولے رہتے ہیں، ایک پرچہ لکھ کر دیدیتے ہیں، اس کو یہاں کی زبان میں ہنڈی کہتے ہیں، یہ کارندے اگرچہ سیکڑوں میل کی مسافت ہو اس پرچہ کو دیکھنے کے ساتھ بلا حجت اس کو روپیہ دیدیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس پرچہ کو جو کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے، اگر مقررہ مقام کے علاوہ مالک کسی دوسری جگہ بھیجا جا سکے تو اُتنے ہی روپئے اس کو مل جائیں گے صرف یہ ہوگا کہ خریدنے والا تھوڑا کمیشن (منافع) اس سے لے لیگا۔"

اب اس کے بعد اصلی فقرہ آتا ہے۔

"وعجیب تر آنکہ اگر تاجران بسبب طرق ہائلہ امتعہ و دیگر اموال آنہا بجنس در قرارگاہ سلامت رسانیدہ بمالکان عائد می نمایند، و آں را بزبان ایں مردم بیمہ گویند۔"

اس عبارت سے یہ معلوم ہوگیا کہ پہلے ہندوستان میں منی آرڈر بھیجنے، بنک چیک استعمال کرنے، اور قیمتی چیزوں کو ہمیشہ کسی دوسری جگہ بیمہ کر کے بھیجنے کا کیا طریقہ تھا، اور اس سے لفظ "بیمہ" کی قدامت کا حال بھی معلوم ہوا۔

"بزبان ایں مردم بیمہ گویند۔" اس سے خیال ہوتا ہے کہ کوئی ہندی یا سنسکرت کا لفظ ہوگا، مگر میں نے ہندی اور سنسکرت کے عالموں سے اس کی تحقیق چاہی تو کوئی اس کا پتہ نہ بتا سکا،

اس سے وہم ہو جاتا ہے کہ یہ فارسی لفظ "بیم" بمعنی خوف سے نہ لیا گیا ہو، سبحان لال نے اس بیان کا آغاز ان لفظوں سے کیا ہے۔

"دطرفہ آنکہ اگر بنا بہ خوف مسالک ممالک شخصے سلعہائے نقد بمسافت دور و نزدیک نخواند برد۔"

اس لفظ "خوف" سے بھی ادھر ہی خیال جاتا ہے، اگر مشکل یہ ہے کہ فارسی لغت کی کتابوں میں یہ لفظ نہیں ملتا، انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں سید تصدق حسین نامی ایک بزرگ نے لغات کشوری کے نام سے ایک فارسی لغت منشی نولکشور صاحب کے نام سے لکھا ہے، اور نولکشور پریس میں ۱۹۰۰ء میں چھپا ہے، مولف نے مقدمہ میں یقین دلایا ہے کہ تمام لغات دیکھکر بڑی احتیاط سے یہ لغت لکھا گیا ہے، اس میں "بیمہ" کے لفظ کے نیچے اس کو فارسی بتاکر یہ تشریح لکھی ہے۔

"بخوف بہ ہرنی جو کسی ساہوکار کو محصول کسی نقد یا مال کے پہنچانے کا دیں اور وہ اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہو۔"

لغاتِ کشوری کی امانت ودیانت کا اگر اعتبار کیا جائے تو پھر بیمہ کے فارسی ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔

ڈاک۔ بیمہ کے ذکر سے سب کا خیال ڈاک، ڈاک خانہ اور ڈاک گھر کی طرف چلا گیا ہوگا، توقع ہے کہ آپ کے اس حسن التفات سے ہم فائدہ اٹھائیں، تعجب ہوگا کہ اس ڈاک کا ہمارے لغت میں پتہ نہیں۔

عربی میں ڈاک کے لئے برید کا لفظ استعمال ہوتا ہے، مسلمانوں میں امیر معاویہ نے سب سے پہلے اس نظام کو قائم کیا، اور برید اس کا نام پڑا، ہمارے عجمی اہل لغت نے

اس کو فارسی بریدن سے لیا اور بتایا کہ چونکہ ڈاک رکھنے والے دم بریدہ یعنی دُم کٹے گھوڑے کام میں لائے جاتے تھے، اس لئے ڈاک کو بریدہ کہنے لگے، حالانکہ اگر یہ اشتقاق درست بھی ہوتا تو زبر کے بجائے بے کو پیش ہونا چاہیئے تھا، اب نئی تحقیق یہ ہے یونانی اور لاطینی سے عربی میں آیا ہے، اور ویریڈا اس کی اصل ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ پہلے یہی لفظ آیا، پھر ترکی لفظ اولاغ چلا، (برنی ص ۴۴۷ کلکتہ) مگر فوراً ہی اس کی جگہ ایک ہندوستانی لفظ نے رواج پایا، اور وہ لفظ دھاوا ہے، چنانچہ تغلقوں کی تاریخ میں یہ لفظ بولا گیا ہے، ابن بطوطہ نے سفرنامہ میں بعینہٖ یہی لفظ لکھا ہے (۲ ص ۱۴ مصر) برنی نے فیروز شاہی میں اسی لفظ کا استعمال کیا ہے، (ص ۴۴۷ کلکتہ)

مگر اس کو دھاوا کیوں کہتے تھے؟ اس کا پتہ ہم کو اپنوں سے نہیں بلکہ ابن بطوطہ جیسے بیگانے سے چلتا ہے، وہ کہتا ہے کہ دھاوا کے معنی اہل ہند میں تہائی میل کے ہیں، چونکہ یہ ہرکارے ہر تہائی میل پہ ٹھہرے ہوتے تھے، اس لئے اس کو دھاوا کہتے تھے، اور استعمال سے راستے کے بجائے خود راستے والے پیادے کو دھاوا کہنے لگے، لیکن عزیب ناآشنا زبان کو اس میں غلط فہمی ہوئی ہے، دھاوا کے معنی سنسکرت میں دوڑنے کے ہیں، چونکہ یہ دوڑ کر چلتے تھے اس لئے ان کی چال کو دھاوا کہنے لگے، پھر خود دھاوا ہو گئے۔ اور ہر تہائی میل پہ جہاں ٹھہرتے تھے وہ دھاوا ہو گیا۔

دھاوے کے ان پیادوں کی چوکیاں ہر تہائی میل پہ دلی سے لیکر دولت آباد تک بنی ہوئی تھیں، پیادہ گھنگرودار لاٹھی کو کندھے پہ رکھ کر تیزی سے دوڑتا ہوا اگلے دھاوے

ف مولوی غلام مصطفےٰ خاں لکچرر ناگپور ڈکالج امراؤتی براہ مطلع فرماتے ہیں کہ برار میں دھاڑے کے معنی دو منزلہ مکان کے ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ چوکیاں دو منزلہ ہوتی ہیں۔

پہنچتا تھا، وہاں دوسرا پیادہ گھنگرو کی آواز سن کر تیار رہتا تھا، وہ فوراً اس سے ڈاک لے کر گھنگھرو کے دھاوے کو دوڑاتا تھا، اس طرح سندھ سے دلی ۵ دن میں ڈاک پہنچتی تھی (ابن بطوطہ)

اس دھاوے کی یادگار ہماری زبان میں دھاوا کرنا، دھاوے پر چڑھنا، دھاوا بول دینا اور دھاوا مارنا، آج بھی موجود ہے، اور دھاوے کے پیادے کو پاٹک کہتے تھے، جو پیک کی صورت میں محرم کی تقریب میں امام کے نقلی قاصدوں کا ہم نے نام رکھا ہے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آل تیمور نے جب ہندوستان پر دھاوا کیا تو یہ لفظ یہاں سے مٹ چکا تھا، چنانچہ اکبر کے زمانہ میں جب بدایونی نے اس لفظ کو استعمال کیا تو اس کو اس کے ترجمہ کی ضرورت ہوئی، سلطان محمد تغلق کے حال میں کہتا ہے۔

"در سنہ ۷۲۲ھ سلطان محمد تغلق عزیمت دیوگر کردہ از دہلی تا آنجا بسر کردہ دھادہ

یعنی پالکاں خبر دار نشاندہ"

فرشتہ نے جہانگیر کے زمانہ میں اپنی کتاب لکھی تو "دھاوہ" کا لفظ مٹ کر ڈاک چوکی کا لفظ پیدا ہو چکا تھا، مگر کہتا ہے کہ اس کو پہلے یام (یام) کہتے تھے، سلطان علاء الدین کے حال میں لکھتا ہے :-

"از دہلی تا آنجا ڈاک چوکی کہ زبان سلف یام می گفتند می نشاند"

یہ یام فارسی استعمال میں ہے اور دکن میں اس سے لے کر پونا تک اس کے لئے پٹہ ٹپال اور پٹہ خانہ بولا جاتا ہے، ریاست حیدر آباد کا سرکاری لفظ یہی ہے

بہر حال ڈاک کا لفظ جہانگیر کے عہد میں یا اس سے کچھ پہلے سے بولا جانے لگا، اس کی اصلیت پر میں غور کرتا رہا ہوں، میرا خیال ہے کہ اس کے معنی منزل کے ہوں گے چونکہ یہ منزل بمنزل جاتے تھے، اس لئے اس کو ڈاک کہنے لگے، اور اس کے ہر پڑاؤ کو ڈاک چوکی

چوکی بھی پہرہ جس کی ایک یادگار چوکیدار ہمارے پاس موجود ہے، اسی لئے انگریزوں نے اسی اصول پر بنگال سے الہ آباد تک اپنے منزل بمنزل سفروں کے لیے جو مختصر قیامگاہیں بنائیں اس کو ڈاک بنگلہ کہا، اور اب بھی وہ یہی کہے جاتے ہیں، اور اگر لغت گھڑنے کا الزام نہ قائم کیا جائے تو جی چاہتا ہے کہ یہ کہوں کہ ہندوستان و افغانستان کی سرحد پر ڈکہ اور بنگال کی حد پر ڈھاکہ، اور دوسری طرف موتی ہاری میں نیپال کے پاس ددسلہ ڈھاکہ اسی منزل گاہ کے باقی نشان ہیں، بہرحال منزل نے راستے کی اور راستہ نے خط و لفافہ اور اشیائے ڈاک کی صورت میں اختیار کی، اور اب وہ ریل گاڑی جو بہت کم منزل کرتی ہے مگر ڈاک لے کر چلتی ہے، ڈاک گاڑی کہلاتی ہے، ڈاک کے پچھلے معنی کی یادگار ڈاک بٹھانا، ڈاک لگانا، یعنی جلدی جلدی منزل بمنزل یا ہاتھوں ہاتھ چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا رہ گیا ہے۔

فیض ساقی نے مرے ڈاک لگا رکھی ہے،

روح ہے ہر جسم میں مشتاقِ اخبارِ اجل (رد اسیخ)

اس لئے یہ آمد و رفتِ نفس کی ڈاک ہے، (ناسخ)

اسی سے ڈاک بولنا بھی ایک محاورہ ہے، یعنی نیلام میں منزل بمنزل کسی چیز کی قیمت بڑھانا۔

کچھ دن ہوئے ایک قلمی ہندوستانی فارسی لغت برادرم پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (اسماعیل کالج بمبئی) کے پاس نظر سے گذرا، یہ لغت کسی ایرانی یا پارسی نے لکھا ہے، تالیف کا سنہ نہیں معلوم، اس میں ایک لفظ ڈانکیہ دیکھا جس کے معنی نقیب کے لکھے ہیں، نقیب شاہی درباروں میں درباریوں کو باادب رہنے کیلئے زور سے آواز لگایا کرتے تھے، ڈانکنا کے معنی زور سے آواز نکالنے کے ہیں، اس سے دوسرا خیال یہ ہوتا ہے

کہ ڈاک کی اصل ڈانک اور ڈاکیہ کی ڈانکیہ ہے، چونکہ ڈاک کا ہرکارہ آواز دیتا ہوا چلتا تھا اس لئے اس کو ڈانکیہ اور اس کے کام کو ڈانک کہا گیا، اور ڈانک نے ڈاک کی صورت بدل کر منزل بمنزل رفتار کے معنی اختیار کر لئے۔

اگلے زمانہ میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اڑا دیئے تھے، اس نسبت سے ایک اڑتی سی بات کبوتر ہی سے ایک ملتے جلتے پرندے کی نسبت سن لیجئے۔

قمری۔ ہماری زبان میں ایک خوش نوا پرندے کا نام قمری ہے۔ یہ نام عربی فارسی سے آیا ہے، مگر اس کی اصلیت کے بتانے سے یہ دونوں زبانیں قاصر ہیں، فارسی کے خالص لغتوں میں یہ لفظ سرے سے نہیں، مؤید الفضلا میں جو عربی آمیز فارسی الفاظ کا پرانا لغت ہے، یہ لفظ ملتا ہے، اور تاج نام کسی لغت کے حوالے سے لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہیں پھر اس سے اختلاف کیا ہے کہ فاختہ اور چڑیا ہے اور قمری اور فاختہ کا رنگ خاکستری ہوتا ہے، اور اس کی آواز یکے تو یا کو کو کی ہوتی ہے، گلے میں طوق ہوتا ہے۔ اور قمری کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک سفید کافوری اور دوسری صندلی اور اس کی آواز سے یا غفور کی صدا نکلتی ہے۔

تاج کے مشہور نام سے تو جوہری کی تاج اللغۃ کی طرف خیال جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جوہری نے قمری کا ذکر کیا ہے، مگر یہ نہیں لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہیں۔ بہرحال یہ فارسی نہیں، عربی بھی نہیں، کیونکہ اول تو عرب اس سے واقف نہ تھے، ان کے شعروں میں اس کا ذکر نہیں، قدیم عربی لغت میں یہ مذکور نہیں، اس کی ساخت اصل عربی لفظ کی نہیں۔ اس کے آخر میں جو یائے مشدد ہے وہ نسبت کو ظاہر کرتی ہے، اور اسی نسبت کی طرف

اکثر اہل لغت گئے ہیں، جوہری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قُمر سے مشتق ہے جس کے معنی سپیدی کے ہیں، اور اس سے صفت بنی اقمر بمعنی سپید، اس اقمر کی جمع ہوئی قُمر، جیسے احمر سے حُمر، اور اب یہ ہوا کہ سپید پرندوں کو جمع کے ساتھ یوں بولے طیر قُمر، اب اس جمع کا واحد جب مراد ہوا تو جمع کی طرف یائے نسبت دے کر قمری واحد بنا لیا، جیسے روم سے رومی، زنج (زنگ) سے زنجی (زنگی)، مگر اس تحقیق میں بڑی کھینچ تان معلوم ہوتی ہے، عربی میں اس محنت سے کسی اور پرندے کا نام نہیں رکھا گیا۔

مجد فیروز آبادی نے قاموس میں قمریہ لکھا ہے، اور بتایا ہے کہ کبوتر کی ایک قسم ہے، مرتضیٰ زبیدی (بلگرامی) نے تاج العروس میں لکھا ہے کہ مجد نے یہ محکم زمخشری سے لیا ہے بعضوں کا دعویٰ ہے کہ قمری عربی کا قدیم لفظ ہے، اس کی جمع قمر، ابو حاتم نام ایک جاہلی عرب شاعر کے کلام میں ہے۔ فما قرقر قمر الواد بالشاحق

مگر اس کا کوئی دوسرا شاہد نہیں۔

قمری کے آخر میں جو ی ہے، اس کو کوئی صاحب یائے مبالغہ سمجھتے ہیں، مگر اکثروں کی رائے یہی ہے کہ یہ یائے نسبت ہے، اب یہی یہ بات کہ کس کی طرف نسبت ہے، تو بعض لوگ اس کو اس نام کے ایک پہاڑ کی طرف نسبت سمجھتے ہیں، اور بعض اس نام کے کسی مقام کا ذکر کرتے ہیں، علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں اوپر کی تفصیل بتا کر لکھا ہے کہ ان کے استاذ نے شرح کفایہ میں اس کی تحقیق کی ہے۔

اب اہل لغت کے دربار سے اٹھ کر ہم آوارہ گرد جغرافیہ نویسوں کے مسافر خانوں میں پہنچتے ہیں، یاقوت رومی معجم البلدان میں قمر نام کے ایک مصری شہر کا ذکر کرتا ہے، اور ابن الفارس سے نقل کرتا ہے کہ قمری پرندہ اسی شہر کی طرف منسوب ہے، مقریزی خطط

مصر میں دریائے نیل کے منبع کی تلاش میں نکلتا ہے اور بحر ہند کے جزیروں کو دیکھتا بھالتا چلتا ہے، اور اسی اثنا میں جزیرہ قمر کا ذکر کرتا ہے، اور یہیں کا دوسرا نام جزیرہ ملائی بتاتا ہے، جس کو آج ہم ملایا کہتے ہیں۔ انہی میں سے ایک جزیرے کا نام قمریہ بتایا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے۔

والیھا ینسب الطائر القمری (ص۵ مصر) اور اسی جزیرہ کی طرف قمری پرندہ منسوب ہے۔

البیرونی نے کتاب الہند میں ملایا کے کچھ جزیروں کا نام قمیر[1] بتایا ہے، (صفحہ ۲۰۱)

پرندوں کے نام ان مقاموں کی نسبت سے رکھنا، جہاں سے پہلے پہل وہ پرندے کسی خوش مذاق کو ہاتھ آئے ہوں، عام بات ہے، ترکی، چینی، شیرازی وغیرہ اسکی مثالیں ہیں۔
اتنی مسافت طے کرنے کے بعد ذرا استانے کے لیئے غالب کے اس شعر کا مطلب حل کیجئے۔

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ　　　اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

فارسی شاعروں نے گل و بلبل کی طرح سرو و قمری میں محبت کا رشتہ جوڑا ہے۔

قمریاں پاس غلط کردہ بخود می دارند　　　ورنہ یک سرو دریں باغ بآرام تو نیست

ایک اور پائے نسبت حل طلب ہے۔

سوسی - ہمارے ملک میں رنگین باریک دھاریوں کا ایک سوتی کپڑا ہوتا ہے جس کو سوسی کہتے ہیں، اسلامی زمانہ کے اکثر چھپے ہوئے کپڑوں کے نام یا تو کاریگر کے نام یا مقام

---

[1] ہمارے دوست ڈاکٹر تاراچند نے بتایا ہے کہ انگریزی و فرنچ میں۔ اس کو اب بھی کھمیر KHMER کہتے ہیں۔

یا اس امیر یا بادشاہ کے نام یا اس کام کے نام پر رکھے جاتے تھے جو اس کپڑے میں خاص طور سے کیا جاتا تھا، جیسے تافتہ، بافتہ، زری، کارچوبی وغیرہ یا مظفری، محمودی، علی قلی خانی وغیرہ یا کاشانی، بنارسی، بھاگلپوری وغیرہ، انگریزی میں ململ کو جو مسلین کہتے ہیں وہ موصل کی طرف نسبت ہے۔

سوسی نہ تو شخص کا نام ہے نہ ہندوستان کے کسی مقام کا، یہ تو ظاہر ہے کہ اس کی نسبت سوس کی طرف ہے سوس کے نام سے ایک شہر ترکستان میں ہے، اور دوسرا مغرب اقصیٰ یعنی ملک مراکش میں ہے، مگر یہ دونوں پارچہ بافی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے، لیکن ہے یہ واقعی شمالی افریقہ کے ایک صنعتی مقام کا نام، اس کا نام سوسہ ہے، یہ عربوں کی ترقی کے عہد میں پارچہ بافی کا بڑا مرکز تھا، اور یہاں کے بنے ہوئے کپڑوں کو سوسی کہتے تھے، پھر اس نمونہ پر جہاں جہاں کپڑے بنے جانے لگے ان کو سوسی ہی کہنے لگے، یہ گویا ایک طرز کا نام ہو گیا، یہ کپڑے کبھی اس شان کے بنے جاتے تھے کہ ان کے ایک ایک تھان کی قیمت آٹھ آٹھ اشرفی ہوتی تھی، جغرافی ڈکشنری معجم البلدان کا مصنف یاقوت حموی رومی جس نے ۶۲۶ھ میں وفات پائی ہے، سوسہ کے ذکر میں لکھتا ہے، (لفظ سوسہ)

"صحیح یہ ہے کہ سوسا ایک چھوٹا شہر افریقہ کے اطراف میں ہے..... یہاں کے اکثر باشندے کپڑا بننے والے ہیں۔ یہ بیش قیمت (یا باریک) سوسی کپڑے بنتے ہیں، اور جو کپڑا دوسری جگہوں پر ویسا بنا جاتا ہے وہ ان ہی کی نقل ہے، (یا ان ہی کے مشابہ ہے) ان میں ایک تھان کی قیمت وہاں دس دینار ہے...... اور جو دھاگا وہاں کتتا ہے اس کے ایک مثقال کی قیمت دو مثقال سونا ہے"

لیکن ہماری ہندوستانی سوسی بہت سستی ہے، اور غریبوں کی ستر پوشی ہے۔

اکثر غریب عورتوں کے پاجاموں میں کام آتی ہے، چیز وہ نہیں رہی، طرز وہی ہے، وہ ریشمی ہوگی، یہ سوتی ہے۔

ایک مجہول یائے نسبت ہمارے ایک خوش ذائقہ کھانے میں بھی ہے۔

فیرنی۔ یہ ہمارے کھانے کی ایک لذیذ قسم ہے، جس کے مزے سے ہم سب واقف ہیں، مگر اس کی لفظی اصلیت سے ہم سب ناواقف ہیں، پتہ یہ چلتا ہے کہ فرنی اصل میں فُرنی (بالضم) ہے، چوتھی صدی کا مصنف محمد خوارزمی جو غزنویوں کا معاصر تھا، اپنی کتاب مفاتیح العلوم میں[1] بیماروں کی غذاؤں کے سلسلے میں فُرانی کا نام لیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس غذا کی تیاری کی صورت یہ ہے کہ وہ مختلف شکلوں کی موٹی تنوری پھولی ہوئی (پاؤ روٹی کہیے) روٹی کو دودھ میں بھگو کر شکر ڈال کر تیار کی جاتی ہے۔ (نان بہ شیر کہیے) اس کا واحد فرنی ہے اس کو فرنی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ موٹی روٹی تنور میں جس کو عربی میں فرن کہتے ہیں، تیار ہوتی ہے، گویا فرنی کو تنوری کے معنوں میں سمجھیے، ہندوستان کا اثر یہ ہے کہ موٹی پھولی ہوئی روٹی کے بجائے اس میں چاول ڈالے لگے اور اب شکر قند ہو، سابو دانہ ہو، جس چیز کو آپ، دودھ شکر میں پتلا کر کے بنالیجیے وہ فرنی ہے، مگر اسی کے ساتھ اتنی ترمیم اور کیجیے کہ ف کو پیش کی جگہ زیر دیجیے۔

یہی مصنف ہمارے بھات کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتا ہے جن سے کھیر کی خوشبو آتی ہے وہ کہتا ہے بھتّہ (بھتہ) سندھی لفظ ہے، چاول میں دودھ اور گھی ڈال کر بناتے ہیں، کھیر اور شیر (دودھ) ایک ہی چیز ہے، سنسکرت میں دودھ کو کشیر اور سندھی میں کھیر کہتے ہیں جس سے ہماری یہ کھیر بنتی ہے اور اسی لیے کھیر کہلاتی ہے، بھات سے بھاتی کا لفظ نکلا ہے، جو مستعمل

---

[1] ص ۱۶۶، لیڈن۔

سے کھلنے کو کہتے ہیں، کیوں صاحبو! انگریزی ملازموں کا بھتہ اسی بھارت سے تو نہیں ہے جس کا آغاز بنگال کے انگریزی نوکروں سے ہوا ہو؟ اور اس کے معنی خرچ خوراک کے ہیں۔

۱۷۶۵ء سے ۱۷۶۷ء تک لارڈ کلائیو نے جو اصلاحات کیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سپاہیوں کو تنخواہ کے علاوہ "بھتہ" دیا کرتی تھی، کلائیو نے اس زمانہ میں اس کو بند کر دیا۔ اس واقعہ سے بھی اس لفظ کا اصل تعلق بنگال سے ثابت ہوتا ہے۔

رقم۔ اس بھتہ سے لوگوں کو اچھی خاصی رقم ہاتھ آتی ہے، کبھی آپ دوسروں کے ذمہ اپنی رقم نکالتے ہیں، اور کبھی دوسرے آپ کے ذمہ مگر کبھی آپ نے یہ سوچا کہ یہ "رقم" آپ کو کہاں سے ہاتھ آیا؟ آج ہم رقم روپئے کی ایک مقدار کو کہتے ہیں، رقم کا لفظ یقیناً عربی ہے مگر اس معنی میں نہ عربی میں مستعمل ہے نہ فارسی میں بلکہ یہ خاص ہندوستانی ہے۔

رقم کے معنی عربی میں نشان بنانے کے اور کپڑے کی دھاری کے ہیں، حدیث میں ہے، الارقما فی ثوب اس سے لکھنے کے معنی ہوئے جیسے کالرقم علی الماء، عربی میں حساب اور ریاضیات کی کتابوں کے ترجمے ہوئے تو عدد کے نشان کے لیے رقم کا لفظ پسند کیا گیا۔ اور اس پسندیدگی کی وجہ شاید یہ ہے کہ رقم اور قلم ایک قافیہ کے لفظ ہیں، اور قلم خط یا اسکرپٹ کے معنی میں استعمال ہو چکا تھا، اس لیے اسی کے وزن کا لفظ رقم اعداد کے لیے مناسب معلوم ہوا، یہ جمع کے ساتھ اقلام اور ارقام بولے جاتے تھے۔

بیرونی نے کتاب الہند میں خطوط اور ارقام استعمال کیا ہے (ص ۸۷) اسی سے اعداد کے علامات خصوصاً روپیہ کے اعداد کے علامات کے لیے جو خاص ہندوستان کی چیز ہے، ارقام ہندیہ مستعمل ہوا، اور جب حساب کی اصطلاح میں ارقام اور رقم کا لفظ آ گیا تو نقد روپیہ کے لئے اس کا استعمال پا جانا کتنی بڑی بات تھی۔

ہندسہ ـ رقم سے "ہندسہ" کی طرف خیال گیا چونکہ ارقام "ہند" سے عربی میں لئے گئے ہیں۔ اس لئے عوام ہندسہ کو زبر کے بجائے زیر دے کے ہندسہ بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہ "ہند" سے ہے اس لئے ہندسہ ہے، اور تعجب ہے کہ خوارزمی کے الجبر والمقابلہ کا انگریزی مترجم فریڈرک روزن تک اس وہم میں مبتلا ہے (ص ۱۹۶ و ص ۹۷ الجبر المقابلہ انگریزی سنہ ۱۸۳۱ع) فارسی لغت برہان قاطع کے مصنف بھی اسی غلطی میں گرفتار ہیں، کہتے ہیں۔

"ہندسہ بکسر اول وثالث وفتح سین بے نقطہ بمعنی اندازہ و شکل باشد و ارقامے را نیز گویند کہ در زیر حروف کلمات نویسند چوں ابجد ہوز حطی"

یہ بیان تمام تر غلط اور غلط ہے ہندسہ بفتح اول وثالث ورابع بروزن فَعلَلَہ فارسی لفظ "اندازہ" کا عربی بنایا ہوا مصدر ہے، معنی اندازہ کرنا، اور اس سے مراد عمارت کا ناپنا اور نقشہ بنانا یعنی فن تعمیر ہے جس کو آج انجنیرنگ کہتے ہیں، بعضوں نے اس کو فارسی "اندیشہ" کا معرب بنایا ہے، مگر یہ صحیح نہیں، خوارزمی (چوتھی صدی) مفاتیح العلوم میں کہتا ہے۔

اما الھندسۃ فکلمۃ فارسیۃ	لیکن ہندسہ، تو یہ فارسی لفظ کا معرب
معربۃ وفی الفارسیۃ	ہے۔ فارسی میں اندازہ ہے، یعنی
انداذہ ای المقادیر قال	مقدار، خلیل نے کہا ہے کہ مہندس
الخلیل المھندس الذی	وہ ہے جو نہروں کے نکلنے کا اندازہ
یقدر مجاری القنیّ ومواضعھا	و پیمائش کرتا ہے تاکہ نہریں کھودی
حیث تحفر وھی مشتقۃ	جائیں، اور ہندزہ سے بنا ہے، اور

ل افسوس ہے کہ میری کتاب عرب و ہند کے مصحح نے اپنی غلط تصحیح سے میرے صحیح کو غلط کر دیا ہے۔ دیکھو کتاب مذکورہ مطبوعہ اکاڈیمی ص ۱۴۵۔

من الهندزة وهي فارسية فصيرت الزاي سينا لأنه ليس بعد الدال زاي في كلام العرب (ص ۲۰۲ لیڈن)

وہ فارسی ہے تو "ز" کی جگہ "س" بنے سے لی۔ کیونکہ عربی میں دال کے بعد "ز" نہیں ہے۔

ریاضیات۔ ہندسہ سے ریاضیات کی طرف ذہن نے کروٹ لی، عربی میں روض کے دو معنی ہیں، زمین کی سرسبزی و شادابی اس نے باغ و بہار کا مفہوم پیدا کیا، اور ریاض جنت کے پھول کھلائے، دوسرا مفہوم سواری کے جانوروں کے اور خصوصاً گھوڑے کے سدھانے، سکھانے اور پھیرنے کا ہے، عربی میں فعالۃ کا وزن پیشہ، فن اور صنعت کے کام آتا ہے، اس سے ریاضۃ بنکر گھوڑا پھیرنے کا فن یا پیشہ پیدا ہوا، گھوڑے کو پھیر کر سیدھا اور شائستہ بنانے سے صوفیہ نے نفس کو رام کرکے شائستہ بنایا اور ریاضت روحانی اس کا نام رکھا ادھر گوشت و پوست اور جوڑ بند کے حسن کے شائقوں نے جسمانی مشق و ورزش کو ریاضت جسمانی کہا، اہل علم کیوں چپ رہتے، انھوں نے حساب و ہندسہ وغیرہ منطقی علوم کو ریاضیات کا خطاب دیا، جاہل اہل پیشہ نے کہا کہ ہم کو بھی اپنے کاموں میں محنت کم نہیں پڑتی۔ انھوں نے بھی اپنی صنعت کاری اور دیدہ ریزی کا نام ریاض رکھا، لیکن اس معنی میں یہ خالص ہندوستانی ہے۔

عرب حکیموں نے ریاضیات کو ریاضیات کا لقب کیوں دیا؟ جبکہ ریاضیات کی خصوصیت نہیں، ہر فن مشق کا محتاج ہے، اصلیت یہ ہے کہ ہندیوں کی طرح یونانیوں میں بھی بچوں کی تعلیم کا آغاز ریاضیات سے ہوتا تھا، اسی لئے جب شروع شروع میں عربی میں یونانی علوم آئے تو ریاضیات کا نام تعلیمیات پڑا، کیونکہ تعلیم کا آغاز اسی سے ہوتا

ہے، اب عربی فلسفہ میں اس اصلاح کا اثر اتنا ہی رہ گیا ہے کہ مقدار مطلق کا نام اس میں اب بھی "جسم تعلیمی" ہے، لیکن تعلیمات کی جگہ بہت جلد اس سے بہتر لفظ ریاضیات نے لے لی، اس لئے کہ بچوں کی مشقی تعلیم اسی سے شروع ہوتی ہے

علامہ شریف جرجانی اپنی تعریفات میں "جسم تعلیمی" کے نیچے لکھتے ہیں۔

"ویسمی جسما تعلیمیا اذ یبحث عنہ فی العلوم التعلیمیۃ ای الریاضیۃ

.... منسوبۃ الی التعلیم والریاضۃ فانھم کانوا یبتدئون بھا

فی تعالیمھم وریاضتھم لنفوس الصبیان"۔

سیاست - ریاضت کے وزن پر سیاست ہے، اور آجکل کیا کہنا کہ ساری دنیا میں اسی کی بہار ہے، مگر معلوم ہے کہ اس کی اصلیت کیا ہے، لغت میں اس کے اصلی معنی جانوروں کی دیکھ بھال اور نگرانی ہے اور اسی سے امیر کی اپنی جماعت کی اور بادشاہ کی اپنی رعایا کی نگرانی اور خدمت کا مفہوم پیدا ہوا، ظالم بادشاہوں کے ظلم نے اس کے معنی بدل دیئے اسی سے "سیاست کردن" سزا دینے کے اور اردو میں قہر و غضب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

خوبی اللہ اس کا محکمہ میں حشر کے لے گا

کرے گا جو سیاست حاکم ظالم رعیت پہ

سیاست کے لفظ کو یہاں ذکر کرنا کچھ اتنا ضروری نہ تھا۔ مگر مجھے یہ اصل تفسیری قبلو آنلڈ (ماسوف علیہ) کی تحقیق سے اختلاف مقصود تھا، سواء السبیل فی معرفۃ المولدۃ الدخیل میں وہ کہتے ہیں کہ سیاست ترکی سے ہے، چنگیز خاں تمام اپنی اولاد کے لئے چند ملکی قاعدے بنائے تھے - ان کا نام "سہ یاسہ" تھا، اسی سے عربی میں سیاست آیا ہے، مگر یہ

خیال قطعاً غلط ہے یہ لفظ عربی میں اتنا پرانا ہے کہ حدیث تک میں موجود ہے، ان الناس کان یسوسھم الانبیاء (صحیح مسلم) پہلی صدی ہجری کے آخر میں محمد بن قاسم نے جب ۱۷ برس کی عمر میں سندھ فتح کیا تو ایک شاعر نے اس کی مدح میں کہا، ساس الرجال لسبع عشرۃ حجۃ (اس نے ۱۷ برس کی عمر میں لوگوں کی سیاست کی) ابن ندیم نے فہرست میں جو ۳۷۷ھ میں تاتاریوں سے صدیوں پہلے لکھی گئی "سیاسیات" کا لفظ سیاسی ملکی کتابوں کے معنوں میں استعمال کیا ہے، پھر قدیم کتب لغت میں اس کی اصل موجود ہے۔

ہاں اپنی زبان کے تعلق سے یہ کہنا رہ گیا کہ ہماری زبان میں سائیس اور سئیس کا لفظ اسی سیاست سے بنا ہے، اس کی اصل سائس ہے، مگر پیشے اور نوکری کے لحاظ سے سائیس کا یہ عہدہ خالص ہندوستانی ہے، نہ عربی ہے اور نہ فارسی، مگر شوخی معاف! آپ نے یہ دیکھا کہ سیاسی اور سئیس، دونوں کی اصل ایک ہی ہوئی، دونوں نگرانی اور نگہبانی کرتے ہیں سیاسی آجکل جس کو کہتے ہیں ہمارے تازہ دکھنی نوجوانوں نے اس کے لیے سیاس کا ایک نیا لفظ گھڑا ہے، مگر بالکل بے اصل اور بے قیاس ہے، یہ لفظ واوی ہے یائی نہیں سیاست اور سیاسی کی "ی" "و" سے ہوا ہے، مگر "واو" کی جگہ "ی" قاعدے سے ہے اور سیاس میں واو کی جگہ ی بے قاعدہ ہے، اگر یہ لفظ بن بھی سکتا تو سواس ہونا، سیاس نہیں، اب یہ سیاس جبتک چل نہ جائے غلط العام فصیح کے حدود میں نہیں آسکتا۔

بحث "سیاسیات" کی خطرناک الجھنوں میں پڑکر خطرناک ہو رہی ہے، اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔

(ہندوستانی جولائی ۱۹۲۸ء)

(۲)

اس مضمون کا پہلا نمبر سیاسیات کی الجھنوں میں پڑ کر خطرناک ہو رہا تھا، اس لئے جیسے بھی بنا اس کو وہیں ختم کر دیا گیا ہے، لیکن اتنے دنوں میں غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب سیاسیات وہ پہلے کے سیاسیات نہیں رہے، اب یہ سننے میں آتا ہے نہ سیاسیات کا اصلی میدان لاکھوں مربع میل کا میدان نہیں ہے جس کو اگلے لوگ سلطنت و حکومت کہتے تھے، بلکہ یہ دو بالشت کا پیٹ ہے، اسی کی خاطر سب کچھ ہے، اگلے زمانہ کے بھولے بھالے بزرگ کہا کرتے تھے، "خوردن برائے زیستن است نہ زیستن برائے خوردن"۔ یعنی کھانا جینے کے لیے ہے، نہ جینا کھانے کے لیے" حضرت مسیح کہتے تھے کہ "آدمی روٹی ہی سے نہیں جیتا" لیکن آجکل کی سیاسیات نے ان دونوں مقولوں کو جھٹلایا! اب یہ ہے کہ "جینا کھانے کے لیے ہے، نہ کھانا جینے کے لیے" اور یہ کہ آدمی روٹی ہی سے جیتا ہے، چنانچہ آجکل کے بولشوزم، کمیونزم، سوشلزم وغیرہ کی بنیاد زمین پر نہیں، پیٹ پر ہے۔

پیٹ کے لئے کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا کون سا ہے، لوگ اپنے اپنے تجربہ اور عادت کے مطابق اس کے کئی جواب دے سکتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو میرا خیال ہے وہی اکثروں کا ہے، یعنی یہ کہ کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا ناشتہ ہے، صبح سویرے اٹھ کر منہ میں کچھ پڑ جانے سے سارے دن کے لیے ڈھارس ہو جاتی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ناشتے کے لیے اکثر زبانوں میں بھوک توڑنے کی اصطلاح

بزرگوں سے میں دو زبانیں جانتا ہوں، ایک پورب کی اور ایک پچھم کی، یعنی عربی اور انگریزی دونوں میں یہی بات ہے، اس سے سمجھتا ہوں کہ اور زبانوں میں بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا، عربی میں اس کو فطور کہتے ہیں، اسی سے مسلمانوں کا افطار نکلا ہے، اور جس سے افطار کریں اس کو افطاری کہتے ہیں، فطور کے معنی توڑنے کے ہیں، یعنی روزہ کی بھوک کو توڑنا، ہمارا ناشتا بھی اسی قسم کا لفظ ہے، فارسی میں اس کے معنی اس بھوکے کے ہیں، جس نے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو (مؤید الفضلاء و برہان قاطع) اب دیکھئے کہ یہ نام تو اس آدمی کا تھا جس کے منھ میں صبح سے کچھ نہ پڑا ہو، اور اب ہم اس چیز کو کہتے ہیں جو صبح سویرے ایسے آدمی کو کھلادی جائے، یعنی شخص کے بجائے چیز کا نام ہوگیا۔

اسی معنی میں ایک اور لفظ نہار آپ بولتے ہیں "نہار منھ" یہ بھی فارسی ہے، مگر دیکھئے کہ فارسی ہندوستانی سے ایسا مل گیا ہے کہ گویا ہندوستانی ہی ہے، اس کی اصلیت "ناہار" ہے "نا" نفی کیلئے ہے اور "ہار" کے معنی غذا کے ہیں "ناہار" یعنی نہیں کھایا ہوا، (برہان قاطع) اب اس سے ناہاری یعنی "نہاری" تیار ہوئی جو صبح کو نہار منھ کھائی جائے اور لکھنؤ اور دلی میں یہ خاص چیز ہوگئی، جو بازاروں میں پکی پکائی بہت چٹپٹی ملتی ہے۔

"ناہار" سے آہار یاد آیا، آہار آٹے کی اس لیئی کو کہتے ہیں جو کاغذ اور کپڑے پر اس لئے پڑھائی جاتی ہے کہ وہ مضبوط ہو جائے، آپ سُن چکے کہ آہار غذا کو کہتے ہیں، جو بدن کی تقویت کا باعث ہوتی ہے، اس سے اس لیئی کو بھی کہنے لگے جو کاغذ اور کپڑے کی قوت کو بڑھادیتی ہے (برہان قاطع)۔

ناشتے کے طور پر جلدی جلدی جو کھانا پہلے تیار کر کے مہمان کے سامنے رکھ دیا جائے عربی میں اس کو سُلفہ کہتے ہیں، اسی سے سَلف (اگلے لوگ) کا لفظ نکلا ہے عربی کا یہ

سفرہ ہمارے ملک میں کھانے کے دسترخوان پر تو بار نہ پا سکا، مگر پینے کی پارٹیاں محفلیں ہیں ایک ہزار برس کے بعد اس کو جگہ مل گئی، نورالدین جہانگیر کے زمانہ میں تمباکو امریکہ سے ہندستان آیا، اور حکیم گیلانی کی پر حکمت ترکیبوں سے نوا، چلم، حقہ اور نے کی شکل پیدا ہوئی یہ تو امیروں کی باتیں تھیں، اس حقہ کی تیاری کے لیے بڑا وقت، بڑا اسامان اور ایک دو ملازم چاہئیں اور غریبوں کے پاس نہ اتنا وقت، نہ اتنا سامان نہ ملازم، انھوں نے اپنے ہاتھ سے بھر کر سلفہ جلدی جلدی تیار کر لیا، اور پی پلا کر اپنے کام پر روانہ ہو گئے۔

تکلف کے کھانوں کو قابوں میں نکالتے ہیں، عربی میں لفظ قعب ہے اس کے معنی لکڑی کے پیالہ کے ہیں، جو لکڑی کو بیچ میں کھود کر بنایا جائے، (لسان العرب) ترکی میں اور اس سے فارسی میں "قاب" کے معنی مطلق ظرف یا خانہ کے ہیں، اسی لئے عینک کے خانہ کو اور قلمدان کو قاب کہتے ہیں، اور پھر اسی سے کھانے کے بڑے برتن کو بھی ہمارے ملک میں قاب کہنے لگے۔

یہی حال رکابی کا بھی ہے، رکاب فارسی میں ہشت پہل پیالہ کو کہتے ہیں اس سے رکابی بنی، اور اب وہ پھیلے ہوئے چوڑے ظرف کو کہتے ہیں، اور اسی سے ہندستانی امرا کے لئے رکابدار پیدا ہوئے، جو کھانے کا انتظام کرتے تھے، یا عمدہ عمدہ کھانے تیار کرتے تھے۔

روزمرہ کے کھانوں میں قلیہ قورمہ بہت عام چیزیں ہیں، قلیہ کی شکل عربی ہے، مگر معنی عربی نہیں، قلیہ کی عربی شکل قلیۃ ہو سکتی ہے، عربی میں قلی بھوننے کو کہتے ہیں۔ اس سے قلیہ بن سکتا ہے، اور بھونے ہوئے گوشت کو کہہ سکتے ہیں ہماری زبان میں قلیہ اس شوربہ دار گوشت کو کہتے ہیں جس میں کوئی ترکاری پڑی ہو، بلکہ اسی ترکاری کو قلیہ کہنے

لگے ہیں۔ قورمہ تو ترکی معلوم ہوتا ہے،

شوربا تو صاف عربی کا شربہ ہے، مگر معنی بدل گئے ہیں، عربی میں شُربہؔ اس کو کہتے ہیں جتنا ایک دفعہ پی لیا جائے، اس سے ایرانیوں نے شوربا بنالیا، اور گوشت کے پانی کو کہنے لگے، انھوں نے شوربا کو پھر شور باج بنالیا، مگر ہماری ہندوستانی میں شوربا ہی رہا، بگڑا تو شُرَدا ہو گیا۔[1]

اسی عرب شرب (پینا) سے ایرانیوں نے شراب اور شربت تیار کیا، اور ہم ہندوستانیوں نے قبول کر لیا، شراب کے عربی معنی ہیں جو چیز پی جائے، یہاں تک کہ قرآن میں دودھ کو بھی شراب کہا ہے، ایرانیوں نے جس کو شراب کہا، اس سے متوالی شراب مراد لی، اسی سے یورپی زبانوں میں سیرپ (SYRUP) تیار ہوا، جو شکر پڑکر میٹھا ہو گیا۔

لیکن ایرانیوں کے اثر سے ہم نے پانی میں شکر گھول کر جو چیز تیار کی اس کو شربت کا نام دیا، لفظ عربی ہے اور معنی عجمی، عربی میں اس کے معنی فقط پینے کے ہیں۔

میٹھے کے بعد نمکین چیز یاد آئی کباب، صورت عربی ہے۔ معنی عربی نہیں، کَبُّ عربی میں اوندھا کرنے کو کہتے ہیں، اب جس گوشت کو اوندھا کر کے آگ پر رکھتے اس کو کباب کہتے۔

کھانے کے بعد تکلفات کی دوسری قسم فرش فروش ہیں۔

قالین سے بڑھ کر خوشنما، خوبصورت اور مضبوط فرش شاید ہی کوئی دوسرا ہو، جو زمین

---

[1] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے معارف کے ایک مضمون میں بڑی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ عربی نہیں، فارسی لفظ ہے "شور" اور "با" سے مرکب ہے "شور" نمکین اور "با" فارسی میں کھانے کو کہتے ہیں، شوربا نمکین کھانا، یہی با کھانے کے معنی میں شکنبا، باورچی اور نانبائی کے لفظوں میں ہے "بس"

کے فرش پر نہیں بیٹھتے وہ بھی کرسیوں کے نیچے اس کو بچھاتے اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں، مگر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ آیا کہاں سے؟ ہندوستان میں تو اس کو مسلمان لائے۔ مگر مسلمانوں کو یہ ملا کہاں؟ تاریخ کا یہ بھید خود اسی لفظ کے اندر چھپا ہے۔

ایشیائے کوچک میں آرمینیہ کے علاقہ میں ایک شہر کا نام قالیقلا ہے، چوتھی صدی ہجری میں یہ اسلامی حکومت کا آخری شہر تھا، اس کی طرف جب نسبت کی جاتی تھی تو قالی کہتے تھے، عربی زبان کا ایک مشہور ادیب اور لغوی اسی نسبت سے ابو علی قالی کہلاتا ہے، یہ فرش قالین اس شہر کی صنعت اور کاریگری ہے، اسی لئے اس کو "فرش قالی" پہلے نسبت کے ساتھ کہا گیا۔ پھر استعمال کی کثرت سے اس کا نام ہی قالی پڑ گیا، یاقوت رومی متوفی ٦٢٦ھ اپنے جغرافیہ معجم البلدان میں قالیقلا کے نیچے لکھتا ہے۔

وتعمل بقالیقلا هذه البسط	یہ فرش جس کا نام قالی ہے قالیقلا
المسماة بالقالی، اختصروا	میں بنایا جاتا ہے، لفظ میں ہلکا پن
فی النسبة الی بعض اسمه	کیلئے نسبت میں اختصار مدنظر رکھا ہے
لثقله (ج ۷ ص ۱۷ مصر)	(یعنی قالیقلائی کی جگہ صرف قالی کہا ہے)

سُرید الفضلاء میں جو فارسی کا قدیم لغت ہے، اس کو "قالی" لکھا ہے، اور ایک شعر نقل کیا ہے، فارسی شعراء نے بھی قالی ہی باندھا ہے، اور جس چیز کو غالیچہ کہتے ہیں عجب نہیں کہ وہ قالیچہ ہو یعنی چھوٹا قالی، اب آخر کا نون جو قالین میں ہے، وہ ین ہے جو نسبت کے معنی بخشتا ہے جیسے رنگ سے رنگین، قالین کے معنی وہ فرش جو قالی کی طرح ہو، یائے نسبتی چونکہ پہلے سے موجود تھی، اس لئے دوسری ی نہیں لگی، یہ تحقیق میری ایجاد ہے، معلوم نہیں صحیح ہے یا غلط۔

تکلفات کی تیسری قسم مکانات ہیں، پہلے بڑے بڑے محلوں اور ایوانوں میں اور اب بڑی بڑی کوٹھیوں میں اس حصہ کو جو نوکروں کے رہنے کے لیے بنایا جاتا ہے، ہماری زبان میں شاگرد پیشہ کہتے ہیں، بیچارہ مولوی نورالحسن صاحب نیر مرحوم (نوراللغات کے مولف) نے ایک دفعہ مجھ سے استفسار فرمایا کہ اس کو شاگرد پیشہ کیوں کہتے ہیں، میں نے ظرافت سے کہا کہ مغل درباروں میں جب بادشاہ پیری مریدی کرنے لگے تو نوکر چاکر چیلہ کہلانے لگے جس کی شہادت تاریخوں کے علاوہ دہلی کا "کوچہ چیلان" دے رہا ہے" اسی چیلہ کی فارسی شاگرد بنائی گئی، اور شاگرد پیشہ اس گروہ خدام کا نام پڑا، اور اس سے ان کے رہنے کے حصہ کو بھی شاگرد پیشہ کہنے لگے۔

کچھ دنوں کے بعد میں اپنی بڑی بچی شمیمہ بانو سلمہا کو گلستاں پڑھا رہا تھا اس میں وہ حکایت آئی جس میں پردہ اور علم کا مناظرہ ہے۔

این حکایت شنو کہ در بغداد　　رایت و پردہ را خلاف افتاد

علم شاہی نے جھک کر پردہ شاہی سے شکایت کی کہ سفروں اور لڑائیوں میں تو مارا مارا میں پھرتا ہوں اور قرب سلطانی تم کو حاصل ہے، تم نازنین کنیزوں کے ہاتھوں میں رہتے ہو، اور

من فتادہ بدست شاگرداں

اس سے خیال آیا کہ شاہی ملازمین اور خادم وحشم کے معنوں میں یہ پرانا لفظ ہے، اور اسی سے شاگرد پیشہ ہے، اور ہماری زبان میں محلوں کے اس حصہ کو کہنے لگے جو خاص

؎ مولانا حبیب الرحمان شروانی کا ارشاد ہے کہ اس شاگرد کی اصل "شاہ گرد" ہے بادشاہ کے ارد گرد جو لوگ رہتے تھے ان کو شاہ گرد کہتے تھے اور کثرت استعمال سے وہ شاگرد ہو گیا۔ س

طور سے ان کے لیے بنائے جاتے ہیں۔

ایک ہندوستانی لفظ کی اصلیت پر مجھے بڑا تعجب آیا۔ ایک دفعہ میں عربی کا مشہور لغت تاج العروس دیکھ رہا تھا کہ لفظ راز پر نظر پڑی، اس کے معنی اس میں استاد اور ماہر کے لکھے تھے، دفعۃً میرا دھیان اپنے ہندی راج اور راجگیر (معمار) کی طرف گیا، لیکن یقین نہیں آتا تھا کہ عربی کا ایسا لفظ جو عربی میں بھی کتابوں اور تحریروں میں برتا نہ گیا ہو وہ ہماری ہندوستانی میں کیسے آگیا ہوگا۔ لیکن دل یہی کہتا ہے، کتابیں الٹیں پلٹیں دیکھیں مگر سراغ نہ لگا، اس سال کی گرمیوں کی تعطیل میں برادر عزیز پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے پٹنہ میں نصاب الصبیان کی طرح کا ایک قلمی رسالہ فارسی عربی ہندی کا بھلا، جس میں فارسی اور عربی الفاظ کے مقابل ہندی الفاظ جمع کئے گئے ہیں، اور شاید کسی ایرانی یا پارسی کی تصنیف ہو، مصنف کا نام اور زمانہ نہیں دیا ہے رسالہ کا نام "لسان فارسیات" لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ہندوستان کے کسی فودارد ایرانی کے لئے لکھا گیا ہو، تصنیف کا مقام گجرات ہے، اس میں پیشہ وروں کا باب دیکھ رہا تھا کہ لفظ راجگر پر نظر پڑی جس کے معنی اس نے گریا یعنی "کرنے والے" کے لکھے تھے، دل نے کہا مدت کا کانٹا آج نکل گیا، اور معلوم ہوا کہ صحیح لفظ راجگر ہے پھر بھی پوری تشفی نہ ہوئی خدا بخش خان کے کتب خانہ میں چلا گیا، فارسی لغت کی کئی کتابیں نکلوا کر دیکھیں، مطلب کا پتہ نہ پایا، آخر فرہنگ رشیدی عبد الرشید ٹھٹوی میں یہ عبارت نکلی۔

"راز معمار را در ان گلکار را بہ ہندی راج گویند، لیکن ہدیں معنی عربی است عسجدی گوید"

یہ یکے تیر ہمہ فاش کند سر حصار　　　　در برو کردہ بود تیر گل کار رازانہ

اس عبارت نے پوری تشفی کر دی، واپس آکر برہان قاطع میں دیکھا تو یہ لکھا پایا۔
دینام و گل کارایز گویند و بعربی طیان خوانند و بعضے گفتہ اند رانذ در عربی کلانتر و بزرگ بنایاں باشند۔

یعنی جس معنی میں ہم مستری کا لفظ بولتے ہیں۔

اچھا تو پھر مستری کیا لفظ ہے، خیال جاتا ہے کہ یہ اصل میں مسطری ہے، مسطر اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے سطر سیدھی کی جاتی ہے، پرانے زمانہ میں ایک موٹے کاغذ پر موٹے تاگہ کو سیدھ سے ناپ کر آجکل کے رولدار کاغذ کی طرح سی دیتے تھے، اور اس پر لکھنے کے کاغذ کو دبا کر سطروں کو ابھارتے تھے، تاکہ لکھنے میں سطریں سیدھی ہوں، یہ تو کاغذ کی بات چیت ہوئی، عمارتوں میں دیواروں کی سیدھ قائم کرنے کے لئے جس آلہ سے کام لیا جاتا تھا، وہ بھی مسطر ہوا، اور اس مسطر سے جو ماہر فن دیکھ بھال اور ناپ کر عمارت کی دیواروں کی سیدھ درست کرتا تھا وہ مسطری کہلایا، اور پھر جب وہ ہندوستانی زبانوں سے ادا ہوا تو مستری کا مستری ہو گیا، اور اب وہ ہماری زبان کا لفظ ہے، اور ماہر کاریگر کے معنی میں[1] بولا جاتا ہے۔

بڑھیوں کی بول چال میں ایک لفظ خراد اور خرادنا ہے، یعنی کرسی یا پلنگ وغیرہ کے پایوں کو چھیل کر کہیں موٹا کہیں پتلا، کہیں گاؤدم وغیرہ شکلیں بناتے ہیں۔ یہ خالص عربی لفظ خرط ہے، عربی میں اس کے معنی لکڑی کے اس طرح چھیلنے کے ہیں کہ اس کی اوپری پرت اتر جائے، اس سے خراط بنا، یعنی وہ آلہ جس سے لکڑی کو

---

[1] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب مستری کو پرتگالی فرماتے ہیں اور اس کی اصل (MISTRE) بتاتے ہیں، مگر پرتگالی میں خود بہت سے عربی لفظ ہیں۔ س

اس طرح پھیلا جائے، وہ خراط ہمارے ہاں خراد ہوا، اور اس سے خراد پر چڑھانا محاورہ ہوا، خرادنا مصدر بنا۔[1]

یہ لفظ اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ لکڑی کی یہ صنعت کاری مسلمانوں کے ذریعہ ہندوستان میں آئی، اور پھیلی۔

معماروں کے ایک ضروری آلہ کا نام ہماری زبان میں ساہول ہے، لمبے تاگہ میں ایک وزنی لوہا یا اور کوئی دہات گول سی بندھی ہوتی ہے، اس کو نیچے لٹکا کر دیکھائی سے دیوار کی سیدھ دیکھتے ہیں، خوارزمی نے مفاتیح العلوم میں ایک آلہ کا نام شاقول لکھا ہے، اور اس کی تشریح یہ کی ہے ھو ثقل یشدّ بہ فی طرف حبل بیدّہ سفلا یحتاج الیہ النجارون والبنّاؤون (لیڈن صفحہ ۲۵۵) یعنی وہ ایک بوجھل چیز جو رسی کے کنارے باندھ کر نیچے لٹکائیں، اس کی ضرورت بڑھئیوں اور معماروں کو ہوتی ہے"، اس تشریح سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہندی ساہول کی عربی صورت شاقول ہے، عربی میں ثقل کے معنی وزن کے لکھے ہیں، مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شاقول ش سے نہیں بلکہ ثاقول ث سے ہو یعنی ثقل اور بوجھ کے معنی! مگر ہیئت کی کتابوں میں بھی شاقول ہی دیکھا گیا ہے۔ کیا وہاں بھی تصحیف ہوئی ہے۔

اسی کتاب میں بڑھئیوں کے ایک اوزار کا نام الکونیا بتایا گیا ہے۔ اور اس کی تشریح یہ کی ہے یقدر بہا الزاویۃ القائمۃ (صفحہ ۲۵۵) یعنی "اس سے زاویہ

---

[1] پروفیسر غلام مصطفےٰ خاں لکھتے ہیں کہ شاید ظہوری نے نثر سوم میں سب سے پہلے خراط کی جگہ خراد استعمال کیا ہے وہ کہتا ہے۔

فرزانہ از استقامتش خراد زندہ کردہ ست کجرو ی زنہار (معارف مارچ ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۰۲)۔

قائمہ نکالتے ہیں"۔ کوئی کچھ کہے، ہو نہ ہو یہ لفظ ہمارا کونیا ہے، جس کو آج بھی ہمارے کاریگر بولتے اور برتتے ہیں، اور اس کا تلفظ گُنیا ہے، یعنی وہ آلہ جس سے کونہ (زاویہ) ناپیں یہ ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ کی دو لکڑیاں ہوتی ہیں جن کو بخطِ مستقیم جوڑ کر کونہ (زاویہ قائمہ) نکالتے ہیں اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہے۔ یہ لفظ اتنے پرانے زمانہ میں ہندوستان سے غزنویوں کے زمانہ میں وسط ایشیا تک کیسے چلا گیا۔

اس کے بالمقابل ایک دوسرا لفظ ہے جو وسط ایشیا سے ہندوستان آیا ہے، یہ جہاز کا لفظ ہے، جہاز دیکھنے میں تو عربی ہے مگر جس معنی میں یہ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے، وہ قطعاً ہندوستانی یا ہندوستانی فارسی ہے، اصل میں اس کے لفظی معنی تو "سامان کرنے کے ہیں"، اس سے تجہیز بنا جس کے جہازیوں میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کشتی میں سامان رکھ کر کہیں بھیجنا، یہ اصطلاح تیسری صدی ہجری میں پھیل چکی تھی، بزرگ بن شہریار کے سفرنامہ میں ہے۔

انہ جھز مرکباً لہ الی الزابج — اس نے اپنا ایک جہاز سامان لاد کر جاوہ بھیجا۔ (ص ۸۰)

یہ تو دریائی اصطلاح ہوئی، لیکن اس کے سو برس بعد یہ لفظ وسط ایشیا میں خشکی کے سامانِ تجارت کے معنوں میں سننے میں آتا ہے، حدود العالم میں جو ۳۷۲ھ کی تصنیف ہے، یہ لفظ ان معنوں میں بار بار آیا ہے، شروع شروع میں تو مجھے تعجب ہوا کہ یہ جہاز خشکی میں کیسے چلا، بعد کو سمجھ میں آیا کہ ابھی یہ لفظ سامان کرنے کے معنی سے قطع مسافت کر کے فقط "سامان" کی منزل میں پہنچا ہے۔

وجہازہائے ہندوستان بدیں شہر کہ افتد .... واکثر تجار در ہندوجہازہ ہندوستان آنند، ..... (ایران) ۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہی جہاز بعد کو خشکی سے تری میں آگیا، اور سامان تجارت کے بجائے سامان تجارت لیجانے والے جہازوں کو خود جہاز کہنے لگے، ہندوستان میں اکبر کے زمانہ میں فرشتہ نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے ۔

دبگفتہ فرنگیاں جہازات مرد و ساختہ اند، (ج ۲ ص۳۲۷، نولکشور)

اب ہماری زبان میں یہ لفظ مطلق جہاز کے معنی میں بولا جانے لگا، اور سامان تجارت اس سے رخصت ہوگیا

اسی سے ہماری زبان میں خوشی اور غم کے دو لفظ نکلے ہیں، ایک جہیز اور دوسرا تجہیز، جہیز اس سامان کو کہتے ہیں جو شادی میں باپ کی طرف سے لڑکی کو ملتا ہے، اس معنی میں یہ لفظ بھی خالص ہندوستانی ہے، اس کی اصل جہاز ہے، سامان دینا، یا سامان کرنا، عربی اور فارسی کے قاعدہ سے الف میں امالہ ہو کر جہاز سے جہیز ہوگیا ہے اور اس جہیز پر اب کسی عرب یا ایرانی کا قبضہ نہیں رہا ۔

جہاز مردہ کے کفن دفن کے سامان کو بھی عربی میں کہتے ہیں، جس سے مصدر تجہیز بنا، یعنی سامان کرنا، اس سے ہماری زبان میں تجہیز و تکفین کا لفظ پیدا ہوگیا ۔

ذرا ذرا سی مناسبت سے دیکھئے تو کیسے کیسے لفظ بنتے اور معنی بدلتے ہیں، ذرا اسی ذرا پر غور کیجئے، کیا یہ عربی ذرہ نہیں جس کو آپ "ذرہ بے مقدار" کی صورت میں اچھی طرح پہچانتے ہیں، مگر استعمال کی کثرت سے مخفف ہو کر ذرا کے بہت ہی تھوڑے کے معنی ہوگئے، اور ایسے ہوگئے کہ اب اس کو ذرہ سے ذرا بھی تعلق نہیں رہا ۔

ہماری زبان میں ایک لفظ مضمون کی **سرخی** یعنی عنوان ہے، دیکھئے تو یہ سیاہی سے سرخی کیسے بن گیا۔ بات یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں قلمی کتابوں میں باب اور عنوان کو امتیاز کے لیے سرخی سے لکھا کرتے تھے۔ اب ہمارے زمانہ میں جب چھاپا ایجاد ہوا تو خود باب کے یا مضمون کے عنوان کو سرخی کہنے لگے، چاہے آپ اس کو سیاہی ہی سے لکھیں، اس لفظ کی یہ توجیہ تو پہلے ہی سے ذہن میں آرہی تھی، مگر اتفاق سے ایک پرانی قلمی کتاب سے سند ہاتھ آگئی، تو اپنے ذہنی الہام پر تصدیق کی مہر لگ گئی۔ شیخ محمود چراغ دہلی کے مرید سید محمد حسنی اپنے مکتوبات میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

کیفیت دیباچہ کہ بقلم مبارک آں محبوب بنشتہ بودند برائے سرخی بنشتن آں سپیدی بنشتہ عین فرستادہ شدہ است در دیباچہ بنویسند......

ذات لفظ صلوٰۃ سرخی بنویسند" (کتب خانہ حکیم عبدالعزیز شرقی جالندھر شہر)۔

کاغذات کی مسل (م س ل) ایک عام دفتری اصطلاح ہے، اس کی اصل عربی لفظ "مثال" ہے، سرکاری شاہی کاغذات کی اصل تو دفتر میں رہتی تھی، اور اس کی بعینہ نقل (مثال) لوگوں کے پاس بھیجی جاتی تھی، اس سے مثال کے دوسرے معنی فارسی میں شاہی فرمان کے پیدا ہوئے، اور اس کی جمع امثلہ اور مُثُل بنی، مثال اور مثل نے مسل کی ہندی شکل اختیار کی، مثال اور امثلہ کا استعمال غالباً سلجوقیوں کے زمانہ سے رواج پایا، تاریخوں میں کثرت سے یہ لفظ آتا ہے، مثال کیلئے غزنوی عہد کے مبارک شاہ معروف بہ فخر مدبر کی کتاب آداب الحرب والشجاعہ ص۱۲ کا ایک ٹکڑا اپیش ہے۔

"مثال توقیع برسانند کہ ہر چہ تعجیل تر بیاید"

نستعلیق ایک خاص فارسی خط کا نام ہے، یہ اصل میں نسخ اور تعلیق کی ہندی ترکیب ہے، ہندی ترکیب کا خاصہ ہے کہ جب دو لفظ ملا کر ایک بنائے جاتے ہیں تو نسخ کا ایک دو حرف لفظ کو ہلکا کرنے کے لئے گرا دیتے ہیں الٹا طرح نسخ و تعلیق مل کر نستعلیق بنا، عربی میں نسخ لکھنے اور نقل کرنے کو کہتے ہیں، اس مناسبت سے اہل عجم نے عربی خط کا نام نسخ رکھا۔ تعلیق اور تعلیقہ کے نام سے اس نے فارسی شکل اختیار کی، اور ان دونوں سے مل کر نستعلیق خط بابر کے زمانہ میں بنا، یہ وہی خط ہے جس میں آجکل اردو لکھی جاتی ہے۔ یہ خط دوسرے شکستہ وغیرہ خطوں کے مقابلہ میں بہت بنا کر نہایت تکلف سے ٹھہر ٹھہر کر لکھا جاتا ہے، اس سے نستعلیق آدمی اور نستعلیق بول چال کی شکلیں پیدا ہوئیں، چراغ ہدایت میں ہے۔

"نستعلیق گوئی حرف را ساختہ گفتن و عبارت را بتکلف اداساختن انترقہ گویند"

"نستعلیق گویا قوت لب ریحان خط داغم"

اس سے ہماری زبان میں یہ وسعت پیدا ہوئی کہ نستعلیق لباس، نستعلیق چال، اور نستعلیق بول چال کہنے لگے۔

بعض لفظوں کی ظاہری شکل وصورت کیسا دھوکا دیتی ہے کتنے ہندوستانی ایسے گورے چٹے ہوتے ہیں کہ ولایتی معلوم ہوتے ہیں، اور بعض سونلے رنگ کے ایرانی بھی دیکھے ہیں، ہماری زبان کا ایک بہت ہی خوبصورت لفظ چلبلا ہے، جو غزل گو شاعروں کے ہاں خوب خوب کام آتا ہے، اس کی شکل تو ہندی ہے، مگر ہے ایرانی برہان قاطع میں ہے۔

"چلبلہ بضم اول و بائے ابجد بروزن شعلہ شتاب و اضطراب را گویند"

ہم سمجھتے تھے کہ اس کا تعلق ہمارے ہندی لفظ چھل بل سے ہے۔ اب غور کیجئے یہ بیگا لفظ بھی کیا کیا صورت بدلتے ہیں، موٹے کپڑے کو ہم گفش کہتے ہیں، مگر یہ آیا کہاں سے فارسی میں اس کی صورت گبز ہے" بفتح اوّل وسکون ثانی وزائے نقطہ دار۔ ہر چیز گندہ وقوی وسطبر را گویند" (برہان قاطع) اس کی دوسری شکل غفص کی ہے، صورت تو عربی ہے، مگر عربی نہیں۔

اُحدی کے معنی ہماری زبان میں سست اور کاہل کے ہیں، مگر ان سست کاہلوں کی پیدا وار تاریخی ہے، اُحدی، اَحدی ہے، اَحد کے معنی عربی میں ایک ہیں، وہ سپاہی جو فوج سے اکیلا ڈیوڑھی کی خدمت پر مامور رہتا تھا، اکبر نے اس کو احدی (اکیلا) کا لقب بخشا، یہ احدی کہلاتے تھے اور ڈیوڑھی پر پڑے رہتے تھے کوئی کام کاج ان سے متعلق نہ تھا، اس لئے زبانِ خلق نے اس کو سست و کاہل کے معنوں میں کہہ کر پکارا، زبانِ خلق کو کون روک سکتا ہے۔

ہماری زبان میں ایک لفظ قلعی ہے، آیئے اس کی بھی قلعی کھولیں، ہم لکھتے قَلعی ہیں۔ مگر بولتے قلئی ہیں، ہماری زبان میں اس کے معنی سپیدی اور صفائی کے ہیں، برتنوں پر قلعی کی جاتی ہے، اور مکانوں پر قلعی پھیری جاتی ہے۔

یہ لفظ گو پرانی عربی کا نہیں، مگر پھر بھی عربی لغتوں میں ملتا ہے، قَلعِی عربی میں (لسان) اور اسے فارسی میں (مؤید الفضلا) رانگے کو کہتے ہیں، مگر رانگے کو قلعی کیوں کہتے ہیں، لسان العرب کا بیان ہے کہ قَلعُ ایک کان کا نام ہے جس سے رانگے کی بہترین قسم نکلتی تھی، اس لئے اس کی طرف نسبت کرکے اچھے رانگے کو قلعی کہتے ہیں، اور چونکہ اسی رانگے سے تانبے کے برتنوں میں سپیدی پھیری جاتی ہے، اس لئے اس کو

قلعی کھونا کہنے لگے، پھر چونے سے بھی اگر مکانوں پر سپیدی پھیری گئی تو اس کو بھی قلعی پھرنا کہدیا، ہماری زبان میں ان استعمالوں سے یہ معنی پیدا ہوئے کہ کسی داغ دھبے یا کسی کے عیب کو اگر چھپایا جائے تو وہ اس پر قلعی کرنا ہوا، اور اگر اس داغ دھبے اور عیب کو ظاہر کر کے سب کو دکھایا جائے تو وہ قلعی کھولنا ہوا۔

تماشا بھی عجیب تماشے کا لفظ ہے، لفظ تو عربی ہے، لیکن معنی عجمی ہیں، یہ مَشْی سے بنا ہے، جس کے معنی چلنے کے ہیں، اس کو باب تفاعل میں لے گئے تو تماشی ہوا، اور معنی باہم مل کر چلنا ہوئے عجمیوں نے تماشی کو اپنے قاعدہ سے تماشا بنالیا جیسے تمنّی کو تمنا بنادیا، چونکہ سیر و تفریح کے لیے چند احباب ساتھ مل کر چلتے ہیں، اس لئے خود سیر و تفریح کو تماشا کہنے لگے، اس کے بعد آگے بڑھے تو سیر تفریح کے سامان کا بھی تماشا نام رکھا۔

بجرم عشق تو مارا اکشند غوغا ئیست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشا ئیست

(معارف مئی ۱۹۲۹ء)

تہنید

"تہنید" کے اگر ہم ٹھیٹ معنی کریں تو "ہند بانا" کہہ سکتے ہیں، یہ اصطلاح اصل میں عربوں سے چلی، وہ جب کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر خراد کر اس کو عربی بنا ڈالتے تھے، تو وہ اپنے اس عمل کو "تعریب" کہتے تھے، یہی قاعدہ فارسیوں نے اپنی زبان میں جاری کیا تو اس کو تفریس کہا، یعنی فارسی بنا لینا، اب جب اہل ہند بھی کریں، یعنی وہ کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر تراش خراش کر کے اپنی زبان میں ملا لیں تو اس کو تہنید کہیں گے۔

یہ اصول زبانوں کے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے بہت ہی مفید ہے، یہ اصول قریب قریب دنیا کی سبھی زبانوں میں چلتا ہے، اور اس کے مانے بغیر ممکن ہی نہیں کہ زبان ترقی پا سکے۔

بات یہ ہے کہ زبان کوئی جامد چیز نہیں، وہ ہمیشہ بڑھتی پھیلتی اور ادلتی بدلتی رہتی ہے، جو زبان بڑھنا چاہے گی اس کو دنیا کی دوسری زبانوں سے سروکار رکھنا پڑے گا، اور قوموں کے میل جول کے ساتھ ان کی بولیوں اور لفظوں کی آمد و رفت بھی لگی رہے گی اس کا اثر یہ ہوگا کہ اس میں دوسری زبانوں کے لفظ ملتے رہیں گے اور بدلتے رہیں گے۔

ہر زبان کے لفظوں میں حرفوں کی خاص ترتیب، اور اس ترتیب سے خاص شکل

پیدا ہوتی ہے، جس طرح انسان سب برابر ہیں، پھر بھی فرنگی، حبشی، ہندی، چینی، ترکی، سب کی شکلیں ایک نہیں ہوتیں، ہر ایک کا رنگ، روپ اور ناک نقشہ ایک نہیں ہوتا، یہی مختلف بولیوں اور ان کے لفظوں کا حال ہے، اسی لئے ایک قوم کا آدمی جب کسی دوسری قوم کی بولی کا کوئی لفظ لیتا ہے تو اس کی زبان کی فطرت مجبور کرتی ہے کہ ارادہ اور احساس کے بغیر اس کی شکل بدل دے، ہندوستان کے باہر کا آدمی خواہ کچھ ہی کرے مگر وہ ہمارے ہندی حرفوں کو کبھی نہ بول سکے گا وہ اس کو نہ کچھ بدل دے گا، اور نہ وہ ہمارے لہجہ سے ہمارے لفظوں کو نکالے گا، وہ اس میں بھی کچھ ہیر پھیر کرے گا۔

یہی حال ہندیوں کا بھی ہے، عربی کے خاص حرف وہ ادا نہیں کر سکتے، ع، ء اور الف میں اور ث، ص، اور س میں اور ت اور ط میں وہ فرق نہیں کر سکتے، اس لئے دوسری زبان کا جو لفظ ہمارے یہاں آئے گا وہ جب تک اپنی بیگانگی چھوڑ کر بالکل گھریلو نہ بن جائے گا، وہ ہمارے دیس میں رہ نہیں سکتا، یہی وجہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے جو ہزاروں لفظ ہماری زبان میں آگئے ہیں وہ ہماری زبان کے قاعدوں پر چڑھ کر ہماری زبان کی شکل و صورت اختیار کرنے پر مجبور رہیں۔

معمار کے معنوں میں راج کی اصل عربی اور فارسی میں راز ہے، مگر ہمارا ہندوستانی لفظ راج ہی ہوگا، عربی کا صحیح لفظ تمنیٰ ہے، مگر فارس والوں نے اس کو لیا تو تمنا کر دیا۔ اور ہم نے بھی اسی کو قبول کیا۔ عربی تماشیٰ کو ایرانیوں نے تماشا کیا، اور ہم کو بھی یہی تماشا پسند آیا، لالٹین کی اصل لنٹرن ہے، مگر ہم کو لالٹین ہی کی روشنی پسند ہے، مٹن انگریزی ہو تو ہو، مگر ہمارا لفظ تو بوتام ہے جو مٹن کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

لفظ تبادلہ عربی کے لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہماری زبان میں یہ صحیح ہے اس کو چھوڑ کر مبادلہ یا تبادل بلوانے کی کوشش زبردستی ہے

محاذ کی عربی اصل محاذی اور ہندوستانی ورے (اوتی) میں بولا جاتا ہے (کی اصل عربی وراء ہے، مگر اب محاذ اور ورے کو چھوڑ کر ان معنوں میں محاذی اور وراء نہیں بولا جائے گا، تبدیل کے مقابلہ میں تبدیلی غلط ہو، مگر وہ ہمارے ہاں صحیح ہے۔ خود صحیح کو سہی ہم نے کر دیا ہے، اور اس سے ایک نئے معنی پیدا کر لئے ہیں، احوال عربی میں جمع ہی کیوں نہ ہو مگر وہ ہماری زبان میں واحد کے طور پر بولا جاتا ہے، معنی کا لفظ عربی میں واحد ہے، مگر اُردو والے اس کو جمع بولتے ہیں، "ماتحت" عربی کے لحاظ سے بے معنی ہے مگر ہماری زبان کا وہ نہایت صحیح و فصیح اور بامعنی لفظ ہے۔ آشنا ہندی کا اچھا کھرا لفظ ہو مگر ہماری زبان میں وہ آس بنکر آیا ہے، اور وہی صحیح ہے، ہندی میں دیار لفظ ہو تو ہو، مگر وہ ہمارے ہاں بیچار ہے۔

اسی طرح عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور یورپ کی زبانوں کے ہزاروں لفظ اپنی اپنی صورت بدل کر ہماری زبان میں ایسے رل مل گئے ہیں کہ ان کو پہچان پہچان کر اگر ہم ان کی اصلی شکلوں میں لکھنے اور بولنے لگیں تو خود ہماری زبان کی حکومت ہمارے ملک سے اٹھ جائے گی، اور ایسے بدیسیوں کی بھیڑ ہر جگہ دکھائی دے گی۔ جو ہمارے دیس کے قانون کو نہیں مانتی، اس لئے ان بدیسیوں کو اس دیس میں رہنے سہنے کی اجازت اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ ہمارے دیسی قانون کو قبول کر کے دیسی بنجائیں۔

لفظی شکل و صورت کے تغیر سے بڑھ کر معنوی تغیرات میں ہزاروں عربی اور فارسی

کے ایسے لفظ ہیں جن کے معنی خالص ہندوستانی ہیں، جن کو عربی اور فارسی والے جانتے بھی نہیں، اور وہ اسی قاعدہ کے مطابق بنے ہیں۔

اسی سے کسی زبان کی خود مختارانہ حکومت کا پتہ چلتا ہے، لفظ خواہ کسی قوم اور ملک کے ہوں، مگر جب وہ دوسری قوم اور ملک کی زبان میں چلے جاتے ہیں تو ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو پیدا کہیں ہوئے ہوں، لیکن جب کسی دوسرے ملک کی رعایا بنجاتے ہیں تو اسی دوسرے ملک کے قاعدے اور قانون ان پر چلا کرتے ہیں، اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان کی پیدائش کہاں کی ہے، اور یہ پہلے کس کی رعایا تھے۔

کسی لفظ کو ہندوستانی بنا لینے کے بعد ہم کو حق ہے کہ ہم اس کے وہ معنی سمجھیں جو اصل معنی سے مجازاً کے طور پر یا اس سے قریب ہونے یا کسی اور لگاؤ کی وجہ سے ہماری زبان میں پیدا ہو گئے ہیں۔

اسی نقرہ میں دیکھئے کہ "وجہ" عربی لفظ ہے، عربی میں اس کے معنی "منھ" کے ہیں، اس سے رُخ کے معنی پیدا ہوئے، اور اس سے سبب کے معنی پیدا ہو گئے، خود سبب کیا ہے؟ عربی میں اس کے معنی رسّی اور ڈوری کے ہیں، جس سے کسی کو باندھا جائے اس سے عربی میں ذریعہ کے معنی پیدا ہو گئے۔ اس سے اہل فلسفہ اور فارسی اور اردو والوں نے اس کو علت اور وجہ کے معنی میں بول دیا، اور لیجئے اس کی جمع اسباب بنائی اور اس کے وہ معنی قرار دیئے، جب اس کو مفرد کے طور پر بولیں تو سامان سمجھیں، اور جب جمع بولیں تو وہ سبب کی جمع ہے۔

اسباب کے معنی سامان کے نہ عربی میں نہ فارسی میں، خالص ہندوستانی میں ہیں۔

میں نے معارف میں ایک دفعہ اثر کی جمع اثرات لکھدی تھی، میرے مخدوم دوست سید مقبول احمد صاحب صمدانی نے جو بڑے نستعلیق انشاپرداز اور نفاست پسند اہلِ قلم ہیں خط لکھ کر مجھے فوراً ٹوکا کہ عربی میں اثر کی جمع آثار ہے، اثرات نہیں ہے، میں نے مذاقاً جواب دیا کہ میں نے وہ لفظ اردو میں لکھا ہے، عربی میں نہیں۔

لیکن یہ مذاق میں ٹالنے کی بات نہیں، خدا جانے اور کتنے فضلاء اس قسم کی بالارادہ غلطیوں کو لکھنے والوں کی جہالت سمجھتے ہوں گے، مگر بات یہ نہیں، عربی میں "اثر" کے معنی زمین پر قدم کے نشان کے ہیں، قرآن میں انہی معنوں میں یہ لفظ آیا ہے، اہلِ فلسفہ کو اپنے لئے لفظوں کی ضرورت پڑی انھوں نے اس کو لیا اور اس سے تاثیر اور تاثر اور اثر بمعنی نتیجہ کے لفظ بنالئے، اس سے فارسی اور اردو میں اثر نتیجہ کے معنی میں آگیا، یعنی جس طرح قدم اٹھ جانے کے بعد قدم کا نشان رہ جاتا ہے، اسی طرح کسی شے کے ہٹ جانے یا مٹ جانے کے بعد اس کا جو نشان رہ جائے اس کو اس کا اثر کہنے لگے، اب اس کے بعد اثر خاصیت کے معنی دینے لگا، جیسے فلاں دوا کا اثر یہ ہے۔ میری بات کا اثر یہ ہے۔ ملک میں ان کا اثر ہے۔

اب جمع میں آیئے، اس کی عربی جمع آثار بنی، لیکن اردو میں اس کے معنی قرینہ کے ہوں گے، جیسے آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے، یا پھر دیوار کا آثار ہے۔ یا پرانی یادگاروں کے معنی میں ہے، جیسے آثار قدیمہ، اسی لئے اثر نتیجہ یا تاثیر کے معنی میں جب بولیں گے تو اس کی جمع اثرات بنائی جائے گی خواہ وہ عربی کے لحاظ سے کتنی ہی بے قاعدہ ہو۔

قرینہ ہی کا لفظ دیکھئے، عربی میں قرن کے معنی ملانے کے ہیں، قرین ان دو جانوروں میں سے ہر ایک کو کہتے ہیں جن کے پاؤں ایک رسی میں ملا کر باندھ دیئے جائیں،

اس سے قرین کے معنی عربی میں ہمسر کے اور قرینہ کے معنی بیوی کے ہو گئے، لیکن اردو میں قرین کے معنی قریب، نزدیک اور پاس کے ہیں، قرینہ کسی شے کے ہونے کے قیاسی لوازم، جیسے قرینہ یہ کہتا ہے، قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔

اب لوازم کو دیکھئے، عربی لزم اور لزوم سے نکلا ہے، لازمہ کی جمع ہے، کسی شے سے چپک جانے کو لزوم کہتے ہیں، اس سے اہل منطق نے ایسے مفہوم و معنی میں جس کا کسی دوسری شے سے چپکا رہنا ضروری ہے یا وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتا اس کو استعمال کیا، اسی سے ہماری اردو میں لازم کے معنی ضروری کے ہو گئے، اس کی جمع کسی طرح لوازم بنی، اب اردو میں اس کی جمع لوازمات بنائی گئی، اور اس کے معنی کسی شے کے ضروری سامان و اسباب کے ہو گئے۔ لوازمات کے اس معنی کا اردو واحد ہے لوازمہ، جس کو عربی سے ادنیٰ تعلق نہیں۔

جنس کا لفظ کون نہیں جانتا، مگر یہ جنس عرب کی نہیں، یونان کی ہے، عربی میں منطق والے لائے، اور اس کی تعریب کر کے اس سے تجنیس، مجانست، تجانس وغیرہ مصدر بنائے، جنس منطق کی اصطلاح میں اس کلی (عام چیز) کو کہتے ہیں جس کے تحت میں کئی مختلف حقیقتوں کی اشیاء داخل ہوں، جیسے حیوان کہ یہ انسان اور گھوڑے گدھے، گائے، بھینس، بکری وغیرہ ہر جاندار کو کہتے ہیں، اب اس سے ادبی جنس پیدا ہوئی یعنی کسی حقیقت مشترکہ کے مختلف افراد، اس سے ابنائے جنس بنایا (ایک جنس کے بیٹے) یعنی ایک حقیقت کے سارے شریک، جیسے سارے انسان آپس میں ابنائے جنس ہیں، اب اس سے بھی خاص ہو کر ہم جنس بنا۔

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز کبوتر با کبوتر باز با باز

اب اس سے آگے بڑھ کر ہندوستان میں جنس کے معنی قسم کے ہو گئے اور خاص طور سے غلہ کی قسم کے ہو گئے، کہتے ہیں "نقد و جنس" نقد کے معنی روپے پیسے اور جنس غلہ یا سامان، اس کی جمع اجناس جو بنی، تو یہ غلوں کے اقسام پر مشتمل ہو گئی اور "نرخ اجناس" کی صورت میں اس کی جنس ہی بدل گئی۔

لفظ نقد کو تو دیکھئے کہ یہ کیا ہے، نقد کے عربی معنی پرکھنے کے ہیں، اس سے ریویو کے معنوں میں آجکل نقد یا تنقید بولتے ہیں، چونکہ پرکھے سکے جاتے ہیں، اس سے فارسی میں نقد کے معنی "سکے" کے ہو گئے، اور دام کی صورت میں "سکے" دیئے جاتے ہیں، اس لئے اردو میں نقد دام کے معنی اس دام کے ہوئے جو فوراً دیئے جائیں، اور نقد اور ادھار دو مقابل کے اردو لفظ ہو گئے۔

خیر، عربی کا لفظ ہے، اس کے معنی بھلے اور نیک کے ہیں، ہماری زبان میں یہ لفظ ایک تکیہ کلام کی صورت میں ہے، اور اکثر ذرا وقفہ کے طور پر یہ بول دیا جاتا ہے، پھر ہم نے اس میں ی اور ت لگا کر اس کو خیریت بنا دیا، اور اس کے معنی اچھی خیر کے ہو گئے، ات لگا کر اس کی بے قاعدہ جمع خیرات بنا دی تو صدقہ کے معنی ہو گئے۔

عربی میں مؤنث لفظوں کی جمع سالم بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے آخر میں ا۔ت لگا دیئے جائیں جیسے مسلمہ سے مسلمات، مگر پہلے فارسی والوں نے اور ان کی دیکھا دیکھی ہندوستانیوں نے اس میں ایسی آزادی برتی کہ فارسی اور ہندی لفظوں تک کی جمع اس طرح بنانے لگے، جیسے کاغذات، دستاویزات، دیہات، اس سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ جس لفظ کے آخر میں دیکھا اس میں جات لگا دیا، جیسے صوبہ جات، میوہ جات، علاقہ جات۔

علاقہ ہندوستانی میں زمینداری کے گاؤں کو کہتے ہیں، عربی میں اس کے معنی لگاؤ کے ہیں، اسی لگاؤ سے ہر چیز جس سے آپ کو لگاؤ ہے، آپ کا علاقہ ہے، غدر کے معنی عربی میں بے وفائی کرنے کے ہیں، اس سے اس بے وفائی کو کہنے لگے جو فوج اپنے عہد کو توڑ کر اپنے افسروں سے کرے، اس فوجی بے وفائی کا نتیجہ بدامنی ہے، یہ دونوں معنی ہندوستان میں پیدا ہوئے، اور بڑے شہروں میں بدامنی کے واقعے زیادہ پیش آتے ہیں تو بڑے شہر کو ہم نے غدار شہر کہہ دیا۔

ایک جائداد کی فروخت کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس پر ہمارے گاؤں کے ان پڑھ ہندو پٹواری نے کہا، دیکھ لیا جائے کہیں جائداد محبوس تو نہیں ہے، جائداد تو میں سمجھا کہ جائداد ہے، مگر محبوس نہیں سمجھا، مگر سوچتا رہا، کچھ دنوں کے بعد خیال آیا کہ یہ عربی محبوس ہے، جس کے معنی "قیدی" کے ہیں، اسی سے حبس اور محبوس عربی میں وقف کے معنی میں ہیں، اب معلوم ہوا کہ وہ پرانے شاہی کاغذات کی اصطلاح بولا مقصود یہ تھا کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ جائداد کہیں قید تو نہیں، یعنی کسی کے رہن یا بیع میں تو نہیں۔

تقریب کے معنی نزدیک کرنا۔ پھر جو کسی مقصد سے قریب کرنے کا ذریعہ ہو، اس کو تقریب کہا، اب ہندوستانی ملاقات کے ذریعہ کو تقریب کہنے لگے۔

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

ملنے ملانے کا سب سے عمدہ موقع کسی شادی اور خوشی کے مراسم کا موقع ہے اس لئے ہم شادی و خوشی کے موقعوں کو تقریب کہنے لگے۔

جناب کے معنی چوکھٹ کے ہیں، بادشاہوں سے براہ راست مخاطب نہیں ہوا جاتا تھا، اس لئے ان کے آستانہ اور چوکھٹ کی طرف نسبت کر کے بات کہی جاتی تھی،

اسی سے جناب تعظیمی خطاب کا لفظ ہوگیا۔

حضرت بھی بڑے حضرت ہیں۔ حضرت کے اصلی معنی حاضر ہونے کے ہیں، اس سے حضرت کے معنی عربی میں کے حضور اور پیشگاہ کے ہوگئے ہمارے ہندوستان میں اب یہ بھی تعظیمی لفظ ہوگیا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ مغلوں کے زمانہ میں بنا، اس سے پہلے بندگی، اور خدمت کے لفظ تھے، ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔

حضرت ہی کی دوسری صورت حضور ہے، اس کے بھی وہی معنی اور وہی روداد ہے۔ حضرت کے ساتھ صاحب کا بھی خیال آیا، صاحب کے عربی معنی ساتھی کے ہیں۔ اس سے عربی میں والا کے معنی پیدا ہوئے، جیسے صاحب علم (علم والا) اس کے بعد وزیروں کو جو بادشاہوں کے ساتھی اور مصاحب ہوتے تھے، صاحب کہنے لگے، جیسے صاحب ابن عباد وغیرہ، اب صاحب کے معنی آقا کے ہوئے، اور ہر نام کے آخر میں تعظیم کے لئے لگنے لگا، انگریز آئے تو وہ سارے ہندوستان کے آقا ٹھہرے، اس لئے وہ صاحب ہوئے۔

ایک بادشاہ کی جگہ پر جب دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا، تو اس کے لئے عربی کا لفظ جلوس غیر عربوں نے استعمال کیا، جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں، اور سال جلوس تخت نشینی کے سال کی اصطلاح بنی، اور چونکہ جب نیا بادشاہ پہلی دفعہ تخت پر بیٹھتا تھا۔ تو تزک واحتشام اور لاؤلشکر کے ساتھ نکلتا تھا تو ہم ہندوستانی تزک واحتشام کے ساتھ کسی مجمع کے نکلنے کو جلوس کہنے لگے، اس کو عربی سے کوئی تعلق نہیں اور جب بادشاہ اور حاکم دربار میں بیٹھے تو ہم نے جلوس سے اجلاس بنالیا۔ جس کے معنی بٹھانے کے ہیں، اور اب نئے زمانہ میں انجمنوں اور جلسوں کے بھی اجلاس ہونے لگے۔

جس جگہ بیٹھیں عربی میں اس کو مجلس کہتے ہیں، بعض علما اور صوفیہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ خاص دنوں میں بیٹھ کر لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے یا درس دیتے۔ اس سے اس قسم کی نشست کو اور پھر اس نشست کی تقریب دل کو مجلس کہنے لگے۔

ہندوستان میں ایسی نشستوں کو کہتے ہیں جن میں لوگ مذہبی اور علمی تقریریں کریں، یا مرثیے پڑھیں، اور اس سے ہم نے علم مجلسی بنایا، جن میں تہذیب و شائستگی کے ساتھ مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے اور سلیقہ اور دلچسپی کی باتیں کرنے کے ڈھنگ سکھائے گئے۔

جلوس سے قعود یاد آیا۔ قعود کے معنی بھی عربی میں بیٹھنے کے ہیں، اس سے عربی میں لفظ قاعدہ بنا اور اس کے معنی بنیاد کے ہوئے، یعنی دیوار کا وہ حصہ جو زمین کے اندر بیٹھے، چونکہ بنیاد ہی کے اوپر ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے اس لئے اہل علم نے اپنی اصطلاح میں ان اصول کو جن پر بہت سے مسئلوں کی بنیاد ہو قاعدہ کہا، اور اب ہماری زبان میں قاعدہ قانون کے معنی دینے لگا۔ اس کی جمع قواعد بنائی اور اس کو جمع مذکر کے طور پر استعمال کیا، تو اس کے معنی جزئی قانون کے ہوئے، لیکن ہم نے فوج کے نظم و ضبط اور ترتیب کے ساتھ چلنے، آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے کے قاعدے تھے تو ان کا نام بھی قواعد رکھا، اور یہ دو الگ معنوں میں واحد مؤنث ہے اور خالص ہندوستانی ہے

قاعدہ کے ساتھ اصول پر نظر رہتی ہے، یہ عربی میں اصل کی جمع ہے۔ اصل کے معنی عربی میں جڑ کے ہیں، اس لئے جس ایک بات کی جڑ پر مسئلوں کے بہت سے تنے کھڑے ہوں اس بات کو اصل کہنے لگے۔ اور اس کی جمع اصول بنائی۔ مگر جب ہم ہندوستانیوں نے اس کا استعمال کیا تو واحد کی صورت میں تو اصل کے معنی حقیقی اور بڑائی کے کر دیئے اور جمع کی صورت میں اصول کے معنی قاعدوں کے کر دیئے اور اس جمع کو واحد

بنا لیا، اور کہنے لگے، یہ ایک اصول ہے، اور جب اس کی جمع کی ضرورت ہوئی تو اردو نے یہ قاعدہ سے اصولوں کر دیا، اور کہا کہ ان اصولوں سے ہم کو انکار نہیں۔

مادّہ، مدّ سے اسم فاعل مؤنث ہے، اس کے معنی پھیلنے پھیلانے کے ہیں، اور مادہ کے معنی پھیلنے والے کے لئے، یونانی زبان سے فلسفہ کا ترجمہ جب عربی میں ہوا تو جسم کی صورت میں جو چیز پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا نام مادہ گھڑ کر رکھا اور اس کی جمع مواد بنائی ہماری زبان میں یہ لفظ مواد واحد کی صورت میں زخم کے اندر جو چیز بھری ہوتی ہے، اس کے لیے بولا جانے لگا، انگریزی میں مادہ کو میٹر کہتے ہیں، اور کسی مضمون کے معلومات کو بھی میٹر کہتے ہیں، اس لئے ہماری زبان میں میٹر کا ترجمہ بھی مواد ہوا، اور بولا جانے لگا۔ حکیم برہم گورکھ پوری مرحوم رشتہ گورکھپور کے اڈیٹر نے مجھ سے کہا تھا کہ اصل اور مواد ان دونوں لفظوں کو سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے اردو میں ان نئے معنوں میں استعمال کیا۔

دولت عربی لفظ ہے، معنی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانا، عربی میں جب مختلف سلطنتیں یکے بعد دیگرے بنیں اور مٹیں تو سلطنت کو دولت کا نام دیا گیا اور جمع دُوَل بنائی گئی، ان معنوں میں آج بھی دولت برطانیہ اور دُوَل یورپ ہم بولتے ہیں، سلطنت اور بادشاہی خوش قسمتی سے ہاتھ آتی ہے، اس لئے ایرانی دولت کو خوش قسمتی کے معنوں میں بولنے لگے، جس کی یادگار فارسی کے بدولت ہماری ہندوستانی میں بھی لفظ بدولت بولا جاتا ہے، جیسے کہتے ہیں آپ کے بدولت یہ ملا اور پھر بدولت ذریعہ کے معنی میں ہو گیا، خوش قسمتی کی بڑی نشانی زر و مال ہے، اس لئے یا اس لئے کہ زر و مال بھی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتا ہے، اس کو بھی دولت کہنے لگے، اور اس سے دولت، دولتمند اور دولتمندی کے لفظ ہندوستانی کو ہاتھ آئے۔

عربی میں غصّہ کے معنی حلق میں کسی چیز کے اٹکو ہو جانے یا اٹک جانے کے ہیں۔ ہندوستانی میں اس کے معنی غیظ و غضب کے ہو گئے، خفا فارسی میں خفہ ہے، اور معنی وہی گلے میں اٹکنے اور پھنسنے کے ہیں، ہندوستانی میں خفا ہونا، ناراض ہونے کے معنی میں ہے۔

بعض لفظ خیالات کے بدولت ہاتھ آتے ہیں، عربی میں فلک آسمان کو کہتے ہیں، چونکہ نجوم اور جوتش نے ہم کو یہ یقین دلایا ہے کہ ہماری ساری مصیبتیں آسمان کی گردش کا نتیجہ ہیں، اس لئے ہم نے فلک سے فلاکت بنایا، اور اس سے فارسی کی ترکیب دے کر فلاکت زدہ (فلاکت کا مارا) کیا اور پھر اس کو عربی لفظ سمجھ کر اس کا مفعول مفلوک بنا لیا۔ اور عربی اضافت دے کر مفلوک الحال کیدیا۔ حالانکہ اس کے ان معنوں کو عرب جانتا بھی نہیں۔

ہر لفظ پر اس تفصیل سے لکھنا پوری تصنیف کے برابر ہے، اس لئے ہم ذیل میں کچھ اور ایسے عربی لفظ لکھ دیتے ہیں جن کے معنی ٹھیٹ ہندی ہیں یا فارسی کے انشا یا اہل فلسفہ کی اصطلاحوں سے ایسے معنوں میں بولے جاتے ہیں جو عربی قطعاً نہیں۔

عربی	عربی معنی	اردو معنی
قطعاً	کاٹکر (یعنی ہر شک کو کاٹ کر)	یقینی طور سے
لفافہ	لپیٹ	خول۔ لفافہ
غارت	لوٹ	بربادی
اعتراض	آگے آجانا، سامنے پھیل جانا	اعتراض کرنا
عرض	پھیلانا	پیش کرنا

عربی	عربی معنی	اُردو معنی
مقدمہ	آگے کیا ہوا	جو جھگڑا عدالت میں پیش ہوا
متانت	بھاری ہونا	مہذب ہونا
متین	بھاری	مہذب
میزان	تول، ترازو	جمع
مذاق	چکھنا	ظرافت
اہتمام	غم کھانا	اہتمام کرنا
مہتمم (صحیح مہتمّم)	غم کھانے والا	مہتمم
انتظام	دھاگے میں پرویا جانا	انتظام کرنا
منتظم	دھاگے میں پرویا جانے والا	انتظام کرنے والا
غلام	لڑکا	غلام، بندہ
فرض	واجب کرنا	ذمہ داری
ولی	دوست، متولی	سرپرست خدا رسیدہ خدا کا دوست
محاذ	مقابل	لڑائی کا میدان
فوج	گروہ، جھنڈ	لڑائی کا لشکر
محنت	رنج و تکلیف	محنت یعنی پوری کوشش
شکل	مثل، مشابہ	صورت
شکیل	ہم شکل	خوبصورت
نقل	کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا	ایک جگہ کی خبر کو دوسری جگہ بیان کرنا

عربی	عربی معنی	اُردو معنی
مقہور	دبایا گیا	قبول
دماغ	دماغ	دماغ، عقل
مدمّغ	×	مغرور
غرور	دھوکا	غرور
مغرور	دھوکا کھایا ہوا	مغرور
انکسار	ٹوٹنا	خاکساری
استقلال	کم سمجھنا	مضبوطی، ثابت قدمی
عمارت	آبادی	بڑا مکان
تعمیر	آباد کرنا	بڑی عمارت بنانا
قصر	کم کرنا	(اردو دوسرا) عجیب کمی
اجلاس	بٹھانا	عدالت یا انجمن کی نشست
ضبط	نگاہ رکھنا	ضبط کرنا، حاکم کا چھین لینا
ضابطہ	نگاہ رکھنے والا	قاعدہ
تقریر	ثابت کرنا	تقریر کرنا
مقرّر	ثابت کرنے والا	تقریر کرنے والا
اقبال	سامنے آنا	خوش قسمتی
ادبار	پیچھے ہونا	تنزل
اقبال	× (سامنے معنی)	اقبال کرنا، قبول کرنا

عربی	عربی معنی	اردو معنی
رقم	لکھنا	تعداد، چیزوں کی قسم
خراب	ویران	برا، شکستہ
دقیق	باریک	مشکل
غلیظ	موٹا	نجس
امیر	حاکم	دولت مند
غریب	مسافر	مفلس
تربت	مٹی	قبر
نفسانیت	جان ہونا	خود غرضی
غرض	نشانہ	مقصد
غایت	گھوڑ دوڑ کی آخری حد	غرض، آخری حد
موسم	میدان	مدت
مدت	درازی	زمانہ
محصول	جس کا حصول ہو	ٹیکس
موضع	رکھنے کی جگہ	گاؤں
مکان	ہونے کی جگہ	گھر
بخار	بھاپ	بخار (تپ)
اضافہ	گھیرنا	گھیرا
خاطر	دل میں کھٹکنے والا	مہمان کی عزت کرنا

عربی	عربی معنی	اردو معنی
منّت	احسان	عاجزانہ خوشامد
حلوا	میٹھا	حلوا
دہشت	تعجب و حیرانی	خوف
شہوت	کسی قسم کی خواہش	جنسی خواہش
اشتہا		کھانے کی خواہش
مبلغ	کسی حد تک پہنچا ہوا	روپیوں کی تعداد
ماتم	میت پر غم کرنے کے لیے جمع ہونے کی جگہ	میت کا غم
حقہ	ڈبیا	حقہ

اس قسم کے ہزاروں عربی لفظ ہیں، جو اپنے خاص معنوں میں ہماری زبان کے خاص لفظ ہو گئے ہیں، یہی حال فارسی کا بھی ہے، فارسی کے بہت سے لفظ اور ترکیبیں ہیں، جن کو ہم نے اپنے ہندوستانی معنوں کے لئے ہندوستانی لفظ بنا لیا ہے، فارسی میں خانہ لگا کر ظرف اور مقام کے معنی کے لفظ بنائے گئے ہیں، جن کی صورت تو فارسی کی ہے، مگر معنی اور استعمال سراسر ہندی ہیں، جیسے پاخانہ، غسلخانہ، باورچی خانہ، بندی خانہ، اسی طرح فارسی میں دان کو لگا کر بھی ظرف بنتا ہے، جیسے خاکدان یعنی زمین، ہندوستانی میں اس سے ہم نے بیسیوں لفظ بنائے، جیسے پاندان، اگالدان، عطردان، مشردان، کاجل دان، جزدان، جاروان، دودھ دان، شکردان، پھولدان، نادان، سنگاردان، شمعدان۔

تصغیر کے لیے دان کو ہم نے کبھی دانی بھی کر دیا، جیسے سرمہ دانی، گوندانی، مچھردانی، تیلے دانی (سوئی تاگا رکھنے کے لیے)۔

گیر (لینے والا) لگا کر فارسی میں اسم مرکب بنائے جاتے ہیں جیسے دگیر، جہانگیر، ہم نے اس سے لفظ بنا کر بہت سی چیزوں کے نام رکھ دیئے، جیسے خوگیر (خو کے معنی فارسی میں پسینہ کے ہیں) عرق گیر، کفگیر، نمگیر (نم یعنی شبنم چونکہ اس قسم کے خیموں سے شبنم سے بچاؤ مقصود ہے اس لئے نمگیر کہدیا) دیوارگیر پہلے اس کپڑے کو کہتے تھے جو دیوار پر آرایش کے لئے لگاتے تھے۔ تاکہ دیوار سے پیٹھ ٹیکنے میں کپڑا خراب نہ ہو، اب اس لیمپ کو کہتے ہیں جو دیوار میں لٹکایا جائے۔

اس سلسلہ میں جاگیر تاریخی لفظ ہے، جاگیر کے لغوی معنی تو جگہ لینے والا ہیں، بادشاہ اپنے امیروں کو منصب کے ساتھ جو گاؤں دیتے تھے، جہاں جاکر امراء اکثر قیام کرتے تھے، اس کو جاگیر کہنے لگے، رفتہ رفتہ جاگیر کے خاص معنی ہو گئے۔ یہانتک کہ غریب طالب علموں کے کھلانے کے ٹھکانے کو بھی جاگیر کہنے لگے۔

اسی سے ملا ہوا جاداد کا لفظ ہے، فارسی کی اصل صورت جائداد ہے معنی دی ہوئی جگہ" بادشاہ کی طرف سے امیروں کو جو گاؤں ملتے تھے وہ جائداد تھی، رفتہ رفتہ جاداد نے زمینداری اور ملکیت کے معنی پیدا کر لیے، زمیندار اور زمینداری بھی لفظوں میں فارسی ہیں اور معنی میں سراسر ہندی۔

تنخواہ کے لفظی معنی اسم مفعولی ترکیب سے "بدن کا چاہا ہوا، جیسے دلخواہ دل کا چاہا ہوا۔ معنی یوں پیدا ہوئے کہ مغلوں کے زمانہ میں سرکاری امیروں کو خوراک وغیرہ کے لئے جو معاوضہ ملتا تھا، اس کا نام تنخواہ رکھا گیا، اب تنخواہ کے معنی مشاہرہ کے ہیں، ایرانی اس تنخواہ کے لفظ سے بھی واقف نہوں گے۔

ہندوستانی نے یہی عمل ہندی اور سنسکرت لفظوں کے ساتھ کیا ہے۔ ہندی اور

سنسکرت لفظوں کو اپنانے کے لئے ان کی شکلیں بدلی ہیں، ان کو ہلکا کیا ہے۔ ان کی ترکیبوں سے نئے نئے لفظ بنائے ہیں۔

مُہنال، منہ ہندی ہے، نال نالی اور نل لمبی سوراخ دار چیز کو کہتے ہیں، جیسے بندوق کی نال، ویسی ہی نیچہ کی نالی کے منہ پر جو لگایا جائے وہ مُہنال ہے۔ گنگا اور جمنا دو دریاؤں کے نام ہیں، سونے چاندی کے ملان سے جو نقاشی کی جائے وہ گنگا جمنی ہے، لفظ برہمنر تھا جو ذرا بھاری تھا، اس کو ہماری زبان نے برہمن کر دیا، اسی طرح گنرٹ کو گُن کر کے اس کو ہلکا کر دیا، برکھا رت نے برسات کی شکل اختیار کی، وچار بچار ہو گیا۔ اور سوچ بچار کے ساتھ بولا جانے لگا۔ آشا نے آس ہو کر یہ مثل کہوائی کہ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے، اسی طرح ہندی اور سنسکرت کے لاتعداد لفظوں کو ہندوستانی نے ذرا ذرا ہیر پھیر سے اپنے رنگ میں رنگ کر ان پر زمانہ کے تغیر کا نیا رنگ چڑھا دیا ہے۔

غرض عربی اور فارسی اور سنسکرت نسل کے ان ہندوستانی بچوں کی تعداد بےشمار ہے یہاں ان سب لفظوں کو پہچنوانا اور بتانا مقصود نہیں، مقصود یہ ہے کہ آج ہمارے سنسکرت دوست ہندو دوستوں کی جو یہ کد ہے کہ ہندوستانی زبان کے ہر ہندی یا سنسکرت لفظ کو صحیح ہندی اصل اور صحیح سنسکرت رنگ روپ میں دیکھیں اور اسی صحیح ہندی اور سنسکرت کے نام سے ان کو پکاریں، ان کو تسلی رہے کہ ہندوستانی نے عربی اور فارسی لفظوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے، اور ہر خود مختار زبان کو اس کا حق ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے لفظوں کو اپنی رعایا بنانے کے لئے ان کے ساتھ یہ سلوک کرے، یہ ہر خود مختار زبان کا حق ہے، اور کسی کی قدرت میں نہیں کہ وہ اس سے اس کے اس حق کو چھین سکے۔

(معارف ماہ جون ۱۹۲۹ء)

ہماری زبان

ہندوستان میں ہزاروں برس سے قوموں کا ریلا ہے، آریائی آئے، یونانی آئے، تاتاری آئے، سیتھین آئے، عرب آئے، ترک آئے، مغل آئے، پٹھان آئے، لیکن زبان سے پہچانو تو یہاں کس قوم کی اصلیت کیا ہے؟ ہندوستان کا خاصہ یہ رہا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنا لیتا ہے، اور پچھلوں کے لیے پہلوں سے اپنی جگہ خالی کرا لیتا ہے۔ ہندوستان کے اصلی رہنے والے ڈراویڈی، اور ہندوستان کی اصلی زبانیں تامل، تلنگو اور کنڑی وغیرہ ڈراویڈی زبانیں ہیں۔ سنسکرت اور پرانی ہندی خود باہر کی زبانیں ہیں، جن کا اس ملک سے چند ہزار برس سے زیادہ کا تعلق نہیں، لیکن دیکھئے کہ ہندوستان نے ان کو ایسا اپنایا کہ وہ اب اس ملک کی اصلی زبان ہونے کا دعویٰ کرنے لگیں۔

آریہ جو زبان بولتے ہوئے اس ملک میں آئے، معلوم نہیں وہ اس کو کب تک بولتے رہے، بہرحال اس میں میل ہوا اور اس سے انتر کر ایک دوسری زبان کا خاکہ تیار ہوا جو ذرا ذرا سے فرق سے ہر صوبہ میں الگ الگ ہو گئی۔

اسی طرح عرب عربی، ترک و مغل فارسی اور پٹھان پشتو بولتے ہوئے اس ملک میں آئے، مگر آخر میں سب بھول کر ایک ایسی زبان بولنے لگے جو اسی ملک کی پیداوار تھی، جس میں زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ اپنی زبانوں کے بھی کچھ لفظ ملا دئے۔ اور

اس سے چارہ نہ تھا۔

ہر فاتح قوم تلوار ہاتھ میں لے کر آتی ہے اور مفتوح قوموں کو ہٹا کر یا مٹا کر اپنے لئے راستہ صاف کرتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے، فاتح اور مفتوح قوموں میں سخت نفرت اور دشمنی ہوتی ہے، کیا مسلمانوں کو وہ وقت یاد نہیں جب وہ ترک ملچھ کہلاتے تھے، اور ہندو ان کے سایہ سے بھاگتے تھے، اور مسلمان ان کو بت پرست کافر سمجھ کر حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے، صدیوں کی لڑائی جھگڑے، خونریزی اور فساد کے بعد دونوں قوموں نے ایک دوسرے کو سمجھا، ایک دوسرے سے قریب ہونے لگیں اور پورے ایک ہزار برس میں وہ اس قابل ہوئیں کہ وہ ایک ملک کی ایک ایسی متحدہ قوم بن سکیں جن کی زبان ایک ہو، اس لئے آج جو زبان ہماری زبان ہے وہ درحقیقت ایک دو دن اور ایک دو نسل کی پیداوار نہیں، بلکہ پورے ایک ہزار برس کی کشاکش، کشمکش، آخر سمجھوتہ، پھر میل جول اور میل ملاپ کا قیمتی نتیجہ ہے۔

دونوں قوموں نے اس میل ملاپ کے ذریعہ کو پیدا کرنے، ترقی دینے اور پھیلانے میں صدیاں گذاری ہیں، اور نسلیں بیتی ہیں، تب کہیں جا کر یہ مقصد حاصل ہوا ہے۔ آریوں نے اپنی سنسکرت، عربوں نے اپنی عربی، ترکوں نے اپنی ترکی، ایرانی اور مغلوں نے اپنی فارسی اور پٹھانوں نے اپنی پشتو ملا کر یا ملا کر اس زبان کا قوام تیار کیا، اور ایسی بولی بنائی جس کو ہر کوئی اپنی بولی کہہ سکے، اور قوموں کے نسلی امتیازات اور لسانی اختلافات کا خاتمہ ہو سکے۔

اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ ہماری زبان جس کو ہم اردو کہیں، ہندی کہیں، ہندوستانی کہیں، اسی سمجھوتے اور مفاہمت پر بنی ہے، کہ اس کی بناوٹ میں ہر قوم کی

زبان اور ادب کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل رہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک کے لئے اس سے زیادہ بہتر ادبی سمجھوتہ ممکن نہیں۔

اب ایک ہزار برس کے بعد اگر کوئی قوم یہ چاہتی ہے کہ اس دیس کی بولی اور ادب خالص کسی ایک نسل کی میراث قرار دے اور اس کو عربی یا فارسی یا نری سنسکرت بنانے کی کوشش کرے تو در حقیقت ہمارے بزرگوں کی ایک ہزار برس کی زندگی کو خاک میں ملانا اور صدیوں کی محنتوں کو برباد کرنا اور ہندوستان کے بنانے والوں کی ان ہزاروں لاکھوں قربانیوں کو جو اس راہ میں انھوں نے کی ہیں۔ ستیاناس کرنا چاہتی ہے، اور آج کے اس ہندوستان کو جن میں محبت کی نہریں بہ رہی ہیں، اور جو ہندو مسلمانوں کی گنگا جمنی سے جگمگا رہا ہے، اس زمانہ کا ہندوستان بنانا چاہتی ہے، جب محمد قاسم راجہ داہر سے یا محمود غزنوی رائے جے پال یا شہاب الدین غوری پرتھی راج سے لڑ رہا تھا، اور ہندوستان میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔

ہندوستان اب کسی ایک نسل کی ملکیت نہیں، اب چاہے وہ پرانے دراوڑی اور آدی ہندو ہوں، چاہے سیتھین راجپوت اور گوجر ہوں، اور چاہے آرین برہمن ہوں یا عرب و ترک و تاتار مغل اور پٹھان ہوں، اب وہ سب ہندی اور ہندوستانی ہیں اور ان کی ایک ہی زبان ہے جو خیبر کے دروں سے لے کر دریائے شور کے کناروں تک بولی یا سمجھی جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ابھی اس بولی نے دکھن اور بنگال کے بہت سے علاقوں کو فتح نہیں کیا ہے، پھر بھی اتنے عرصہ میں وہ بہت سے صوبوں کو ایک کر چکی ہے، اور یہ کام ہمارے بزرگوں نے کیا ہے، اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس کو اور آگے بڑھائیں

اور بنگال اور دکھن کے علاقوں کو فتح کر کے ایک ایسا ملک بنائیں جس کی ایک بولی ہو، اس معاملہ میں سب سے آگے اہلِ بنگال کو ہونا چاہئے، اور ان ہی کی جیت سے اس کی جیت ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہندوستانی کی صوبہ وار بولیاں بالکل بھلا دی جائیں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ صوبہ دار بولیاں چاہیئے اپنی جگہ پر رہیں، مگر پورے ملک کے لیے ایک ایسی بولی ہو جائے جو سارے ملک میں سمجھی جائے اور بولی جائے، جس سے پورب کا سرا پچھم سے اور اتر کا کونہ دکھن سے مل جائے، اور ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ سکے۔

جو لوگ اس زبان کو اکیلے مسلمانوں کی زبان بتاتے ہیں، وہ دیکھیں کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد جہاں جہاں آباد ہے وہاں کی یہ مادری زبان ہے، یا ان صوبوں کی ہے جہاں ہندو بھائیوں کی کثرت ہے، مسلمانوں کا بڑا حصہ بنگال، کشمیر، سندھ، سرحد اور پنجاب میں آباد ہے، ان میں سے ہر ایک صوبہ کی علمی و تعلیمی زبان گو ہندوستانی اردو ہے، لیکن ان کی مادری زبان بنگال میں بنگالی، کشمیر میں کشمیری، سندھ میں سندھی، سرحد میں پشتو، اور پنجاب میں پنجابی ہے، پنجاب کی سرحد سے لیکر بنگال کے حدود تک جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے، یہ مادری زبان ہے، مگر سرحد، کشمیر، پنجاب اور سندھ کے مسلمانوں نے ایثار کر کے اس ہندوستانی زبان کو اپنی علمی و تعلیمی اور ادبی زبان قرار دے کر ہندوستان کی وحدت اور اتحاد کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، اب ضرورت ہے کہ بنگال، بمبئی اور مدراس کے رہنے والے بھی اس کو قبول کر کے اس کو ہندوستان کی عام زبان قرار دے کر ہندوستان کے شمالی اور جنوبی

دونوں بازوؤں کو ایک ساتھ مضبوط کر کے پورے ملک کو متحد کریں۔

یوپی کے موجودہ وزیر تعلیم نے ہندوستانی زبان میں سنسکرت لفظوں کو جس حد تک ممکن ہو ملانے اور بڑھانے کی ایک ایسی عجیب دلیل دی ہے جو ایک وزیر کی ذہانت سے بہت کم درجہ کی چیز ہے، کہتے ہیں کہ مدراس اور بمبئی میں ہندی کے پھیلنے کے لئے بہت ضروری ہے کہ سنسکرت لفظوں کو جس حد تک ہو اور زیادہ بڑھایا جائے، مہاراشٹر کو نہیں کہتا مگر جہاں تک دکن اور مدراس کا تعلق ہے وہاں کی زبانیں دراویڈین ہیں، جن کو سنسکرت سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ مدراس میں ہندی کے خلاف جو زبردست تحریک جاری ہے اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہاں کی غیر برہمن ذاتیں اس برہمن زبان (ہندی) کو نہیں سیکھنا چاہتیں وہ سمجھتی ہیں کہ اس کے ذریعہ مدراس کے برہمن ان کی ذات قومیت، ادب اور تمدن کو فنا کرنا چاہتے ہیں۔

پھر بھی لائق وزیر کی خدمت میں یہ کہنا ہے کہ اگر مہاراشٹر، گجرات اور مدراس میں سمجھے جانے کے لئے اس ہندوستانی میں بیش از بیش سنسکرت لفظوں کے بڑھانے کی ضرورت ہے تو سرحد، کشمیر، پنجاب اور سندھ میں اس کے زیادہ سے زیادہ سمجھے جانے کے لئے عربی، فارسی، پشتو، کشمیری اور سندھی کے لفظوں کو اسی نسبت سے کیوں نہ بڑھا دیجئے، پھر دیکھئے کہ ایسی ملی جلی زبان صاف، سادہ اور سہل اردو زبان کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے، جس کو ملک کی نسبت سے ہم ہندوستانی کہہ سکتے ہیں۔

الہ آباد یونیورسٹی کے فاضل وائس چانسلر نے ہندی کے حق کو مضبوط کرنے کے لئے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ اردو ہندوستان کے شہروں کی زبان ہے، اور ہندی

دیہات کی، چونکہ ملک کا بڑا حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے، اس لیے شہروں میں بھی ہندی ہی کو رواج دینا چاہیے۔

ایک بڑی یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر کا ادب ملحوظ رکھکر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کوئی انوکھا ملک نہیں، دنیا کے ہر ملک میں شہری اور دیہاتی زبانوں کا فرق ہوتا ہے، مگر ہر ملک کی ادبی، علمی، تعلیمی اور مجلسی زبان شہری ہی ہوتی ہے، دیہاتی نہیں، شہر اور دیہات کی زبانوں کا یہ فرق شہر اور دیہات کی زندگیوں کے فرق سے ہے، شہریوں کی ضرورتیں اور میل جول کے ذریعے دیہاتیوں سے بالکل الگ ہیں، اس لیئے دونوں کی زبانوں اور لفظوں میں ہمیشہ فرق رہا ہے اور رہے گا۔

اگر آج کوئی تلوار کی طاقت یا اکثریت کے قانون کی قوت سے کسی دیہاتی زبان کو علم و تعلیم اور ادب و مجلس کی زبان بنا بھی دے تو شاید چند سال بھی گذرنے نہ پائیں گے کہ پھر شہر اور دیہات کی زبانیں دو ہو جائیں گی۔

پھر یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ہندوستان کے سارے دیہاتوں کی کوئی ایک ہندی زبان ہے، بلکہ پورے ملک میں تھوڑے تھوڑے فرق سے الگ الگ دیہاتی لہجے اور مقامی بولیاں ہیں، پھر ان میں سے کہاں کی دیہاتی بولی ہماری زبان کا معیار قرار پائے گی۔

کسی کا یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ زبان کوئی جامد چیز ہے جس کو کوئی پکڑ کر ایک جگہ جمائے یا ٹھہرائے رکھے، بلکہ وہ ایک چلتی پھرتی چیز ہے جو آج کہیں ہے تو کل کہیں ہے۔ چار سو برس پہلے کی انگریزی کو آج کی انگریزی سے ملاؤ تو معلوم

ہوگا کہ یہ دو قسم کی زبانیں ہیں، آج ایران میں سعدی اور حافظ کی زبان کہاں ہے، سارے عربی ملکوں کی زبان ایک ہی ہے، مگر حالت یہ ہے کہ مصر کی عربی عراق کی عربی سے، اور مغرب کی عربی مشرق کی عربی سے بالکل مختلف ہے۔ ہندوستانی اردو تو دنیا بھر کی زبانوں میں سب سے کمسن زبان ہے، ذرا بیجاپور اور گولکنڈہ کے زمانہ کی زبان کو ولی اور ہاشم علی کی زبان سے ملائیے اور ولی اور ہاشم علی کی زبان کو میر اور سودا کی زبان سے ملائیے، اور میر و سودا کی زبان کا موازنہ آتش و ناسخ کی زبان سے کیجئے، اور آتش و ناسخ کی زبان کو امیر اور داغ کی زبان سے تولئے، اور پھر اس کو آجکل کے شعراء عزیز و صفی اور فانی و حسرت کی زبان سے ملا کر دیکھئے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ زبان کا ہر دور بدل رہا ہے۔

نثر میں سراج العاشقین کا خواہ وہ نویں صدی ہی کی ہو، فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا سے مقابلہ کیجئے، اور پھر سرشار کی زبان سے ملائیے، اور سرسید کی زبان کو دیکھئے کہ وہ حالی اور شبلی کے عہد میں بدل گئی، اور اب حالی و شبلی کی زبان بھی بدل رہی ہے، ہندی کا بھی یہی حال ہے، اصل رامائن کی ہندی کو ملک جائسی کی ہندی سے ملائیے، پھر کبیر کی ہندی پڑھئے، اور آجکل کی ہندی دیکھئے، غرض یہ ہے کہ ہر زبان ہمیشہ بدلتی رہی ہے اور بدلتی رہے گی، اس کا چولا قصداً ارادہ سے نہیں بدلا جاتا، بلکہ زمانہ کا ہاتھ خود اس کو بدلتا رہتا ہے، ایسی حالت میں آج جو کشمکش جاری ہے وہ کتنی فضول ہے، اس کشتی کو سمندر کے بہاؤ پر چھوڑ دیجئے، وہ آپ بہہ کر ساحل مقصود تک پہنچ جائے گی۔

ہمارا یہی کہنا ہے اور ہم نے بار بار یہی کہا ہے کہ زبان وہ ہے جو چلن میں ہے،

جو ہندوستان میں عام بولی کی حیثیت سے بولی اور لکھی جا رہی ہے اور جس کو ہندو مسلمان بول اور سمجھ رہے ہیں، اور لفظوں کی جانچ کا طریقہ شبد ساگر اور قاموس نہیں ہیں، بلکہ ہمارے گھر اور بازار اور راستے اور گلی ہیں، اگر اس جانچ کے طریقہ کو مان لیا جائے تو سمجھوتہ سامنے ہے۔

ابھی انجمن ترقی اردو لکھنؤ میں صوبہ کے ایک ذمہ دار وزیر نے فرمایا ہے کہ لوگ سنسکرتی ہندی اور عربی و فارسی آمیز اردو سے کیوں گھبراتے ہیں، کیوں دونوں کو بڑھنے نہیں دیا جاتا، پوچھنا یہ ہے کہ جب اس صوبہ کے رہنے والے دو ایسی زبانوں میں بٹ جائیں گے جن میں سے ایک کا بولنے والا دوسرے کی نہ سمجھ سکے، تو اس صوبہ کے بسنے والوں کی آپس کی بول چال، خط کتابت، لین دین، لکھنا پڑھنا کس زبان میں ہوگا۔ اور ایک دوسرے کے میل ملاقات کا ذریعہ کیا ہوگا، اور اس ہندو مسلم اتحاد کا کیا حشر ہوگا، جس کے لیے ہم سب بیچین ہیں، یہ کہنا کہ اس کے لیے وہی زبان کام آئے گی جو ہمارے درمیان صدیوں سے کام آ رہی ہے تو کہنا تو یہی ہے کہ پھر یہی ہماری سرکاری اور ادبی اور تعلیمی زبان کیوں نہ ہو۔

بہرحال اب جہاں تک حالات سے اندازہ ہوتا ہے، ہمارے سنسکرت دوست دوستوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ دلیل و حجت اور معقولیت کی پروا کئے بغیر عملی طور سے وہ وہی کریں گے جو وہ طے کر چکے ہیں، یعنی یہ کہ وہ پوری کوشش کریں گے کہ سنسکرتی ہندی اس ملک کی تعلیمی، ادبی اور مشترکہ زبان بن جائے، اس کے مقابلہ میں ان کو جو اس زبان کے حامی ہیں، جو اس ملک میں صدہا سال سے بولی جاتی ہے۔

یہ طے کر لینا ہے کہ اب تک جو زبان ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ سے بولی جا رہی

سے ہے وہ اُس کو اس محبت کی یادگار میں قائم رکھیں گے اور اپنے بزرگوں کی صدیوں کی محنت کو برباد نہیں ہونے دیں گے۔

ابھی اردو کا جو دن منایا گیا تھا اس میں بہت سے ممتاز اور سربرآوردہ ہندو بھائیوں نے اس مروجہ زبان کی حمایت میں جو حصہ لیا، اس سے پورا اندازہ ہو گیا کہ سمجھدار ہندو دوست بھی اسی کو ملک کے لیے موزوں اور مناسب زبان سمجھتے ہیں اور اس کو دونوں قوموں کے بزرگوں کا ورثہ جانتے اور دونوں کے میل ملاپ کی تاریخی یادگار مانتے ہیں، اور یہ اتحاد اس زبان کی آئندہ زندگی کی بہت بڑی ضمانت ہے۔

جواہر الاسرار
میں
کبیر کی بات چیت

جالندھر میں ایک دوست (حکیم عبدالعزیز صاحب شرقی) کے پاس اُن کے بزرگوں کی امانت اور وراثت تصوّف کی قلمی فارسی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے اس میں ایک فارسی کتاب جواہر الاسرار نام نظر سے گذری، مصنف کا نام اور تصنیف کی تاریخ مذکور نہیں، رسالہ کے ساتھ خلاصۃ العارفین وغیرہ حضرت زکریا ملتانی، حضرت فرید گنج شکر، حضرت جلال بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کے ملفوظات ہیں، اسی مجموعہ میں فارسی میں گیتا کا ترجمہ بھی شامل ہے، اس کے آخر میں کتابت کی تاریخ ۲ کاتک ۱۸۷۶ء سمت لکھی ہوئی ہے، (۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء) کاغذ یکساں پرانا اور کشمیری قسم کا ہے۔

آجکل سمت ۱۹۹۵ء ہے، اس بنا پر اس رسالہ کی کتابت آج سے ایک سو انیس برس پہلے کی ہے، تصنیف کا زمانہ اس سے خدا جانے کتنا پہلے ہو۔

بہرحال اس رسالہ جواہر الاسرار میں مصنف نے چند ہندی، فارسی اور عربی کے صوفیانہ لفظوں اور فقروں کی تشریح کی ہے، اس میں پنجابی، ہندی یا اردو کے بند شعر بھی کہیں کہیں آگئے ہیں، اور وہی میری دلچسپی کا باعث ہوئے، ایک موقع پر لفظ "موج نسبت بر آب دارد، برائے ایں قلب گویند" یہ دوہرہ نقل کیا ہے۔

جل تر نگ جلمیں تمہیں ابہی جلمیں رائے سمائی
مائی ہیں مادھو ہیں تو ہیں مادھو ہوں توں نج نمائی

جملہ لا صلوٰۃ الا بحضور القلب (حدیث مشہور صوفیہ) کی تشریح میں ہے

وہمیں است ہر کہ در یا لم یافت او را ہمہ جا است و ہر کہ در عالم نیافت او را
مشکل حق آسان کند، انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس کے بعد اس مضمون کا یہ دوہرہ ہے۔

جن کو درشن اِت ہے ان کو درشن اُت
جن کو درشن اِت نا نہ تنکوں اِت نہ اُت

تصوفی کا مذہب لہٰ کی تشریح میں دو شعر ہیں۔

آپس آپ سو بسرا اس
دوجی بسری پہلے نس

یاد اکیلی رہے ہو یاد
اس میں باقی سب برباد

وحدۃ الوجود کی ایک تمثیل کی تشریح میں ہے۔

خدا سو بندا ہو دکھلائے
بندے خدا انکھیا جائے

کسی فقیر "شعبدہ (بندہ) الفتاح" کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔

"اے میاں ٹک پیچھے دیکھو" یعنی اے فلاں اندک پس بین۔

ایک اور فقرہ کی تشریح کی ہے۔

"کھوجی جلیے پی بادی مرے" کھوجی یعنی داس بادی یعنی مقابل یعنی ہر کہ جو
بندہ باشد و تلاش دانستن داشتہ باشد او زندگی یابد و ہر کہ یک چیز یافتہ بر ہموں
یک چیز یک مرتبہ و ہر یک عمل ماند، و در لذت ہموں یک عمل گرفتار شود لاف زند،
او مردہ برائے آنکہ او پیشتر راہ نیافت۔

اس رسالہ میں سب سے دلچسپ مشہور فقیر کبیر اور بیراگیوں کی ایک بات بجنسہٖ کی بعینہٖ نقل ہے، جو اگر درست ہے، تو ہم کو کبیر کے زمانہ کی زبان کی ہو بہو تصویر نظر آجاتی ہے،

"جمعے اتیتاں و بیراگیاں پیش کبیر آمدند، وگفتند کہ اے کبیر تو اتیت اور بیراگی ہے، تو ولاسطے تیر تھ کے اور استھان کے کیوں نہیں چلتا، اٹھ تیرتھ کوں اور استھان کو چل، کبیر گفت کہ بابا اتیت اور بڑی بیراگی ہو۔ اور میں اناڑی ہوں، تمہیں جاؤ میں پڑا ہوں، بیراگیہا گفتند کہ نہ تو چل ہمارے ساتھ، یا بیراگ چھوڑ، کبیر الحاح کرد، وگفت بیراگیو مجھے چھوڑ دو، بیراگیہا نگذاشتند، باز کبیر گفت کہ پہلا اب کی مجھے چھوڑ دو، ایہ تو نبڑا میرا لیجاؤ، اسے تیرتھ اور اشنان کراؤ، دوسری بار میں چلوں گا، بہر ناز سست ماند و تو نبڑا ہمراہ داد، بیراگیاں تو نبہ گرفتہ رفتند جا تیرتھ و اشنان کردند، تو تیرا ہم کنانیدند، بعد از مدت آمدند پیش کبیر، کبیر پرسید کہ تو نبڑا کہاں ہے بیراگیاں گفتند کہ ہے، تو نبہ را پیش کبیر گذاشتند، کبیر گفت کہ تو نبڑا کوں تمرد بیراگیہا تو تیرا شکستند، باز کبیر گفت کہ کھاؤ، بیراگیہا خوردند، باز کبیر پرسید کہ کیسا ہے۔ بیراگیاں گفتند کہ کڑوا ہے، کبیر گفت کہ لے بیراگیو تیرتھ اور اشنان کہیں کیا ہوتا ہے جب تر تمیں پر ہشیار نہ ہووے۔ یہ جو کڑوا تھا، تو تیرت اور اشنان سوں میٹھا نہ ہوا جانگہ اصل میٹھا نہ ہودی، اس کے تئیں سنگت کردی بیل کی نفی تو امی میٹھا کیونکر ہوئے، جو میٹھی سنگت ہوتی تو میٹھا ہوتا، پس رفتن و پرسیدن و شنیدن وغوغا کردن چہ کار می آید"

کبیر کی وفات کا سال سنہ ۱۵۷۵ سمت مطابق سنہ ۱۵۱۸ء مشہور ہے، تو گویا یہ سولہویں

صدی عیسوی کی ہندوستانی بولی ہے؟ کبیر کی شاعری کی زبان بھی بہت آسان ہے، اور اس میں عربی اور فارسی کے بگڑے ہوئے لفظ بہت ملتے ہیں۔

آگے ایک اور شعر نقل کیا ہے، دوہرہ۔

نہ دیکھ پرائی چوپڑی نا ترسا اپنا جیو
رو کھا سوکھا کھا کر ٹھنڈا پانی پیو

تجھ کن علم سو ہے فی الحال
دی بصارت تجھے کمال

ذوق ہوئے نہ چکھن کر دیکھ
نہیں بھوت کر بھتیں ایسا پھیکہ

پھیکہ کہیں بیدیا نہیں کوئی
کھاند کہیں میٹھا نہیں ہوئی

بیدسے انتر جب جو می
جوں جھنک کر نہیں بہر نگے ہوئی

دو بہنیں تھیں، بڑی بہن کا جب بیاہ ہوا، تو چھوٹی بہن نے پوچھا:۔
"بو بو بیاہ کیسا ہوتا ہے" ایں گفت "کہوں کی" جب چھوٹی بہن کا ہو گیا تو اس نے کہا "بو بو بیاہ ایسا ہوتا ہے"

جو نہ دیکھے اپنیں نیں تو لی
تو نہ پہنچی کو رکے ہیں نولی

افسوس کہ رسالہ ناتمام ہے۔

(معارف۔ مارچ ۱۹۲۹ء)